غالب اور اقبال کے فکری روابط

نبیلہ سجاد بخاری

غالب اور اقبال کے فکری روابط

تحقیقی مقالہ برائے ایم فل اقبالیات

مقالہ نگار:

نبیلہ سجّاد بخاری

رول نمبر: M733211

رجسٹریشن نمبر: 02-FID-3256

نگران:

پروفیسر ڈاکٹر محمد صدّیق خان شبلی

سابق صدر شعبہ اُردو/ اقبالیات

علاّمہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

شعبہ اقبالیات

علاّمہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

2007ء
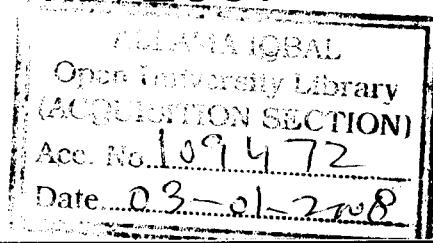
ڈاکٹر محمّد صدّیق خان شبلی

فون ۲۲۶۴۵۸۲

مکان ۵۲، گلی ۸۲، جی ۸/۱
اسلام آباد

تاریخ 10-02-07

تصدیق کی جاتی ہے کہ نبیلہ سجّاد بخاری رول نمبر M733211 رجسٹریشن نمبر 02-FID-3256 نے ''غالبؔ اور اقبالؔ کے فکری روابط'' کے موضوع پر یہ تحقیقی مقالہ بڑی محنت اور ذہانت سے تحریر کیا ہے۔ مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ ان ابواب میں موضوع سے متعلق تمام مباحث کا احاطہ کیا گیا ہے۔ سب نکات کی وضاحت کے لئے غالبؔ اور اقبالؔ کے اشعار کے حوالے دیے گئے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سارے اشعار ہر اعتبار سے درست ہیں۔ تحقیقی مقالوں میں یہ بات کم ہی نظر آتی ہے۔ میں اس مقالے کے تحقیقی معیار سے پوری طرح مطمئن ہوں اور میرے خیال میں اسے ایم۔ فل کے لئے پیش کیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر محمّد صدّیق خان شبلی

فہرست

پیش لفظ

مشرق و مغرب کے مشاہیر کے ساتھ علامہ محمد اقبال کے فکری روابط اُردو ادب کا ایک مستقل موضوع ہے۔ خصوصاً ایشیائی شعرا میں علامہ اقبال کو جو ربط و تعلق مرزا اسد اللہ خان غالب سے رہا ہے اس کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اکثر ناقدین نے غالب ہی کو اقبال کا روحانی پیشوا تسلیم کیا ہے اسی خیال کی بنیاد پر میں نے ایم۔فل اقبالیات کے تحقیقی مقالے کے لئے موضوع

''غالب اور اقبال کے فکری روابط''

کا انتخاب کیا۔ کیونکہ غالب اور اقبال جیسے آفاقی شعرا کی قدر شناسی اردو زبان و ادب کی اہم ترین ضرورت ہے۔ مجھے اس موضوع پر تحقیق کرتے ہوئے غالب اور اقبال کے فکر و فلسفہ کو بہتر طور پر سمجھنے کا موقع ملا۔ علامہ اقبال کا غالب سے جو فکری رشتہ استوار تھا اس کی نوعیت کو جاننے کی کوشش کی گئی۔ دوران تحقیق ادبی ذوق کی تسکین کا سامان بھی فراہم ہوا لیکن غالب اور اقبال جیسی قد آور شخصیات کی ہمہ گیری کے سامنے اپنی کم مائیگی اور بے بضاعتی کا احساس بھی دامن گیر رہا اور بہت کچھ جان لینے اور تحریر کر لینے کے بعد بھی یہی احساس ہوا کہ:

ع   حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

غالب اور اقبال کے فکر و فن کی وسعت اور تنوع بے اندازہ ہے۔ لہٰذا دونوں عظیم ہستیوں کی شاعری ''گنجینۂ معنیٰ'' کا ایسا ''طلسم'' نظر آئی جس کی معنویت کی تہہ تک پہنچنا مشکل ہے۔ بار ہا قدم ڈگمگائے یہاں تک کہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر یوسف حسین خان، ڈاکٹر شیخ محمد اکرام اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری جیسے عظیم اساتذہ کے چراغ فکر نے راہ دکھائی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مقالے کی تیاری میں ان تمام اساتذہ کے خیالات سے بھرپور استفادہ کیا گیا۔ اور ان کی تحقیقی آرا کی روشنی میں، میں بھی اپنے خیالات کو منظم کر سکی۔

تحقیقی مقالے ''غالب اور اقبال کے فکری روابط'' کو کل پانچ ابواب میں منقسم کیا گیا ہے۔

پہلا باب ''غالب اور اقبال کا فکری رشتہ'' ہے۔ جس میں غالب اور اقبال کے فکری روابط کی نوعیت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ آغازِ شاعری ہی سے اقبال کا غالب سے جو ربط و تعلق قائم ہوا تھا وہ پایانِ عمر تک برقرار رہا۔ اقبال کے شذرات، نظم ''مرزا غالب'' اور ناقدین کی آراء کی روشنی میں اس خیال کو مزید تقویت ملتی ہے کہ اقبال کا غالب سے گہرا فکری رشتہ استوار تھا۔

باب دوم ''غالب اور اقبال شخصیت، ماحول اور ادبی روایت کے آئینے میں'' دونوں عظیم شعراء کی شخصیت، ماحول اور اُن ادبی روایات کا جائزہ لیا گیا ہے جن کے زیرِ اثر غالب اور اقبال کی شخصیت اور فن کی نشو و نما ہوئی۔

باب سوم ''غالبؔ اور اقبالؔ کے مشترک موضوعات'' کے زیرِ عنوان ہے۔ جس میں دونوں شعراء کی فکری ہم آہنگی اور مطابقت پر نظر ڈالی گئی ہے۔ اس باب میں نہ صرف اقبالؔ کے جستہ جستہ بکھرے ہوئے مشترک موضوعات کو یکجا کیا گیا ہے بلکہ مخصوص تصورات کے آئینے میں دونوں شعراء کی فکری مشابہت کا احاطہ بھی کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں تصورِ خودی، تصورِ فن، تصورِ عمل و حرکت، سخت کوشی اور خارا شگافی، تصورِ تصوف، تصورِ جنت، تصورِ رجائیت اور نکتہ آفرینی جیسے مشترک موضوعات پر ذیلی ابواب قائم کر کے دونوں شعراء کی فکری مشابہت کا جائزہ لیا گیا ہے۔

باب چہارم ''غالبؔ اور اقبالؔ کے فکری اختلافات'' پر مبنی ہے۔ یہاں اس امر کا جائزہ لیا گیا ہے کہ دونوں شعراء کے افکار و خیالات میں اختلاف کی نوعیت کیا ہے۔ علامہ اقبالؔ نے اپنی شاعری کو امتِ مسلمہ کی بیداری کا وسیلہ بنایا جب کہ غالبؔ کی شاعری ان کے اپنے ہی دل کی آواز ہے۔ ان کے پیشِ نظر سوائے اپنے احساسات و جذبات کے اظہار کے کوئی اور عظیم مقصد نہ تھا۔ اس بنیادی فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے دونوں شعراء کے ذہنی فاصلے اور فکری اختلافات کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

باب پنجم ''حاصلِ بحث'' کے عنوان سے ہے۔ جس میں مقالے کے تمام اہم نکات کو سمیٹا گیا ہے۔ یہاں تمام پچھلے ابواب میں کی جانے والی تحقیق کا مختصراً احاطہ کیا گیا ہے۔ اور آخر میں یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ اقبالؔ غالبؔ کی فکری توانائی کے نہ صرف معترف تھے بلکہ غالبؔ کے افکار و خیالات سے مستفیض ہونے کا اعتراف بھی کرتے رہے۔ اقبالؔ کی پسندیدہ شخصیات میں غالبؔ اول تا آخر بلند مرتبہ پر فائز رہے لیکن جہاں جہاں اُنھوں نے ضروری سمجھا وہاں ان کی فکر سے اختلاف بھی کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبالؔ نے اپنے علم و تجربے اور ہمہ گیر شخصیت کے طفیل اپنے کلام کو اُس معراج تک پہنچایا کہ اس کی مثال تا حال پیدا نہ ہو سکی۔

اہلِ زمیں کو نسخۂ زندگیِ دوام ہے
خونِ جگر سے تربیت پاتی ہے جو سخنوری

یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس مقالے کی تیاری میں غالبؔ کے تمام اُردو اشعار کے حوالے ''دیوانِ غالبؔ جدید'' المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ معہ مقدمہ دیوان ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری سے اخذ کیے گئے ہیں جسے ڈائریکٹر تعلیمات ریاست بھوپال کے مفتی محمد انوار الحق نے مرتب فرمایا ہے جب کہ فارسی اشعار کی صحت کے لئے ''کلیاتِ غالبؔ فارسی'' کی جلد اوّل دوم اور سوم کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے جسے سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی نے مجلسِ ترقی ادب کے زیرِ اہتمام ۱۹۶۷ میں ترتیب دیا، جب کہ علامہ محمد اقبالؔ کے تمام تر اُردو اشعار کے حوالے ''کلیاتِ اقبالؔ اُردو'' شائع کردہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور اشاعتِ سوم ۱۹۷۷ء سے اور فارسی اشعار ''کلیاتِ اقبالؔ فارسی'' از شیخ غلام محمد اینڈ سنز لاہور اشاعتِ دوم ۱۹۷۵ء سے اخذ کئے گئے ہیں۔ تمام اشعار کے حوالہ جات میں دیوان و کلیات کے صفحہ نمبر کا اندراج

کر دیا گیا ہے۔

مجھے ہمیشہ اپنی خوش بختی پہ ناز رہے گا کہ اس مرحلۂ تحقیق و تدقیق میں مجھے ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی جیسے عظیم المرتبت استاد کی نگرانی کی سعادت نصیب ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف نہایت شفقت اور محبت سے میری رہنمائی فرمائی بلکہ قدم قدم پر حوصلہ بھی بڑھایا اور ان کے زیرِ نگرانی میں اپنا تحقیقی مقالہ بآسانی پایہ تکمیل تک پہنچا سکی۔ میں ان کی تہہ دل سے ممنون رہوں گی۔

میں اپنے رفیقِ حیات سید سجاد احمد بخاری، رفیقۂ کار ڈاکٹر نجیبہ عارف، استادِ محترم ڈاکٹر شاہد کامران کا بھی خصوصی طور پر شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جن کے مخلصانہ تعاون کی بدولت میں اس راہ کی دشواریوں سے بخوبی عہدہ براء ہو سکی۔ شکریہ

اسلام آباد
فروری ۲۰۰۷ء

نبیلہ سجّاد بخاری

باب اوّل

غالبؔ اور اقبالؔ کا فکری رشتہ

غالبؔ اور اقبالؔ کا فکری رشتہ

مشرق و مغرب کے مشاہیر کے ساتھ علامہ اقبالؔ کے فکری روابط اُردو زبان و ادب کا ایک مستقل موضوع رہے ہیں۔مختلف شخصیات کے ساتھ ان کی ذہنی و فکری ہم آہنگی پر گرانقدر تحریری سرمایہ موجود ہے کیونکہ ان کے کلام میں بیک وقت حافظ کا سوز اور سرمستی بھی ہے اور عمرِ خیام کی رندی و بے باکی بھی، غالبؔ کی انانیت و خودداری بھی ہے اور جدت طرازی بھی، اکبر کا تیکھا پن بھی ہے اور حالؔی کا جذبۂ قومی بھی، شیکسپیئر کی فطرت نگاری بھی ہے اور ملٹن اور گوئٹے کی حکمت شعاری بھی۔ وہ خود اعتراف کرتے ہیں کہ:

ع بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے[1]

بلکہ دوسروں کو بھی اُن کا یہی مشورہ ہے کہ:

ع مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر[2]

حقیقت یہ ہے کہ اقبالؔ کی شخصیت اور فکر کی تعمیر و تشکیل میں مشرق و مغرب کے تمام اہل علم و فضل کا ہاتھ رہا۔ انہوں نے علم و حکمت کو ''مومن کی گمشدہ میراث'' تصور کرتے ہوئے ہر جگہ سے اُٹھا لینے اور حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ لہٰذا جو شخصیات اقبالؔ کے حلقۂ تأثر میں زیادہ معتبر و محترم ٹھہریں اُن کی نسبت اپنی ڈائری میں تحریر فرماتے ہیں:

"I confess I owe a great deal to Hegel, Goethe, Mirza Galib, Abdul Qadir Bedil, and Words Worth. the first two led me into the inside to the things, the third and fourth tought me how to remain oriental in sprit and expression after having assimilated foreign ideals of poetry, and the last saved me from athiesm in my student days."

''میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے ہیگل، گوئٹے، غالبؔ، بیدلؔ اور ورڈز ورتھ سے بہت استفادہ کیا ہے۔ ہیگل اور گوئٹے نے اشیاء کی باطنی حقیقت تک پہنچنے میں میری رہنمائی کی۔ بیدلؔ اور غالبؔ نے مجھے یہ سکھایا کہ مغربی شاعری کی اقدار اپنے اندر سمو لینے کے باوجود، اپنے جذبہ اور اظہار میں

مشرقیت کی روح کیسے زندہ رکھوں۔۔۔۔''[۳]

بلا شبہ اہلِ مشرق میں علامہ اقبالؔ کا فکری رشتہ جس عظیم ہستی سے استوار ہوا وہ اسد اللہ خان غالبؔ ہی ہیں جن سے شعوری اور لاشعوری طور پر انہوں نے بہت جذب وقبول کیا اور جن کی فکر اور شخصیت کی توانائی سے وہ متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکے۔

غالبؔ اور اقبالؔ میں گہرے فکری روابط کا سراغ ملتا ہے۔ دونوں کو اُردو اور فارسی شاعری پر مکمل قدرت حاصل تھی، دونوں کی شخصیت کا بہترین اظہار اُن کے فارسی کلام میں ہے۔ دونوں کو خدا نے زبردست دل ودماغ ودیعت کیا تھا، دونوں روشِ عام پر چلنے سے گریزاں اور جدت طرازی کے خواہاں تھے، دونوں ہی کی شاعری ''گنجینۂ معانی کا طلسم'' ہے جس میں حکمت وعرفان کے موتی پوشیدہ ہیں۔ دونوں ہی نابغۂ روزگار اور زمانے کا مرکب نہیں راکب ہیں۔

علامہ اقبالؔ کو مرزا غالبؔ سے جو ذہنی مطابقت تھی اُس کا اولین اظہار مدیرِ مخزن سر شیخ عبدالقادر ''دیباچۂ بانگِ درا'' کی پہلی ہی سطر میں اِس طور کرتے ہیں۔

''کسے خبر تھی کہ غالبؔ مرحوم کے بعد ہندوستان میں بھی کوئی ایسا شخص پیدا ہوگا جو اُردو شاعری کے جسم میں ایک نئی روح پھونک دے گا اور جس کی بدولت غالبؔ کا بے نظیر تخیل اور نرالا انداز بیان پھر وجود میں آئیں گے اور اُردو ادب کے فروغ کا باعث ہوں گے''[۴]

دوسرے ہی پیراگراف میں اُن کی غالبؔ اور اقبالؔ کی فکری مشابہت پر مبنی یہ رائے تیقّن کی حدوں کو چھو لیتی ہے اور وہ برملا فرماتے ہیں کہ:

''غالبؔ اور اقبالؔ میں بہت سی باتیں مشترک ہیں اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسد اللہ خان غالبؔ کو اُردو اور فارسی کی شاعری سے جو عشق تھا اُس نے اُن کی روح کو عدم میں جا کر بھی چین نہ لینے دیا اور مجبور کیا کہ وہ پھر کسی جسد خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے اور اُس نے پنجاب کے ایک گوشہ میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبالؔ نام پایا''[۵]

غالبؔ اور اقبالؔ کی مماثلت اور تعلقِ خاطر پر مبنی یہ رائے اس ہستی نے پیش کی ہے جو ایک بلند پایۂ نقاد، ادب نواز اور ادیب پرور ہونے کے ساتھ ساتھ علامہ اقبالؔ کے ہمدمِ دیرینہ اور رفیقِ خاص بھی تھے لہٰذا مذکورہ رائے کی بڑی وقعت وقدر وقیمت ہے۔

''بانگِ درا'' میں حصہ اول کے آغاز ہی میں نظم ''مرزا غالبؔ'' بھی خصوصی توجہ کی طالب ہے جس میں علامہ بڑے شد و مَد کے ساتھ نہ صرف اُس عظیم شاعر کو خراجِ تحسین پیش کر رہے ہیں بلکہ اُن کی گونا گوں شاعرانہ صفات کا احاطہ بھی فرما رہے ہیں۔ نظم ملاحظہ ہو:

مرزا غالبؔ

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کُجا
تھا سراپا روح تو ، بزمِ سخن پیکر ترا
زیبِ محفل بھی رہا، محفل سے پنہاں بھی رہا
دید تیری آنکھ کو اُس حُسن کی منظور ہے
بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستو رہے
محفلِ ہستی تری بربط سے ہے سرمایہ دار
جس طرح ندی کے نغموں سے سکوتِ کوہسار
تیرے فردوسِ تخیل سے ہے قدرت کی بہار
تیری کِشت فکر سے اُگتے ہیں عالم سبزہ زار
زندگی مضمر ہے تیری شوخیٔ تحریر میں
تابِ گویائی سے جنبش ہے لبِ تصویر میں
نطق کو سوناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر
محوِ حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر
شاہدِ مضموں تصدق ہے ترے انداز پر
خندہ زن ہے غنچۂ دلّی گلِ شیراز پر
آہ! تو اُجڑی ہوئی دلّی میں آرمیدہ ہے
گلشنِ *ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

*ویمر: جرمنی کا مشہور شاعر گوئٹے اِس جگہ مدفون ہے

لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں
ہو تخیل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں
ہائے! اب کیا ہو گئی ہندوستاں کی سر زمیں
آہ! اے نظارہ آموزِ نگاہِ نکتہ بیں
گیسوئے اُردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ سودائی دل سوزیٔ پروانہ ہے
اے جہاں آباد! اے گہوارۂ علم و ہنر
ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در
ذرے ذرے میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر
یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہر
دفن تجھ میں کوئی فخرِ روز گار ایسا بھی ہے؟
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے؟ [6]

غالبؔ کی شان میں کہی گئی یہ نظم اِس بات کا ثبوت ہے کہ اقبالؔ غالبؔ کی رفعتِ تخیلِ، ندرتِ فکر، معجز نگاری، لطفِ گویائی اور شوخیٔ تحریر سے بے حد متاثر تھے۔ انہیں علم تھا کہ زبانِ اُردو کو نکھار بخشنے کے لئے غالبؔ جیسے عظیم شعراء کی ضرورت ہنوز باقی ہے۔ ''ہائے'' اور ''آہ'' جیسے کلماتِ تاسف اقبالؔ کی اس خواہش کو ظاہر کر رہے ہیں کہ کاش غالبؔ کچھ دیر اور زندہ رہتے اور زبان و ادب کو اپنی قوتِ متخیلہ اور زباندانی سے سرفراز کر سکتے۔

اقبالؔ سرزمینِ دہلی سے مخاطب ہیں کہ تیری خاک میں لاکھوں علماء، حکماء، شعراء، صوفیاء، اولیا، شاہان اور ماہرین علوم وفنون آسودۂ خاک ہیں لیکن غالبؔ جیسا آبدار موتی یقیناً اور کوئی نہیں۔

اس نظم کے حوالے سے علامہ اقبالؔ کی شخصیت اور فکر وخیال پر غالبؔ کے تاثر کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اپنی کتاب ''فکرِ اقبالؔ'' میں رقم طراز ہیں:

''اگر کوئی شاعر کسی دوسرے شاعر کا صمیم قلب سے جوش وخروش کے ساتھ مداح ہو تو از روئے نفسیات یہ لازم آتا ہے کہ مادح اور ممدوح میں کوئی گہری مشابہت ضروری ہے۔ ہر انسان اپنے ممدوح کی

غیر شعوری طور پر تقلید بھی کرتا ہے اور اندازِ نگاہ وطرزِ کلام میں خود بخود کم وبیش مماثلت پیدا ہو جاتی ہے''۔[7]

نظم ''مرزا غالب'' میں اقبال ایک جگہ غالب کو جرمنی کے مایۂ ناز مفکر شاعر گوئٹے کا ہمنوا قرار دیتے ہیں: یعنی

ع گلشنِ ویمر میں تیرا ہمنوا خوابیدہ ہے[8]

بعد ازاں ''پیام مشرق'' کے تمہیدی اشعار میں خود اپنا اور گوئٹے کا موازنہ و مقابلہ پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں بھی تمہاری طرح کا مفکر اور صاحبِ بصیرت اور وجدان کا شاعر ہوں فرق ہے تو صرف اتنا کہ میں ایک مردہ قوم میں پیدا ہوا جو میری قدر شناس نہیں اور تو نے ایک زندہ قوم میں جنم لیا۔ اقبال دونوں عظیم شعراء کے عمر بھر مداح رہے۔ گوئٹے کے ''دیوان مغرب'' کے جواب میں بطور احترام ''پیام مشرق'' لکھی جبکہ ''جاوید نامہ'' میں اقبال غالب کی چراغِ فکر سے روشنی لیتے نظر آتے ہیں۔ جوں جوں اقبال کا ذہن پختہ اور مطالعہ وسیع ہوتا گیا گوئٹے اور غالب سے اُن کی وابستگی میں بھی اضافہ ہوتا رہا گوئٹے سے عقیدت کا اظہار ان کے اس قول سے ہوتا ہے

''جب کسی عظیم ذہن سے ہمارا رابطہ قائم ہوتا ہے تو ہماری روح اپنا اکتشاف کر لیتی ہے۔ گوئٹے کی تخیل کی بیکرانی سے آشنا ہونے کے بعد مجھ پر اپنے تخیل کی تنگ دامنی منکشف ہوگئی۔''[9]

اقبال کے یہ افکار اس حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں کہ:

غالب، گوئٹے اور اقبال میں گہری فکری ہم آہنگی موجود ہے۔ تینوں ہم خیال اور ہم نوا شعراء ہیں جن کا رنگ و آہنگ باہم مشابہہ ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان اپنی کتاب ''غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات'' میں تجزیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''میرا خیال ہے کہ باوجود مولانا روم کو اپنا روحانی مرشد تسلیم کرنے کے اقبال اپنی شاعری میں سب سے زیادہ حافظ، غالب اور گوئٹے سے متاثر ہے۔ اس کا امکان ہے کہ اقبال کے کلام کا وہی حصہ دیرپا ہو جو اُس نے اِن تینوں فنکاروں کے زیر اثر لکھا ہے۔''[10]

علامہ اقبال کو غالب سے فکری ربط و تعلق تو تھا ہی بلکہ وہ مرزا سے جذباتی وابستگی بھی رکھتے تھے۔ اِس جذباتی رشتے کا بے ساختہ اظہار اُس وقت ہوا جب سفرِ یورپ پر روانگی سے قبل آپ نظام الدین اولیاء کی زیارت کے ساتھ ساتھ غالب کی تربت پر بھی حاضر ہوئے۔ اور وہاں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے اس واقعے کی طرف اشارہ کرتے

ہوئے اقبال اپنے ایک خط میں غالب کی نسبت اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''شام کے قریب ہم اس قبرستان سے رخصت ہونے کو تھے کہ میر نیرنگ نے خواجہ صاحب سے کہا کہ مرزا غالب مرحوم کے مزار کی زیارت بھی ہو جائے کہ شاعروں کا حج یہی ہوتا ہے۔ خواجہ صاحب موصوف ہمیں قبرستان کے ایک ویران سے گوشے میں لے گئے جہاں وہ گنجِ معانی مدفون ہے جس پر دہلی کی خاک ہمیشہ ناز کرے گی۔ حُسن اتفاق سے اِس وقت ہمارے ساتھ ایک نہایت خوش آواز لڑکا ولایت نام کا تھا۔ اُس ظالم نے مرزا کے مزار کے قریب بیٹھ کر

ع دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی

کچھ اِس خوش الحانی سے گائی کہ سب کی طبعیتیں متاثر ہوگئیں بالخصوص جب اُس نے یہ شعر پڑھا:

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں؟

اُٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ آنکھیں پُرنم ہوگئیں اور بے اختیار لوحِ مزار کو بوسہ دے کر اُس حسرت کدہ سے رخصت ہوا۔ یہ سماں اب تک ذہن میں ہے۔ اور جب کبھی یاد آجاتا ہے تو دل کو تڑپا جاتا ہے۔''[۱۱]

علامہ اقبال غالب کو آفاقی شاعر تسلیم کرتے تھے جس کے ذہن اور تخیل کی رسائی اپنے زمانے اور علاقائی حدود سے ماورا تھی۔ ''شذرات'' میں غالب کے بارے میں یہ وقیع رائے پیش کرتے ہیں کہ:

As far as I can see Mirza Ghalib - the Persian poet - is probably the only permanent contribution that we Inidian Muslims have made to the general Muslim literature. Indeed he is one of those poets whose imaginations and intellect place them above the narrow limitations of Cveed and nationality. His recognition is yet to come.

''۔۔۔غالب یقیناً اُن شعراء میں سے ہیں جن کا ذہن اور تخیل انہیں مذہب اور قومیت کی تنگ حدود سے بالاتر مقام عطا کرتا ہے۔ غالب شناسی کا حق ادا ہونا ابھی باقی ہے۔''[۱۲]

صاف ظاہر ہے کہ اقبالؔ ہی نے سب سے پہلے غالبؔ شناسی کا حق ادا کرنے کی شعوری کوشش کی۔ انہوں نے نہ صرف غالبؔ سے فکری روابط اُستوار کئے بلکہ اُن کے تفکر و تخیل میں مغربی اور عجمی تفکر کی آمیزش سے ایک قابلِ تقلید مثال بنا دیا۔

علامہ کو مرزا غالبؔ سے جو فکری ربط تھا وہ اول تا آخر برقرار رہا ''جاوید نامہ'' اقبالؔ کی دورِ آخر کی کتاب ہے جو ۱۹۳۲ء میں چھپ کر منظرِ عام پہ آئی۔ آخری زمانے کی اس شاہکار نظم میں اقبالؔ فکر و فن کی بلندیوں کو چھو چکے تھے۔ اِس نظم میں شاعر پیر رومی کی معیت میں افلاک کی سیر پر نکلتے ہیں۔ مختلف سیاروں میں ارواحِ جلیلہ اور ملائک سے شرفِ ملاقات حاصل کرتے ہیں اور اہم مسائل پر تبادلۂ خیالات اور سوالات کے جوابات حاصل کرتے ہیں۔

فلک مشتری پر شاعر کی ملاقات منصور حلاج، غالبؔ اور ایران کی مشہور شاعرہ قرۃ العین کی ارواح جلیلہ سے ہوتی ہے۔ خودی کے موضوع پر تبادلۂ خیالات ہوتا ہے اور زندگی کے اسرار و رموز بیان کئے جاتے ہیں۔ شاعر اور غالبؔ کے درمیان شعر کی وسعت اور بیکرانی خاص طور پر زیرِ بحث آتی ہے غالبؔ کے خیال میں بہت سے نکات ایسے ہیں جو شعر کے تاروں میں نہیں سما سکتے اور ان کے نمود کے لئے شاعری نہیں وہ کافری درکار ہے جسے ماورائے شاعری کا نام دیا جاتا ہے۔ نوائے حلاج، نوائے غالبؔ، نوائے طاہرہ سننے کے بعد زندہ رود اپنی بعض مشکلات ان ارواحِ بزرگ کے سامنے پیش کرتا ہے۔ یہاں ایک بار پھر اقبالؔ غالبؔ ہی کو اہمیت و قدر و قیمت بخشتے ہیں جس سے اقبالؔ اور غالبؔ کی دیرینہ فکری وابستگی اور عقیدت کا برملا اظہار ہوتا ہے۔

اقبالؔ جب روحِ غالبؔ سے شرفِ ملاقات حاصل کرتے ہیں تو غالبؔ اپنی غزل:

بیا کہ قاعدہ ٔ آسماں بگردانیم
قضا بگردشِ رطلِ گراں بگردانیم [۱۳]

مستانہ انداز میں جھوم جھوم کر سناتے ہیں۔ یہ خودی اور خود شناسی کا وہ ترانہ ہے جو خود اقبالؔ کے دل کی آواز بھی تھا۔ اُس زمانے میں اقبالؔ ختمِ نبوت کے کلامی مسئلے پر غور فرما رہے تھے چنانچہ وہ شاگردانہ انداز میں اپنی الجھن، سُلجھن کے لئے غالبؔ کے روبرو پیش کرتے ہیں اور اس شعر کا مطلب دریافت کرتے ہیں:

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود
رحمتہ اللعالمینے ہم بود [۱۴]

غالبؔ کسی اُستاد کی طرح سمجھاتے ہیں کہ ابتدا خلق وتدبیر اور ہدایت سے ہوتی ہے جس کی انتہا رحمتہ للعالمینی ہے۔ غالبؔ اقبالؔ کو آگاہ کرتے ہیں کہ آپ بھی میری طرح ''بینندۂ اسرار'' ہیں۔ مجھے اِس سے زیادہ کچھ کہنے کی اجازت نہیں تم بھی میری طرح اسرارِ شعر بخوبی سمجھتے ہو اِس لئے صرف اشارہ ہی کافی ہے۔

اے چومن بینندۂ اسرارِ شعر

ایں سخن افزوں تراست از تارِ شعر ۱۵؎

علامہ اقبالؔ کے نزدیک عشقِ رسولؐ ایمان کا جزوِ اعظم ہے اُس زمانے میں وہابی اور حنفی علماء میں ختمِ نبوت کے مسئلے پر بحث چھڑی ہوئی تھی۔ اِس اہم دینی مسئلے کو سلجھانے کے لئے اقبالؔ کی نگاہ اگر کسی کی طرف اٹھتی ہے تو وہ غالبؔ ہی ہیں جن کے افکار کی روشنی میں وہ اپنے دل کی خلش دور کر لینا چاہتے تھے۔

''جاوید نامہ'' میں زندہ رود نے غالبؔ سے اُن کے ایک شعر کی وضاحت طلب کی اور اس وضاحت میں بھی غالبؔ اور اقبالؔ کی فکری ہم آہنگی پنہاں ہے۔ شعر ہے:

؎ قمری کفِ خاکستر و بُلبُل قفسِ رنگ

اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے ۱۶؎

الغرض فلک مشتری پر اقبالؔ نیازمندانہ غالبؔ کی صحبت میں رہے اور دیر تک اپنے دل کی خلش دور کرنے کے لئے اُن سے سوال کرتے اور جواب حاصل کرتے رہے کیونکہ وہ اُن کو محض ایک شاعر ہی نہیں بلکہ اس سے بہت زیادہ سمجھتے تھے۔ غالبؔ اور اقبالؔ کی فکری مطابقت کے ضمن میں ڈاکٹر عبدالمغنی کی یہ رائے بہت وزن رکھتی ہے کہ:

''اقبالؔ اور غالبؔ کی ذہنی ساخت اصلاً ایک دوسرے سے ملتی جلتی تھی۔ اُن کے نفس کا میلان اور مزاج کا رنگ ایک سا تھا۔ خود آگہی، وسعتِ نظر اور لطافتِ تخیل کے سرمایہ دار دونوں تھے۔ خودسری، بے باکی، جدت اور اختراع سے دونوں بہرہ ور تھے۔ سب سے اہم بات یہ کہ دونوں کا شعور فلسفیانہ اور ذوق عاشقانہ تھا۔ چنانچہ دونوں ''ورائے شاعری چیزے دگر'' کے قائل ہیں اور شاید اسی ''پیغمرانہ'' احساس کے سبب ایک خود کو ''عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ'' اور دوسرا اپنے بارے میں ''من شاعرِ فرداستم'' کہتا ہے'' ۱۷؎

ڈاکٹر یوسف حسین خان غالبؔ اور اقبالؔ کے غائر مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ:

''غالبؔ اور اقبالؔ کے خیالات اور فنی محرکات میں بڑی حد تک مماثلت ملتی ہے۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کہنا درست ہوگا کہ اقبالؔ غالبؔ ہی کے سلسلے کا شاعر ہے۔ اُس نے اپنے اظہارِ خیال کے لئے غالبؔ ہی کے پیرایۂ بیان کی پیروی کی جس میں تخلیقی توانائی بھی ہے اور ندرت بھی''۔ ۱۸؎

معروف نقاد حامد حسن قادری نے میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کے محاسنِ شعری کا تجزیہ کرتے ہوئے چند اشعار موزوں کئے ہیں جنہیں یہاں نقل کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ملاحظہ ہوں:

تین شاعر مختلف اوقات میں پیدا ہوئے
جن کے فیضِ طبع نے اُردو کو گنجِ زر دیا
اک اثر میں بڑھ گیا اک رفعتِ تخیل میں
تیسرے کی ذات میں دونوں کو حق نے بھر دیا
کائناتِ شاعری میں بس یہی دونوں کمال
تیسرے میں اِس لئے دونوں کو یکجا کر دیا ۱۹؎

حق یہ ہے کہ قدرت نے علامہ اقبالؔ کی فطرت میں میرؔ اور غالبؔ جیسے نابغہ روزگار اور عظیم شعراء کی آفاقیت کو یکجا کر دیا ہے۔

اقبالؔ، اکبر الہ آبادی کے نام ایک خط میں اُن سے اپنی عقیدت اور محبت کا اعتراف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

''عام لوگ اس شاعرانہ انداز سے بے خبر ہوتے ہیں۔ اُن کو کیا معلوم کہ کسی شاعر کو داد دینے کا بہترین طریق یہ ہے کہ اگر داد دینے والا شاعر ہو تو جس کو داد دینا مقصود ہو اُس کے رنگ میں شعر لکھے یا بالفاظِ دیگر اُس کا تتبع کر کے اس کی فوقیت کا اعتراف کرے۔ میں نے بھی اس خیال سے چند اشعار آپ کے رنگ میں لکھے ہیں۔۔۔'' ۲۰؎

میرے نزدیک علامہ اقبالؔ کی یہ رائے غالبؔ کے باب میں بھی اتنی ہی سچی اور وقیع ہے جتنی اکبر الہ آبادی کے سلسلے میں۔ اقبالؔ نے نہ صرف افکارِ غالبؔ سے جذب و استفادہ کیا بلکہ اپنے منفرد اندازِ شاعری کی بدولت اُسے ایک نئی سمت اور جہت بھی بخشی۔

ڈاکٹر عبدالحق کی رائے کے مطابق:

''اقبال کے نغمہ وفن کا ایک اہم سرچشمہ مرزا غالب کا شعر وفن ہے۔ جس سے اقبال کے اسالیبِ فن کا رشتہ اُستوار رہا ہے۔ دونوں کے فکر وخیال میں ایک حد تک مشابہت موجود ہے'' ۔ ۲۱

ڈاکٹر عبدالحق کے خیال میں غالب سے اقبال کی ذہنی قربت اُن کی شاعری کے ابتدائی دور سے ہی شروع ہو جاتی ہے جو ان کی فکری زندگی کا تشکیلی دور ہے اور اقبالیات کے مطالعہ میں بہت نتیجہ خیز بھی ہے۔ ان کی شاعری انیسویں صدی کی آخری دہائی سے شروع ہو جاتی ہے اس دور کا کلام باقیات اور نوادرات کے مجموعہ میں موجود ہے۔ اس حصہٗ کلام کا بیان اور اسلوب، غالب کے اسالیب سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ ابتدائی دورِ شاعری کی منظومات میں اقبال نے تضمین کا استعمال بھی کیا ہے اِن تضمینوں سے ذہن اِقبال کی غالب پسندی اور ندرتِ فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہاں مولانا روم، سعدی، حافظ، قدسی، بیدل، صائب، خان آرزو کے ہمراہ غالب بھی دکھائی دیتے ہیں بلکہ غالب کے اشعار کی تعداد دوسرے سبھی شعراء کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ ۲۲

صرف بانگِ درا کے ''ظریفانہ'' میں شامل یہ اشعار ملاحظہ کیجئے۔

''اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے''
غالب کا قول سچ ہے تو پھر ذکرِ غیر کیا؟ ۲۳

یا

میرزا غالب خدا بخشے بجا فرما گئے
''ہم نے یہ مانا کہ ڈلی میں رہیں، کھائیں گے کیا'' ۲۴

بالِ جبریل کی نظم ''فلسفہ ومذہب'' کا اختتام غالب کے اس شعر سے کرتے ہیں۔

جاتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں ۲۵

ڈاکٹر عبدالحق کے خیال میں اقبال کی غالب شناسی میں مولانا میر حسن کا بھی بہت ہاتھ رہا ہوگا۔ اقبال پر مولانا میر حسن کی چھاپ بہت گہری تھی اِسی نسبت سے انہیں ''اقبال گر'' بھی کہا گیا ہے۔ مولانا میر حسن شعر وادب کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے یقیناً انہوں نے اپنے شاگردِ رشید میں غالب شناسی کے ذوق وشوق کو جلا بخشی ہوگی۔ ۲۶

علامہ اقبال کے سامنے اردو زبان وادب کا جو شعری سرمایہ موجود تھا ان میں غالب ہی ایسے نامور فنکار تھے جن

کے تخیل اور تفکر کی دلآویزی علامہ اقبالؔ کے لئے باعث کشش تھی ۱۹۰۱ء میں غالبؔ پر لکھی جانے والی نظم کا یہ شعر اِس حقیقت کا واضح ثبوت ہے۔

شاہدِ مضمون تصدّق ہے ترے انداز پر
خندہ زن ہے غنچۂ دلّی گلِ شیراز پر ۲۷

ڈاکٹر سید عبداللہ اس نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''غالبؔ کی اہمیت اقبالؔ کی نظر میں اس لئے بھی ہے کہ غالب ایک تہذیب کا نمائندہ اور ایک عظیم فکری روایت کا وارث و ترجمان بلکہ آخری وارث و ترجمان تھا۔ جس کے بعد جہان آباد یعنی دہلی کے بام و در سراپا نالۂ خاموش بن گئے گویا غالبؔ کی قدر و قیمت اِس لئے بھی ہے کہ وہ اُن تہذیبی و فکری قدروں کا شناسا اور معیار شناس تھا جن کی معیار شناسی خود اقبالؔ کے فکر و فن کا امتیاز خاص ہے''۔ ۲۸

جہان آباد کا اجڑنا اور تاراج ہونا غالبؔ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور اِس درد کو اقبالؔ نے بڑی شدت سے محسوس کیا تھا۔

غالبؔ سے اقبالؔ کی وابستگی اور شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ اپنے اُستادِ محترم داغ دہلوی کا مرثیہ لکھنے کے لئے قلم اٹھاتے ہیں تو اس کا آغاز بھی عظمتِ غالبؔ کے اعتراف سے کرتے ہیں:

عظمتِ غالبؔ ہے اک مدت سے پیوندِ زمیں
مہدیٔ مجروح ہے شہرِ خموشاں کا مکیں ۲۹

غالبؔ اور اقبالؔ کا یہ فکری تعلق چند روزہ نہیں تھا بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اِس میں برابر اضافہ اور اِس کی حدود میں برابر توسیع ہی ہوتی چلی گئی۔

حوالہ جات

۱۔ محمد اقبالؔ، علامہ ، بال جبریل ، کلیات اقبالؔ اُردو" (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، اشاعت سوم، ۱۹۷۷)صفحہ ۳۱۵

۲۔ اقبالؔ، ضرب کلیم، کلیات اقبالؔ اُردو صفحہ ۵۷۱

۳۔ اقبالؔ ، شذرات، فکرِ اقبالؔ، مترجم ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، مرتب ڈاکٹر جاوید اقبالؔ (لاہور، مجلس ترقی، ادب، اشاعت اول، ۱۹۷۳)صفحہ ۱۰۵

۴۔ عبدالقادر، سر شیخ، دیباچہ بانگ درا" (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، اشاعت سوم، ۱۹۷۷ء)صفحہ ۹

۵۔ ایضاً صفحہ ۹

۶۔ اقبالؔ، بانگ درا، کلیات اقبالؔ اُردو، صفحہ ۲۶۔۲۷

۷۔ عبدالحکیم، ڈاکٹر، خلیفہ، فکرِ اقبالؔ (لاہور: بزمِ اقبالؔ کلب، طبع ہفتم ۱۹۹۲ء، صفحہ ۴۵

۸۔ اقبالؔ، بانگ درا" کلیات اقبالؔ اُردو" صفحہ ۲۶

۹۔ "اقبالؔ، شذرات فکر اقبالؔ" صفحہ ۶۵

۱۰۔ یوسف حسین ، ڈاکٹر، خان، غالبؔ اور اقبالؔ کی متحرک جمالیات (لاہور: نگارشات اُردو آرٹ پریس ، اشاعت اول، ۱۹۸۶)صفحہ ۲۰

۱۱۔ ایضاً صفحہ ۱۷۔۱۸

۱۲۔ اقبالؔ، شذرات فکر اقبالؔ، صفحہ ۱۰۲

۱۳۔ غالبؔ، مرزا اسداللہ خان، کلیات غالبؔ فارسی، جلد سوم مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی (لاہور: مجلس ترقی ادب، اشاعت اول، ۱۹۶۷ء)صفحہ ۲۶۵

۱۴۔ اقبالؔ جاوید نامہ ، کلیات اقبالؔ فارسی (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، اشاعت دوم ۱۹۷۵ء)صفحہ ۱۴۷

۱۵۔ ایضاً، صفحہ ۱۵۷

۱۶۔ ایضاً، صفحہ ۱۲۷

۱۷۔ عبدالمغنی، ڈاکٹر ، مضمون "اقبالؔ اور غالبؔ" از "اقبالؔ اور مشاہیر" مرتبہ طاہر تونسوی (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۸ء) صفحہ ۴۳

۱۸۔ یوسف حسین، ڈاکٹر، خان، متحرک جمالیات، صفحہ ۳۲

۱۹۔ حامد حسن قادری ، میر۔ غالبؔ۔ اقبالؔ۔ نیرنگِ خیال ، اقبالؔ نمبر (لاہور: ادارہ فروغ اُردو ، شمارہ نومبر ۱۹۷۷ء) صفحہ ۲۴۸

۲۰۔ اقبالؔ، اقبالؔ نامہ (حصہ دوم) مرتبہ شیخ عطا اللہ، صفحہ ۴۱

۲۱۔ عبدالحق، ڈاکٹر، اقبالؔ اور غالبؔ کے ذہنی رشتے، نقوش، اقبالؔ نمبر، شمارہ ۱۲۱ (لاہور: ادارہ فروغ اُردو ستمبر ۱۹۷۷ء) صفحہ ۱۴۶

۲۲۔ ایضاً صفحہ ۱۴۶

۲۳۔ اقبالؔ، بانگِ درا، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۲۸۵

۲۴۔ ایضاً، صفحہ ۲۸۷

۲۵۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو صفحہ ۴۴۰

۲۶۔ عبدالحق ، ڈاکٹر، نقوش اقبالؔ نمبر ، ستمبر ۱۹۷۷ء، صفحہ ۱۴۶

۲۷۔ اقبالؔ، بانگِ درا، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۲۶

۲۸۔ عبداللہ، ڈاکٹر، سید، مسائل اقبالؔ (لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، طبع اول، ۱۹۷۴ء) صفحہ ۱۱۵، ۱۱۶

۲۹۔ اقبالؔ بانگِ درا، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۸۹

باب دوم

غالبؔ اور اقبالؔ

شخصیت، ماحول اور ادبی روایت کے آئینے میں

غالبؔ اور اقبالؔ شخصیت، ماحول اور ادبی روایت کے آئینے میں

ادب میں شخصیت اور ماحول کا مطالعہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ بچپن کے حالات، ماحول اور تعلیم و تربیت وہ عناصر ہیں جو کسی شخص کی زندگی پر براہِ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔ انہی اثرات کے تحت فنکار کی شخصیت کے سانچے ڈھلتے ہیں اور فن میں اظہار کی راہ پاتے ہیں۔

شخصیت کی تشکیل ماحول ہی میں رہ کر ہوتی ہے۔ ماحول کو ایک زبردست عامل تسلیم کیا جاتا ہے جو نہ صرف شاعر و ادیب بلکہ سماج کے ہر فرد کو متاثر کرتا ہے۔ ماحول کے گہوارے میں پرورش پا کر ہی سیرت و کردار، افکار و خیالات کا تعین ہوتا ہے اور جب انہیں اظہار کی راہ ملتی ہے تو تخلیق کردہ فن پر اس کی مہر ثبت ہو جاتی ہے یہاں تک کہ ہم تخلیق کے آئینے میں تخلیق کار تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور خوب جان لیتے ہیں کہ کون سا شعر میرؔ کے دل کی آواز ہے تو کون سا خیال غالبؔ کی فکرِ رسا کا غماز ہے اور کس شعر کے آئینے میں اقبالؔ کا فکر و فلسفہ جلوہ نما ہے اور کہاں دو عظیم شعرا کے فکر و خیال کے ڈانڈے باہم مل رہے ہیں۔

غالبؔ اور اقبالؔ دو ایسی منفرد شخصیات ہیں جس کی کوئی نظیر اب تک دنیائے ادب میں نہیں ملتی۔ اُن کا تخیل نادرۂ کار اور مضامین جداگانہ ہیں۔ غالبؔ ہوں یا اقبالؔ دونوں ہی نابغۂ روزگار شخصیات تھے اور دونوں ہی کو آفاقی شاعر تسلیم کیا گیا۔ دونوں شعراء کے مابین ایک فکری اور ذہنی رشتہ استوار نظر آتا ہے جس کی تفصیل میں جانے سے پیشتر لازم ہے کہ دونوں فنکاروں کی شخصیت کی پرداخت و نشو و نما اور ماحول کے تقاضوں کو پرکھا جائے۔ دونوں کے ذاتی، خاندانی اور سیاسی و سماجی حالات پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی جائے نیز اُس ادبی روایت اور ورثے کو بھی زیرِ غور رکھا جائے جس سے دونوں عظیم شعراء نے نہ صرف استفادہ ہی کیا بلکہ نئی جہتیں اور راہیں بھی تلاش کیں۔ اس تناظر میں غالبؔ اور اقبالؔ کی فکری مطابقت پر تحقیق میں آسانی پیدا کی جاسکتی ہے۔

زمانی اعتبار سے غالبؔ اور اقبالؔ کے درمیان کافی بُعد پایا جاتا ہے غالبؔ کی وفات ۱۸۶۹ء میں ہوئی اور اقبالؔ کی ولادت ۱۸۷۷ء میں۔ یہ فرق اگرچہ زیادہ نمایاں نہیں لیکن جب اقبالؔ نے شعر گوئی کا آغاز کیا اس سے تقریباً چالیس برس پیشتر غالبؔ کی ''نوائے سروش'' خاموش ہو چکی تھی لہذا غالبؔ ہی اقبالؔ کے پیشرو اور روحانی پیشوا ٹھہرے جن کی قوتِ متخیلہ کے اقبالؔ تاحیات معترف رہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری دونوں عظیم شاعروں کے اشتراک کے متعلق یوں تحریر رقم طراز ہیں۔

''غالبؔ اور اقبالؔ دونوں اُردو کے مایۂ ناز فنکار ہیں دونوں اردو اور فارسی کے عظیم المرتبت شاعر اور اپنے اپنے اسلوب کے موجد اور اپنی زبان کے خالق ہیں، دونوں ابداع اور اختراع کی بے پناہ قوتوں کے مالک ہیں۔ دونوں کا تجر علمی اپنے معاصرین میں امتیازی اور طرز فکر فلسفیانہ ہے۔ دونوں نے اردو میں ترقی پسندانہ رجحانات کو رواج دے کر ہماری شاعری کو ایک نیا موڑ عطا کیا۔ اگر غالبؔ اور اقبالؔ کی شخصیتوں کی اس خارجی مماثلت کے اسباب پر غور کریں اور دونوں کے مجموعی کلام کو پیش نظر رکھ کر ان کی فنی، علمی اور تخلیقی بصیرتوں کا تقابلی جائزہ لیں تو ہمیں ان کی طبیعتوں میں عجیب تطابق وتشابہ نظر آتا ہے۔''[1]

خود غالبؔ اپنے آپ کو متعارف کرواتے ہوئے کہتے ہیں:

غالبِؔ نام آورم، نام و نشانم مپرس
ہم اسد اللہم و ہم اسد اللہیم [2]

نسلی برتری پر فخر و ناز غالبؔ کے مزاج کا خاصہ ہے۔ ان کا تعلق ایک ترک قوم سے تھا خود ان کے خیال میں ان کا سلسلہ نسب توران ابنِ فریدون سے ملتا ہے۔ خاندانِ توران جب کیانی خاندان کے ہاتھوں زوال کا شکار ہوا تو جان بچانے کی غرض سے لوگ ادھر ادھر نکل پڑے۔ غالبؔ کے پردادا ترسم خان نے ثمر قند میں پناہ لی۔ غالبؔ کے دادا احمد شاہ بادشاہ کے عہد میں ثمر قند سے ہندوستان آئے اور لاہور میں ملازمت اختیار کی بعد ازاں دہلی چلے آئے جہاں غالبؔ کے والد مرزا عبداللہ بیگ کی پیدائش ہوئی۔

غالبؔ کے آبا و اجداد کا پیشہ سپاہ گری تھا اور یہ موروثی سپہ گری ان کے لئے سرمایۂ افتخار تھی۔

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپاہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے [3]

دادا کی وفات کے بعد غالبؔ کے والد لکھنؤ میں آصف الدولہ کے ہاں ملازم ہوئے پھر حیدر آباد جا کر نظام کی ملازمت اختیار کی۔ ملازمت کے انقطاع کے بعد آگرہ چلے گئے یہیں ان کی شادی ہوئی ریاست الور کی ایک بغاوت کے خلاف لڑتے ہوئے مرزا کے والد جاں بحق ہوئے اس وقت مرزا کی عمر صرف پانچ برس تھی جب وہ شفقتِ پدری سے محروم ہو گئے۔ مرزا غالبؔ ان کے بھائی مرزا یوسف خان اور ایک بہن تین یتیم بچوں کی کفالت کا باراُن کے چچا نصر

اللہ بیگ نے کاندھوں پر اُٹھایا جو اس وقت مرہٹوں کی طرف سے آگرہ کے صوبیدار تھے۔ ابھی غالبؔ کی عمر نو سال ہی تھی کہ چچا بھی ملک عدم کو سدھار گئے اور ان کی تعلیم و تربیت اور پرورش کی ذمہ داری ان کے نانا نے قبول کی جو اس وقت آگرہ کے عمائدین میں شمار کئے جاتے تھے۔ نانا کی آغوش اِمارت میں غالبؔ کا بچپن نوابی ٹھاٹھ اور شاہانہ انداز میں گزرا۔ حالیؔ کے الفاظ میں:

''مرزا کا بچپن اور عنفوانِ شباب بڑے اللّے اور تللّوں میں بسر ہوا تھا۔''[4]

شطرنج اور چوسر کی بازیاں، پتنگ بازی کا شغل، بے فکر دوستوں کی صحبت اور شراب نوشی سے رغبت اسی زمانے میں پیدا ہوئی شاید اسی لئے مرزا غالبؔ کے تعلیمی سفر کی تفصیلات نہیں ملتیں۔ حالیؔ نے آگرہ کے ایک مشہور معلم شیخ معظم کو مرزا کا استاد بتایا ہے کچھ کے خیال میں نظیر اکبرآبادی بھی ان کے استاد رہے لیکن غالبؔ کے مکاتیب میں اس سلسلے میں کوئی اشارہ نہیں ملتا البتہ فارسی کی تعلیم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ عبدالصمد جو عربی اور فارسی کا جیّد عالم تھا اس سے غالبؔ نے اپنی فطری استعداد اور مناسبت طبیعی کی بدولت مختصر مدت میں فارسی پڑھی اور اس کے اصول وقواعد سیکھ لئے لیکن شاعری کے سلسلہ میں وہ کسی کے شاگرد نہ تھے اس سلسلہ میں حالیؔ وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''کبھی کبھی مرزا کی زبان سے یہ بھی سنا گیا ہے کہ ''مجھ کو مبداءِ فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے اور عبدالصمد محض ایک فرضی نام ہے۔ چونکہ لوگ مجھ کو بے استاد کہتے تھے اُن کا منہ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی اُستاد گھڑ لیا ہے''۔[5]

غالبؔ کے خاندانی پس منظر اور ابتدائی تعلیم و تربیت کے مقابل جب ہم اقبالؔ کے خاندانی حالات اور تعلیم و تربیت پر نگاہ دالتے ہیں تو چند اشتراکات کو چھوڑ کر دونوں عظیم ہستیوں کے حالات اور ماحول میں نمایاں تفاوت اور اختلافات کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اقبالؔ اس معاملے میں بڑے خوش قسمت تھے کہ انہیں ایک سلجھا ہوا گھریلو ماحول اور اعلیٰ تعلیم کے بہتر مواقع میسر آئے۔

علامہ اقبالؔ کا تعلق کشمیری پنڈتوں کے ایک قدیم خاندان سے تھا گوت سپرو تھی۔ ان کے جدّ اعلیٰ ان کی ولادت سے تقریباً ڈھائی سو سال پیشتر اسلام قبول کر چکے تھے اور کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ میں سکونت پذیر تھے لیکن اقبالؔ کا ذہنی رشتہ اپنے قدیم آبائی وطن سے بہت گہرا تھا انہیں بھی غالبؔ ہی کی طرح اپنے آباؤاجداد پر فخر و ناز تھا کیونکہ برہمن ہندوستان میں ابتدا ہی سے علم وفکر کے نبّاض اور وارث خیال کئے جاتے تھے۔

اقبالؔ کے سلسلہ اجداد کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا خاندان فطری طور پر دنیوی یا مادی آسودگی کے مقابلے میں اخلاقی اور روحانی مسرتوں کی جستجو میں تھا۔ اقبالؔ اپنی نظم ''جاوید سے'' میں فخر کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

غارت گرِ دیں ہے یہ زمانہ
ہے اس کی نہاد کافرانہ
جس گھر کا مگر چراغ ہے تو
ہے اس کا مذاق عارفانہ [۶]

اقبالؔ کے والدِ محترم شیخ نور محمد ایک درویش صفت اور پرہیز گار بزرگ تھے۔ اقبالؔ کی والدہ بھی بڑی نیک سیرت، عبادت گزار اور شب بیدار خاتون تھیں۔ اقبالؔ کی تربیت انہی خدا رسیدہ، شب بیدار والدین کے زیرِ سایہ ہوئی۔ والد شیخ نور محمد کی خواہش تھی کہ اقبالؔ کو سب سے پہلے دینی تعلیم کے معارف سے آشنا کروایا جائے چنانچہ ابتدائی تعلیم کا آغاز مولانا غلام حسین کی ''مسجد درسگاہ'' سے کروایا گیا۔ بعد ازاں مولوی میر حسن کی خواہش پر ان کے شاگرد بنے جنہوں نے ان کی فطری صلاحیتوں کو جلا بخشی اور گلستان، بوستان، سکندر نامہ، انوارِ سہیلی اور ظہوری کی تصانیف اس طرح پڑھائیں کہ اقبالؔ اسلامی علوم، تصوّف و عرفان اور فارسی ادب کے احترام سے سرشار ہو گئے۔ تربیتِ استاد ہی کی بدولت آغاز ہی سے اقبالؔ کو تفحص اور جستجو کا چسکا لگ گیا اور انہیں کے فیض سے آپ اقبالؔ سے بڑھ کر علامہ محمد اقبالؔ ٹھہرے۔

نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھ کو [۷]

اقبالؔ کو حصولِ علم کا بچپن ہی سے بہت زیادہ شوق تھا۔ اسی شوق اور لگن کے نتیجے میں اقبالؔ کو پرائمری، مڈل اور انٹرنس کے امتحانات پاس کرنے پر وظائف بھی ملے پھر سکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے ایف۔ اے پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ جہاں انہیں آرنلڈ جیسا استاد میسر آیا جنہوں نے آپ کے فلسفیانہ ذوق کو جلا بخشی۔ عربی اور انگریزی میں یونیورسٹی میں اول پوزیشن حاصل کرنے پر میڈل بھی ملے۔ ایم۔ اے فلسفہ کے امتحان میں اقبالؔ واحد امیدوار کی حیثیت سے شریک ہوئے اور بہادر شیخ نانک بخش گولڈ میڈل حاصل کیا۔ ستمبر ۱۹۰۵ء میں اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کے لئے انگلستان تشریف لے گئے وہاں اپنے تین سالہ مختصر قیام کے دوران کیمبرج

یونیورسٹی سے Tripos اور میونخ یونیورسٹی جرمنی سے پی۔ ایچ۔ ڈی اور Lincolns Inn سے بیرسٹری کے امتحانات پاس کئے۔ اس لحاظ سے اقبالؔ غالبؔ کی بہ نسبت زیادہ اقبال مند ثابت ہوئے کہ انہیں مشرق و مغرب کی بہترین درسگاہوں سے باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کے سنہری مواقع میسر آئے۔ السنۂ شرقیہ کے علاوہ مغربی بالخصوص انگریزی اور جرمنی ادب کے بہترین نمونوں سے استفادہ حاصل کرنے کا موقع بھی ملا۔ جب کہ غالبؔ کی اقبالؔ کی طرح مغربی ادبیات تک رسائی نہ تھی گو علمی اعتبار سے غالبؔ کا ماحول بھی خاصا زرخیز تھا۔

غالبؔ نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی۔ وہاں بڑے بڑے شاعر، بلند پایہ علماء، حکما، فیض یاب ہونے کے لئے موجود تھے۔ بیدلؔ، عرفیؔ اور حزیں مقبول تھے دور اکبری کے بعد فارسی شاعری کی روایات بھی استوار ہو چکی تھیں۔ فغانیؔ کے زیرِ اثر ہندوستان بلکہ ایران میں بھی مشکل گوئی اور مضمون آفرینی کا رواج فروغ پا رہا تھا۔ پریس کے قیام نے مطالعۂ کے شوق کو ہوا دے رکھی تھی۔ غالبؔ کے شب و روز ایک ایسے ماحول میں بسر ہو رہے تھے جس میں اردو کے علمی و ادبی سرمائے سے بھی استفادہ کیا جا رہا تھا اور فارسی کی ساکھ بھی برقرار تھی اسی لئے غالبؔ کبھی ریختہ کو ''رشک فارسی'' قرار دیتے تھے تو کبھی اپنی ''فارسی بینی'' پر نازاں نظر آتے تھے۔

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکر ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالبؔ ایک بار پڑھ کر اُسے سنا کہ یوں ۸

اور پھر یہ بھی فرماتے ہیں کہ:

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگزر، از مجموعۂ اُردو کہ بیرنگِ منست ۹

ماحول کے اسی تاثر کے نتیجہ میں غالبؔ ایک پرت دار اور پہلو دار شخصیت کے مالک بنے اور ڈاکٹر وزیر آغا نے اس رائے کا اظہار کیا کہ:

''غالبؔ کی شخصیت ایک مجموعۂ اضداد ہے'' ۱۰

غالبؔ اور اقبالؔ دونوں نے مختلف ادبی روایتوں سے استفادہ کیا ہے۔ اس امر کا جائزہ لیتے ہوئے شیخ محمد اکرام تحریر فرماتے ہیں کہ:

''غالبؔ کے پیش نظر شاعرانہ اظہار کے ذرائع بہت محدود اور ناقص تھے یعنی غزل اور قصیدہ یا زیادہ

سے زیادہ مثنوی اور رباعی۔ شاعرانہ مضامین کا میدان اس سے بھی تنگ تھا۔ قدیم زمانے سے شعراء ایک تنگ دائرے میں شعر گوئی کرتے آئے تھے جس سے باہر نکلنا گویا کفر تھا۔ اگر کوئی جدت پسند عام روش سے ہٹنا چاہتا تو نہ اس کے سامنے کوئی صحیح نمونہ تھا نہ شاعرانہ خوبیاں پرکھنے کے لئے کوئی صحیح معیار۔۔۔اقبالؔ کی خوش نصیبی کہ السنہ شرقیہ کے علاوہ مغربی، بالخصوص انگریزی اور جرمن کے بہترین شعراء کے نمونے ان کے سامنے موجود تھے۔ نئے اصنافِ شاعری اور نئے خیالات کے خلاف جو تعصب تھا اسے بہت حد تک حالیؔ اور کسی حد تک غالبؔ نے کم کر دیا تھا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے کلام میں مشرق و مغرب کی بہترین خصوصیات ہیں۔ مضامین میں بے حد تنوع اور شگفتگی ہے۔ اصناف شاعری میں بھی ان کے وسیع مطالعہ کا اثر نمایاں ہے اور ''پیامِ مشرق'' میں کئی ایسی شاعرانہ طرزیں ہیں جو قدیم مشرقی شاعری میں معدوم ہیں اور جنہیں شاعر نے مغربی یا جدید ایرانی شاعری سے اخذ کیا ہے۔''[11]

غالبؔ کے پیشِ نظر تمام فارسی شعراء کا کلام موجود تھا لیکن انہوں نے صرف ہندوستان کے فارسی شعراء سے کسب فیض کیا۔ گو ان کے دل میں حافظؔ کی بڑی قدر و منزلت تھی اور ان کے کلام میں کئی جگہ حافظ کا ذکر بھی آیا ہے ایک غزل کا مقطع ہے۔

غالبم تشنۂ تلخاب نہ ہمچون حافظؔ
مائلِ شاخِ نباتم، تنہ نا ہا یا ہو [12]

اقبالؔ نے بھی زبان اور طرزِ ادا کے معاملے میں حافظؔ کی پیروی کی ہے اور ان کی بہترین غزلوں میں حافظؔ کی سہل ممتنع، شیرینی، دلآویزی اور سادگی ہے۔

مرزا غالبؔ کو اپنی فارسی شاعری پر ہمیشہ ناز رہا بلکہ ان کی اردو شاعری بھی فارسی شاعری ہی کے زیر اثر رہی۔ دراصل غالبؔ جس ادبی اور شعری روایت کے پروردہ تھے اس میں عرفیؔ، نظیریؔ، ظہوریؔ، فیضیؔ، طالبؔ، صائبؔ، کلیمؔ اور عبدالقادر بیدلؔ جیسے شعراء کا اسلوب راہنما تصور کیا جاتا تھا۔ جس میں ژولیدہ بیانی اور ابہام سے کام لے کر فارسی غزل کو زیادہ معنی خیز اور تہہ دار بنا دیا جاتا تھا۔ غالبؔ نے اپنے ذہنی سفر میں بیدلؔ کی راہنمائی اختیار کی۔ بیدلؔ نے مشکل بندشوں، مبہم خیالات اور مابعد الطبیعاتی تصورات کو فارسی غزل میں سمو کر اس میں خیال انگیزی، سنجیدگی اور فکر کی

گہرائی پیدا کی۔ غالبؔ کی دشوار پسندی اور ''پابستگی'' رسم ورہِ عام'' سے بچ بچ کر چلنے کی شعوری کوشش اسی ذہنی رجحان کی نشاندہی کرتی ہے۔

غالبؔ نے پچیس سال کی عمر تک بیدلؔ ہی کو اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا اس کے بعد اصلاحِ زبان اور سہل نگاری کی طرف مائل ہو گئے اور عرفیؔ ونظیری کو اپنا رہنما تصور کرنے لگے۔ حقیقت یہ ہے کہ غالبؔ کی تقلید میں بھی اجتہاد کا رنگ غالبؔ رہا۔ انہوں نے اپنی انفرادیت پسندی سے کام لے کر اپنے بے پناہ تخیل سے معانی کے نت نئے گلزار کھلائے ہیں۔ اس سلسلہ میں آل احمد سرور صاحب کی یہ رائے بہت وقیع ہے۔

''بیدلؔ کے رنگ میں انہوں نے جو شعر کہے ہیں ان میں نازک خیالی ہے، معنی آفرینی ہے، مشکل پسندی ہے، ''کوہ کندن اور کاہ برآوردن'' بھی ہے۔ اردو میں فارسی تراکیب کی وجہ سے اغلاق و اشکال بھی ہے مگر یہ سب چیزیں ایک گم کردہ راہرو کی صدائے دردناک ہی نہیں ایک سیلانی کی نئے دشت ودر کی جستجو، ایک سیاح کی نئے زمین وآسمان کی تلاش، ایک آزاد اور بے پروا تخیل کی ذہنی مشق بھی ہیں''۔[۱۳]

غالبؔ کے زمانہ تک اردو شاعری میں میرؔ، سوداؔ، دردؔ، آتشؔ، ناسخؔ، ذوقؔ اور مومنؔ جیسے بڑے بڑے شاعر ظہور پذیر ہو چکے تھے۔ فارسی کے اثرات جب ان کی شاعری پر سے کچھ کم ہوئے تو ان کی توجہ کا مرکز یقیناً یہ شعراء بھی رہے ہوں گے لیکن غالبؔ نے روایت کو بھی اپنے انداز خاص سے ایک نیا رنگ وروپ بخشا جس میں بڑی ندرت اور تازگی ہے بقول ڈاکٹر یوسف حسین خان:

''اردو غزل میں غالبؔ جدت ادا کا امام ہے۔ میرؔ اور مومنؔ بھی لفظوں پر قدرت رکھتے ہیں لیکن غالبؔ انہیں فاتحانہ انداز میں برتتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ جن لفظوں کو برت رہا ہے وہ اسی کے لئے بنے ہیں وہ خود کہتا ہے:

ما بنودیم بدیں مرتبہ راضی غالبؔ

شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فنِ ما''[۱۴]

غالبؔ نے شعری روایت کی فرسودگی کو جو نیا انداز بخشا اس سلسلے میں حالیؔ کا تجزیہ اہم بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔

''میرؔ وسوداؔ اور ان کے مقلدین نے اپنی غزل کی بنیاد اس بات پر رکھی ہے کہ جو عاشقانہ مضامین
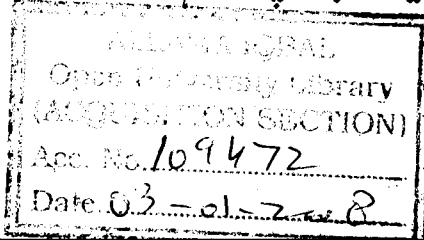
صدیوں اور قرنوں سے اولاً فارسی اور اس کے بعد اردو غزل میں بندھتے چلے آئے ہیں وہی مضامین بہ تبدیل الفاظ اور بہ تغیرِ اسالیبِ بیان، عامہ اہلِ زبان کی معمولی بول چال اور روزمرہ میں ادا کیے جائیں چنانچہ میرؔ سے لے کر ذوقؔ تک جتنے مشہور غزل گو مرزاؔ کے سوا اردو زبان میں گزرے ہیں ان کی غزل میں ایسے مضامین بہت ہی کم نکلیں گے جو اس محدود دائرے سے خارج ہوں۔ برخلاف اس کے مرزا نے اپنی غزل کی عمارت دوسری بنیاد پر قائم کی ہے۔ان کی غزل میں زیادہ تر ایسے اچھوتے مضامین پائے جاتے ہیں جن کو اور شعراء کی فکر نے بالکل مس نہیں کیا۔۔۔۔ جب میرؔ و سوداؔ اور ان کے مقلدین کے کلام میں ایک ہی قسم کے خیالات اور مضامین دیکھتے دیکھتے جی اُکتا جاتا ہے اور اس کے بعد مرزا کے دیوان پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو ایک دوسرا عالم دکھائی دیتا ہے اور جس طرح کہ ایک خشکی کا سیاح سمندر کے سفر میں یا ایک میدان کا رہنے والا پہاڑ پر جا کر ایک بالکل نئی اور نرالی کیفیت مشاہدہ کرتا ہے۔اسی طرح مرزا کے دیوان میں ایک اور ہی سماں نظر آتا ہے۔''[۱۵]

غالبؔ اپنی عصری شعری روایت کے باغی نہ سہی اس کے مکمل طور پر متبع بھی نہ تھے لہٰذا غالبؔ کے مقابلے میں اقبالؔ کی خوش نصیبی یہ ہے کہ ان تک جو ادبی روایت پہنچی وہ غالبؔ اور حالیؔ کے ہاتھوں نکھار پا چکی تھی۔اس اعتبار سے اقبالؔ کو غالبؔ کے مقابلے میں زیادہ بہتر اور صحت مند ادبی روایات پروان چڑھتی ہوئی ملیں۔اردو نثر میں تہذیب الاخلاق کے ذریعے نئی تبدیلیوں کا آغاز کیا جا چکا تھا ۱۸۷۴ء سے پنجاب میں مولانا محمد حسین آزادؔ اور حالیؔ کی کوششوں سے شاعروں کی فضا بدل چکی تھی۔اردو شاعری ایک نیا رخ اختیار کر چکی تھی جس کے تحت اصلاحی و اخلاقی موضوعات پر نظم گوئی کا آغاز کیا جا چکا تھا۔ڈپٹی نذیر احمد ۱۸۶۹ء میں ''مراۃ العروس'' کے ذریعے ناول نگاری کو قبولِ عام بخش چکے تھے اور معاشرتی زندگی کو اخلاقی برائیوں سے پاک کرنے کے لئے متعدد اصلاحی ناول لکھے جا چکے تھے۔

مولانا عبدالحلیم شررؔ نذیر احمد کے کام کو فروغ دے کر اپنی تصانیف کے ذریعے مسلمانوں کے اندر اپنے ثقافتی ورثے کی قدر و قیمت کا احساس بیدار کر چکے تھے۔مولانا شبلی نعمانی بھی اپنی قومی نظموں اور تاریخ اسلام پر مبنی تحریروں کے ذریعے مسلمانوں میں جینے کا نیا حوصلہ بیدار کر چکے تھے اور تاریخ و سیرت نگاری کے لئے راہ ہموار ہو چکی تھی۔

شاعری کے میدان میں اکبر الہ آبادی نے اردو میں اعلیٰ درجے کی ظرافت نگاری کی بنیاد ڈال دی تھی اور ملت کو اپنی تہذیب و اقدار کے تحفظ کا احساس دلانے میں کامیابی سے ہمکنار ہو چکے تھے۔حالیؔ نے شاعری اور نثر دونوں کی کایا

پلٹ کر رکھ دی تھی۔ ان کے ''مقدمہ شعر و شاعری'' اور ''مسدس'' نے بنگال سے لے کر سرحد و پنجاب تک مسلمانوں میں بیداری کی ایک لہر دوڑا دی تھی۔ وہی مسلمان جو پچھلے ڈیڑھ سو سال سے سیاسی اعتبار سے شکستہ پا، تعلیمی لحاظ سے پسماندہ اور سعی و عمل کے لحاظ سے غافل و ناکارہ پڑے ہوئے تھے انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں یکا یک چونک پڑے اور اپنے تشخص اور احیائے ملّی کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ یہ بھی درست کہ فکر و فن کی دنیا میں عام طور پر پرانے سکے ہی چلتے رہے۔ قبولِ عام داغؔ اور امیر کی شاعری ہی کو حاصل رہا۔ اقبالؔ کو بھی اپنے شعورِ تخلیق کی رہنمائی کی غرض سے جب ایک ایسے مسلم استاد کی ضرورت محسوس ہوئی جو نہ صرف اردو محاورے بلکہ اردو کی شعری روایت سے بھی بخوبی واقف ہو تو ان کی نظرِ انتخاب بھی داغؔ دہلوی ہی پر پڑی۔ داغؔ کا کلام شعری روایات کا عظیم سرمایہ تھا اقبالؔ نے انہی دہلوی اثرات کو ۱۹۰۵ء تک کے کلام میں اپنائے رکھا لیکن بعد ازاں بقول سید عابد علی عابد:

''اقبالؔ نے گہری نظر سے اس سرمائے کے امکانات کو ٹٹولا اور پھر جو علامتیں موزوں معلوم ہوئیں وہ انہوں نے اپنے کلام میں اس طرح استعمال کیں کہ ان کا مفہوم بالکل بدل گیا۔''[۱۶]

غالبؔ اور اقبالؔ کے مابین جو ذہنی تفاوت ہے اس کی وجوہات کا سراغ بھی دونوں فنکاروں کے سماجی و سیاسی ماحول ہی سے بہرہ مل جاتا ہے ڈاکٹر عبدالمغنی کی رائے کے مطابق:

''غالبؔ کے دور کی تہذیبی فضا انتہائی شک پرور تھی، نہ صرف سیاسی حیثیت سے غیر ملکی اقتدار مسلط ہو رہا تھا بلکہ تمام قدیم اور محبوب ثقافتی قدریں تیزی سے فنا کی طرف جا رہی تھیں۔ زمانہ عمومی طور پر نئی کروٹ لے رہا تھا، عالمِ پیر مر رہا تھا اور کائنات جواں ابھر رہی تھی۔ قدیم و جدید کی اس کشمکش میں حالات و معاملات بالکل مبہم اور غیر یقینی تھے یہاں تک کہ ماضی سے بدگمانی اور حال سے بے اطمینانی نے نہ صرف زندگی کے مستقبل بلکہ حقیقت و معنویت سے بھی ذہین و حساس انسانوں کو سخت مشکوک کر دیا تھا۔''[۱۷]

غالبؔ نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے ہنگامے کو بچشم خود دیکھا تھا۔ ان کی نظروں کے سامنے ایک تہذیب مٹ رہی تھی اور دوسری قدم جما رہی تھی۔ انگریزی راج کا باقاعدہ آغاز ہو چکا تھا اور مغربی تہذیب کے دھندلے سے نقوش برصغیر پاک و ہند کے افق پر ہویدا ہو رہے تھے۔ غالبؔ نے بنارس، لکھنؤ اور کلکتہ کے سفر و قیام کے دوران اس تہذیب کی جلوہ سامانیوں کی جھلک دیکھ لی تھی اور اس کی چمک دمک نے اُن کی نگاہوں کو خیرہ بھی کیا تھا۔ پروفیسر احتشام

حسین نے غالبؔ کے اس فکری رویے پر رائے زنی کچھ اس طور کی ہے کہ:

''غالبؔ نے وہاں (کلکتہ) جو چہل پہل دیکھی، جو عمارتیں دیکھیں، جو حسین وجمیل عورتیں دیکھیں، جو ایک نیا بنتا ہوا تمدن دیکھا اس نے ان کا دل موہ لیا۔ بنارس میں مناظرِ فطرت اور حسنِ انسانی نے ان کے جواں حسن پرست دل پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ کلکتہ نے تو تیرِ نیم کش بن کر وہ خلش پیدا کر دی کہ بعد میں بھی کلکتہ کا ذکر آتا تھا تو انہیں وہاں کے سبزہ زار ہائے معطر اور نازنین بتاں خود آراء یاد آتے اور سینے میں تیر لگتا۔ کلکتہ میں کچھ ایسی کشش تھی کہ احباب کی دوری کا غم بھی مٹتا ہوا معلوم ہوتا تھا،،[۱۸]

غالبؔ کی عظمت اور عصری تقاضوں سے واقفیت اس میں ہے کہ انہوں نے ترقی کی علامتوں اور سائنس کے امکانات کو اپنے دائرہ تخیل میں جگہ دی۔ سرسید اور اُن کے رفقاء کی طرح وہ بھی مغل سلطنت اور مغلیہ تہذیب کے زوال کو ذہنی طور قبول کر چکے تھے۔ وہ اپنے دور سے ناآسودہ بھی تھے۔ اور نئی تبدیلیوں کا خیر مقدم بھی کرتے تھے۔ وہ نہ صرف انگریزی راج کے ساتھ مصالحت چاہتے تھے بلکہ دورِ جدید کی سائنسی ایجادات اور ترقیات کو بہ نظرِ تحسین بھی دیکھ رہے تھے یہی وجہ ہے کہ جب سرسید نے ''آئینِ اکبری'' کی تصحیح کے بعد غالبؔ سے تقریظ لکھوانا چاہی تو غالبؔ نے ''آئین اکبری'' کے مقابلے میں انگریزوں کے شیوہ و انداز، ہنرمندی و دانشمندی اور اصول و آئین کی بے حد تعریف کی۔ فرماتے ہیں۔

صاحبانِ انگلستان را نگر
شیوہ و انداز اینان را نگر
زیں ہنر مندان ہنر بیشی گرفت
سعی بر پیشیان پیشی گرفت
حق این قوم ست ''آئین'' داشتن
کس نیارد ملک بہ زیں داشتن
داد و دانش را بہم پیوستہ اند
ھند را صد گونہ آئیں بستہ اند [۱۹]

اِس مثنوی میں غالبؔ یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ جب نئی زندگی کی برکتوں سے فیض یاب ہونے کے مواقع

موجود ہیں تو پھر آئین اکبری کے خرمن سے خوشہ چینی کی ضرورت ہی کیا ہے۔ غالبؔ اپنی مشرقی تہذیب کے دل دادہ بھی تھے۔ اُس کا رچا ہوا مزاج اور اس کی لطیف شائستگی بھی انہیں پسند تھی مگر اُن کا ذہن اس کی نارسائی سے آگاہ ہو چکا تھا۔ مغربی تہذیب کی ظاہری چمک دمک کا بھی آغاز ہی ہوا چاہتا تھا اِس لئے وہ ابھی دلوں کو متاثر اور نگاہوں کو خیرہ کر رہی تھی شاید اسی لئے غالبؔ کے آئینہ ادراک میں مستقبل کی تعمیری صورت پوری طرح جلوہ گر نہیں ہونے پائی تھی۔

غالبؔ اور اُن کے شاگرد حالیؔ کے زمانہ تک مغرب سے متعلق کچھ نہ کچھ خوش گمانی کی گنجائش موجود تھی لیکن اقبالؔ کے عہد میں یورپ کی چیرہ دستیاں برہنہ ہو کر سامنے آ گئی تھیں اقبالؔ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ''یہ صناعی جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے'' مغربی تہذیب کے روشن چہرے سے نظریں ہٹ کر اندرونی تاریکی تک کو بھانپ چکی تھیں اُس کے عیب وثواب کھل کر سامنے آ چکے تھے۔ مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام، استحصالی ہتھکنڈے اور قوم پرستی کی اصلیت سب پر واضح ہو چکی تھی جو غالبؔ اور سرسید کے زمانے تک پردہ اخفاء میں تھی۔ غالبؔ کے مقابلے میں اقبالؔ کو یہ شرف بھی حاصل تھا کہ وہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کی غرض سے یورپ میں مقیم رہے اور وہاں رہ کر اس تہذیب کی خوفناکی کو قریب سے دیکھ پائے جو غالبؔ اِس تہذیب کی اولین جھلک دیکھ کر اندازہ نہ لگا پائے تھے۔ جبکہ اقبالؔ ایک ایسے عہد کے شاعر ہیں جب آزادی کی تحریکیں زور پکڑ چکی تھیں خود اقبالؔ ایک نئی اسلامی مملکت کے قیام کا خواب دیکھ رہے تھے اِس یقین کے ساتھ کہ انگریزی راج اب قریب الاختتام ہے۔

ان بدلے ہوئے حالات میں ہمارا شعر وادب ایک ایسی زبان کا متقاضی تھا جو فکر و فلسفہ کی متحمل ہو سکے۔ اِس اہم تقاضے کو اقبالؔ سے پہلے غالبؔ محسوس کر چکے تھے اور اُن کی شاعری نے اور بعد میں آنے والے شعراء بالخصوص اقبالؔ کے لئے بہت سے مرحلے آسان کر دیے تھے۔ غالبؔ صحیح معنوں میں اقبالؔ کے پیشرو اور روحانی پیشوا ہیں۔ غالبؔ ہی کی فکر رسا کی راہنمائی میں اقبالؔ نے شعر وادب کو اوجِ ثریا تک پہنچا دیا بلاشبہ اُردو کے تمام شعرا میں صرف غالبؔ ہی اقبالؔ کی رہنمائی فرما سکے۔ اُستادِ محترم ڈاکٹر سید عبداللہ کی یہ رائے بڑی باوزن ہے کہ

> ''اقبالؔ نے جن ادبی روایات میں تربیت پائی وہ غالبؔ کے زمانے کی پروردہ تھیں۔۔۔۔ اقبالؔ کو غالبؔ کی شاعری میں معنی کے بڑے بڑے طلسمات نظر آئے۔ اِس کا اظہار اُن کی نظم ''مرزا غالبؔ'' سے ہوتا ہے۔ جس کے ہر ہر شعر سے اقبالؔ کی غالبؔ شناسی اور غالبؔ پسندی کا واضح ثبوت مہیا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اقبالؔ کے دل میں غالبؔ کی عزت کسی رسمِ عام یا روشِ عام کی بنا پر نہ تھی بلکہ اس

سبب سے تھی کہ انہیں غالبؔ کی شاعری میں ایک ایسا بڑا فنکار نظر آیا جس کے فن کے بعض پہلو خود اُن کے اپنے رجحانات کے ہمرنگ تھے۔ انہیں مرزا غالبؔ کے فن اور شخصیت میں اپنی ہی جھلک نظر آئی۔۔۔۔۔"[۲۰]

حوالہ جات

۱۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، تنقیدی شذرات ومقالات (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء) صفحہ ۳۲۰

۲۔ غالبؔ ، کلیات غالبؔ فارسی، جلد سوم، صفحہ ۲۶۹

۳۔ غالبؔ ، دیوان غالب جدید المعروف بہ نسخہ حمیدیہ مع مقدمہ دیوان ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، مرتب محمد انوارالحق (آگرہ: مفید عام اسٹیم پریس، س۔ن) صفحہ ۳۲۷

۴۔ حالیؔ ، مولانا الطاف حسین، یادگارِ غالبؔ، (لاہور: ناصر باقر پرنٹرز، س۔ن) صفحہ ۲۱

۵۔ ایضاً، صفحہ ۱۸

۶۔ اقبالؔ زبورِ عجم، کلیات اقبالؔ اُردو، صفحہ ۵۴۹/۵۴۸

۷۔ اقبالؔ، بانگِ درا، کلیاتِ اقبالؔ اُردو صفحہ ۹۷

۸۔ غالبؔ، دیوان غالبؔ جدید، صفحہ ۱۱۰

۹۔ غالبؔ، کلیاتِ غالبؔ فارسی، جلد اول صفحہ ۱۶۱

۱۰۔ وزیر آغا، ڈاکٹر غالبؔ کی شخصیت، از احوال ونقدِ غالبؔ، مرتبہ محمد حیات خان سیال، (لاہور: الائیڈ بک سینٹر، ۲۰۰۳ء) صفحہ ۲۲۶

۱۱۔ محمد اکرام، ڈاکٹر شیخ، حکیم فرزانہ (لاہور: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، اشاعت دوم، ۱۹۷۷ء) صفحہ ۱۶۸

۱۲۔ غالبؔ، کلیاتِ غالبؔ فارسی، جلد سوم، صفحہ ۳۳۵

۱۳۔ آل احمد سرور، غالبؔ کا ذہنی ارتقاء، از احوال ونقدِ غالبؔ مرتبہ محمد حیات خان سیال (لاہور: الائیڈ بک سینٹر ۲۰۰۳ء) صفحہ ۴۷۱

۱۴۔ غالبؔ، کلیات غالبؔ فارسی، جلد سوم، صفحہ ۱۵

۱۵۔ حالیؔ، یادگارِ غالبؔ، صفحہ ۱۲۴، ۱۲۵

۱۶۔ عابد علی عابد، سید، شعرِ اقبالؔ، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء) صفحہ ۵۰

۱۷۔ عبدالمغنی، ڈاکٹر، اقبالؔ اور غالبؔ بشمولہ اقبالؔ اور مشاہیر، مرتب طاہر تونسوی (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۸ء) صفحہ ۸۰

۱۸۔ احتشام حسین، ڈاکٹر، غالبؔ ایک شاعر ایک اداکار (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء) صفحہ ۲۳

۱۹۔ غالبؔ، کلیات غالبؔ فارسی، جلد اول، صفحہ ۳۱۵۔ ۳۱۶

۲۰۔ عبداللہ، ڈاکٹر، سید، مسائل اِقبال، صفحہ ۱۱۴

باب سوم

غالبؔ اور اقبالؔ کے مشترک موضوعات

غالبؔ اور اقبالؔ کے مشترک موضوعات

یوں تو ہر بڑے شاعر کا اپنا منفرد رنگ اور لب ولہجہ ہوتا ہے، افکار کی خودساختہ دنیا ہوتی ہے، تخیل کی رسائی کے امکانات بھی اپنے ہی پیدا کردہ ہوتے ہیں لیکن پھر بھی کچھ ایسے اشعار اور افکار وخیالات ضرور مل جاتے ہیں جن میں کسی دوسرے شاعر سے فکری مطابقت اور ہم آہنگی کا سراغ مل جاتا ہے۔ یہی معاملہ غالبؔ اور اقبالؔ کے افکار ونظریات کا بھی ہے۔

غالبؔ اور اقبالؔ کے اندازِ فکر ونظر اور اندازِ بیان میں بظاہر قابلِ ذکر یکسانیت نظر نہیں آتی اور دونوں شعراء کے فکر وفن کو ایک دوسرے کے مقابل رکھ کر موازنہ کرنا اور تقابلی جائزہ لینا ممکن نظر نہیں آتا لیکن جب فکرِ اقبالؔ کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو قدم قدم پر یہ احساس ہوتا ہے کہ شاید یہ خیال پہلے بھی کہیں نظر سے گزر چکا ہے۔ اشتراک اور مشابہت ڈھونڈنے نکلیں تو سرا اکثر ''دیوانِ غالبؔ'' ہی میں جا کر ملتا ہے جہاں شعری تناظر مختلف ہوتے ہوئے بھی دونوں شعراء کے ذہنی فاصلے قربتوں میں سمٹتے نظر آجاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مدیرِ مخزن سر شیخ عبدالقادر سے لے کر دورِ حاضر تک تمام بڑے بڑے ناقدین نے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ غالبؔ ہی پیشروِ اقبالؔ تھے اور اگر غالبؔ نہ ہوتے تو اقبالؔ بھی نہ ہوتے۔

غالبؔ اور اقبالؔ کی تخلیقی بصیرتوں، طبیعتوں اور افکار وخیالات میں گہری مطابقت ومشابہت نظر آتی ہے جو اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ اقبالؔ، غالبؔ سے متاثر بھی تھے ان کے معترف بھی تھے اور مقلّد بھی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے تحقیقی مضمون ''غالبؔ...... پیشروِ اقبالؔ'' میں تحریر فرمایا ہے کہ:

> ''اقبالؔ کے دل میں غالبؔ کے افکار کی عزت کسی رسمِ عام یا روشِ عام کی بنا پر نہ تھی بلکہ اس سبب سے تھی کہ انہیں غالبؔ کی شاعری میں ایک ایسا بڑا افنکار نظر آیا جس کے فن کے بعض پہلو خود ان کے اپنے رجحانات کے ہمرنگ تھے۔ انہیں مرزا غالبؔ کی شخصیت اور ان کے فن میں اپنی ہی جھلک نظر آئی۔''[1]

ڈاکٹر سید عبداللہ کی رائے میں غالبؔ اور اقبالؔ دونوں کے یہاں عقلی نظریات اور جذبات وتاثرات کی خلط ملط صورتیں موجود ہیں فرق یہ ہے کہ اقبالؔ نے افکار ہی کو جذبے کی سطح پر لا کر ان کی خشک اور سرد فکریت کو کم کرنے کی کوشش کی ہے اقبالؔ کی شاعرانہ فطرت اور حکیمانہ طبیعت میں کچھ اس طرح کا امتزاج پیدا ہو گیا ہے کہ ان کے افکار

جذبات اور جذبات افکار معلوم ہوتے ہیں جب کہ غالبؔ کی فطرت شاعرانہ زیادہ اور حکیمانہ کم تھی پھر بھی وہ تعقل و تفکر پر گہرا اعتقاد رکھتے تھے لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ اقبالؔ جن کی شاعری میں ایک مربوط عقلی نظام موجود ہے خود اپنی دعوت کے اعتبار سے ''عقل'' کی کارفرمائی کے منکر اور جذبے کے معتقد ہیں یعنی:

اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومیؔ کبھی پیچ و تابِ رازیؔ [۲]

اور اکثر اس مصافِ عقل و دل میں بقول اقبالؔ

ع جیتا ہے رومیؔ ہارا ہے رازیؔ [۳]

اقبالؔ اکثر عقل و خرد سے بیزار ہو کر وجدان کی طرف رجوع کرتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ:

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر [۴]

ڈاکٹر سید عبداللہ کی رائے میں اقبالؔ کے مقابلے میں غالبؔ کے عقلی نظریات کی حیثیت بھی زیادہ سے زیادہ جذباتی ہے پھر بھی غالبؔ خود کو عقل و خرد کا بہت بڑا علمبردار کہتے ہیں انہوں نے اپنے اردو اور فارسی کلام میں اندیشہ، عقل، خرد، دانش اور آگاہی کی اصطلاحیں جا بجا استعمال کی ہیں۔ ان کے خیال میں عقل میں بھی مستی اور نشے کی سی کیفیت ہوتی ہے۔ عقل سے بصیرت پیدا ہوتی ہے اور عقل نفس کی اصلاح و تہذیب بھی کرتی ہے۔

بہ مستی خرد رہنمائے خود است
رود گر زخود ہم بجائے خود است
ازیں بادہ ہر کس کہ سر مست شُد
با فشاندنِ گنج تر دست شُد

یا

سخن گرچہ پیغام راز آورد
سرود ارچہ در اہتزاز آورد

خرد و انداں گوہریں در کشاد
زمغزِ سخن گنجِ گوہر کشاد [۵]

غالبؔ نے اقبالؔ سے پیشتر شاعری میں تعقل کی اہمیت کو سمجھا۔اسی لئے ان کی شاعری کی فکری سطح بلند ہے۔ غالبؔ سے صحیح معنوں میں اگر کسی نے فیضان حاصل کیا ہے تو وہ اقبالؔ ہی ہیں جنہوں نے غالبؔ کی قائم کردہ روایت کو نہ صرف نبھایا بلکہ اسے اُس اوج کمال تک لے گئے جہاں تک ان کے بعد کوئی جدید شاعر اس کی فکری سطح کو مزید بلندی عطا نہ کرسکا۔ڈاکٹر سید عبداللہ کے خیال میں اقبالؔ کی نظر میں غالبؔ کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ غالبؔ ایک تہذیب کا نمائندہ اور ایک عظیم فکری اور ادبی روایت کا آخری وارث اور ترجمان تھا جس کے بعد جہاں آباد یعنی دہلی کے بام و درنالۂ خاموش بن گئے۔غالبؔ ان تہذیبی اور فکری قدروں کے شناسا تھے جن کی معیار شناسی خود اقبالؔ کے فن کا امتیازِ خاص ہے۔گویا اقبالؔ کی نظر میں غالبؔ ایک ایسا شاعر ہے جو ان سے پہلے ہی ان راستوں اور شاہراہوں کا سراغ لگا چکا تھا جن پر چلنا خود اقبالؔ نے اپنے لئے پسند فرمایا۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے دونوں شعراء کے مشترک خصائص کی فہرست درج ذیل پانچ نکات کی صورت میں پیش کی ہے۔

۱۔ برجستہ اور جوش انگیز اسلوب
۲۔ ارتقائے حیات کے لئے سخت کوشی اور خارا شگافی کا سبق جسے اقبالؔ کی اصطلاح میں ''ستیز'' کہا جا سکتا ہے۔
۳۔ جذبہ و تفکر کا اجتماع
۴۔ جنون اور آشفتگی کا ایک خاص انداز
۵۔ خود کا شعور [۶]

غالبؔ اور اقبالؔ کے مابین فکری ہم آہنگی کا سراغ ہمیں ان اشعار کی صورت میں ملتا ہے جہاں خیالات تو یکساں ہیں لیکن اندازِ بیان مختلف، تخیل میں یکسانیت ہے مگر تاثر الگ، فکر میں مشابہت ہے لیکن پیشکش کا انداز جدا ہے۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ مختلف افکار و خیالات کی خشتِ اول غالبؔ ہی نے رکھی جس پر اقبالؔ نے دیکھتے ہی دیکھتے فلک بوس عمارت تعمیر کر ڈالی۔دونوں شعراء کے فکری اشتراک کو سمجھنے کے لئے درج ذیل امثال ملاحظہ کیجئے۔

غالبؔ نفسیات انسانی کے بہت بڑے نباض تھے انہیں اس حقیقت کا بخوبی علم تھا کہ جب کسی رنج ومحن کا حد سے زیادہ سامنا ہو تو وہ عادت ثانیہ بن جاتی ہے یہاں تک کہ اس رنج کا احساس ہی مٹ جاتا ہے یعنی

ع درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا ۷

غالبؔ اپنی ذات کے حوالے سے یہ حقیقت واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مجھ پر اس قدر آفات ٹوٹیں کہ اب کوئی مشکل میرے لئے مشکل نہیں رہی۔ یعنی

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں ۸

اس حقیقت کو اقبالؔ اپنے مخصوص پیامیہ انداز میں پیش کرتے ہیں اور افرادِ ملت کو مشکلات سہنے کا قرینہ سکھاتے ہوئے کہتے ہیں:

تمنا آبرو کی ہو اگر گلزار ہستی میں
تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خُو کر لے ۹

غالبؔ اور اقبالؔ کو مجتہد عصر ہونے کا شرف حاصل تھا۔ دونوں شعراء نے جدت، تازگی، قوتِ تخلیق و ایجاد اور غور وفکر کی عادت کو سراہا اور زندگی کے مسائل کو حل کرنے کے لئے کورانہ تقلید کی مذمت دونوں شعراء نے اپنے اپنے انداز میں کی ہے۔ غالبؔ کہتے ہیں:

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے ۱۰

جب کہ اقبالؔ کی نصیحت ہے کہ:

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستہ بھی ڈھونڈ، خضر کا سودا بھی چھوڑ دے ۱۱

غالبؔ اور اقبالؔ دونوں اپنے اپنے پُرلطف انداز میں اللہ تعالیٰ سے شکوہ سنج نظر آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دونوں جہان بخشے۔ دنیوی زندگی کی نعمتیں اور اُخروی زندگی کی شادکامیاں بخشیں لیکن بندہ اس سے کہیں زیادہ کا طلب گار تھا۔ اس کی خاموشی قناعت کے سبب سے نہیں ہے بلکہ شرما شرمی چپ سادھ لی کہ اب عطا کرنے والے سے

خواہ مخواہ کیا تکرار کی جائے یعنی بقول غالبؔ

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں ۱۲؎

جب کہ اقبالؔ شکوہ سنج ہیں کہ:

تیری خدائی سے ہے، میرے جنون کو گلہ
اپنے لئے لا مکاں، میرے لئے چار سُو؟ ۱۳؎

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات اور زمین پر اپنا نائب بنا کر بھیجا لیکن افسوس کہ اس دنیا میں آ کر انسان ذلیل ورُسوا ہو گیا انسانیت کی تذلیل پر غالبؔ خدا سے شکوہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ہیں آج کیوں ذلیل؟ کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں ۱۴؎

اقبالؔ کا شکوہ ملاحظہ کیجئے:

اِسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوال آدمِ خاکی، زیاں تیرا ہے یا میرا؟ ۱۵؎

دونوں کے خیال میں یہ دنیا بچوں کا ایک کھیل ہے۔ رات دن پیش آنیوالے حادثات کی حیثیت ایک کھیل تماشے سے زیادہ نہیں بقول غالبؔ

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے ۱۶؎

جب کہ اقبالؔ کہتے ہیں کہ:

اپنی جولاں گاہ زیرِ آسماں سمجھا تھا میں
آب وگل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں ۱۷؎

غالبؔ اور اقبالؔ دونوں کے خیال میں بندہ اسی عظیم الشان ہستی کا ایک جزو ہے ہمارا وجود اسی بحرِ بیکراں کا ایک قطرہ ہے اور ''جز'' اپنے ''کل'' میں شامل ہونے کے لئے بے قرار ہے۔ بقول غالبؔ

دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر

ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا ۱۸

اقبالؔ اِسی خیال کوادا کرتے ہیں کہ:

تو ہے محیطِ بے کراں میں ہوں ذرا سی آب جُو

یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر ۱۹

معرفت الٰہی اور عبد و معبود کے درمیان گفتگو کے لئے ''دہانِ زخم'' پیدا کرنا چاہیئے اس کیفیت کی عکاسی غالبؔ یوں کرتے ہیں:

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی

مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی ۲۰

اقبالؔ غالبؔ کی مذکورہ غزل کی زمین ہی میں اس خیال کا اعادہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی

ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی ۲۱

اگر ہم آنکھ اُٹھا کر دیکھیں تو ہر طرف محبوبِ حقیقی کے سینکڑوں جلوے بے نقاب دکھائی دے سکتے ہیں لیکن ہم میں دید کی طاقت ہی نہیں اور جب ہم اسے دیکھنے کی تاب و طاقت ہی نہیں رکھتے تو آنکھوں اور نظارہ کا احسان کیوں اُٹھائیں۔اس خیال کی ترجمانی کرتے ہوئے غالبؔ کہتے ہیں کہ:

صد جلوہ روبرو ہے، جو مژگاں اُٹھایئے

طاقت کہاں، کہ دید کا احساں اُٹھایئے ۲۲

ناکامیِ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز

تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی ۲۳

غالبؔ کی اسی بحر اور زمین کو ملحوظ رکھتے ہوئے اقبالؔ فرماتے ہیں:

ہو دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر

ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی

نظارے کو یہ جنبشِ مژگاں بھی بار ہے

نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی ۲۴

غالبؔ اور اقبالؔ دونوں کے نزدیک محبت ایک ایسا جذبہ ہے جس میں جلوت سے زیادہ خلوت اور محفل سے زیادہ تنہائی عزیز ہوتی ہے۔اس خیال کی ترجمانی کرتے ہوئے غالبؔ کہتے ہیں:

دل لگا کر، لگ گیا ان کو بھی تنہا بیٹھنا

بارے اپنے دردِ دل کی ہم نے پائی داد یاں ۲۵

اقبالؔ اس خیال سے اتفاق کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو

عجب چیز ہے لذتِ آشنائی ۲۶

دونوں شعراء کے نزدیک حسن کو ظاہری آرائشوں سے بے نیاز رہنا چاہیئے کیونکہ ان سے استغنائے فطری کو دھبہ لگتا ہے بقول غالبؔ

پوچھ مت رسوائی اندازِ استغنائے حسن

دست مرہونِ حنا، رخسار رہن غازہ تھا ۲۷

اقبالؔ، غالبؔ کی فکر سے متفق ہیں کہ حسن کی فطرت میں خود بخود مشاطگی کا انداز موجود ہوتا ہے۔

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسنِ معنی کو

کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی ۲۸

کسی بھی فنکار کا فنی شاہکار خونِ جگر کی آمیزش کے بغیر تشنہ تکمیل رہتا ہے۔بقول غالبؔ:

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ

رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے ۲۹

اقبالؔ کے خیال میں بھی ''خونِ جگر'' کی آمیزش کے بغیر سب نقش نا مکمل اور نا تمام ہیں۔

نقش ہیں سب نا تمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر ۳۰؎

اگر محبوب کا وصل عاشق کو نصیب ہو جائے تو پھر بھی وہ اسے نظر بھر کر دیکھنے کا حوصلہ اپنے اندر نہیں پاتا۔ غالبؔ اس خیال کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی ۳۱؎

اقبالؔ، غالبؔ کی ہم نوائی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

عینِ وصال میں مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا
گرچہ بہانہ جو رہی میری نگاہ بے ادب ۳۲؎

الفاظ و خیال کی مشابہت درج ذیل شعر سے بھی بخوبی عیاں ہے:

آ گہی ''دامِ شنیدن'' جس قدر چاہے بچھائے
مدّعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا ۳۳؎
غالبؔ

نہیں منّت کشِ ''تابِ شنیدن'' داستاں میری
خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری ۳۴؎
اقبالؔ

غالبؔ اور اقبالؔ دونوں مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے قائل ہیں۔ تن آسانی اور آسودگی دونوں کے مزاج کو راس نہیں اسی لئے غالبؔ کہتے ہیں:

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر ۳۵؎

یا

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یا رب!

اک آبلہ پا وادیِ پُرخار میں آوے ۳۶

اقبال اس خیال کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

علاجِ درد میں بھی درد کی لذّت پہ مرتا ہوں

جو تھے چھالوں میں کانٹے نوکِ سوزن سے نکالے ہیں ۳۷

اسی خیال کو غالب ایک جگہ یوں ادا کرتے ہیں۔

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن

غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں ۳۸

غالب اور اقبال دونوں عبادت میں خلوص کے قائل ہیں اسی لئے غالب جنت کو دوزخ میں جھونک دینا چاہتے ہیں تا کہ صلہ اور جزا سے بے نیاز ہو کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جا سکے۔

طاعت میں تا رہے نہ مے انگبیں کی لاگ

دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو ۳۹

اقبال عبادت میں ریا کاری سے منع کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے

او بے خبر! جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے ۴۰

غالب اور اقبال دونوں کے خیال میں غم ایک زبردست تخلیقی و تعمیری قوت ہے جس سے انسانی فطرت کے جوہر کھل کر سامنے آتے ہیں۔ بقول غالب

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس

برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم ۴۱

جب کہ اقبال بھی غم کو عطیۂ خداوندی اور سرمایۂ حیات قرار دیتے ہیں یعنی:

حادثاتِ غم سے ہے انساں کی فطرت کو کمال

غازہ ہے آئینۂ دل کے لئے گردِ ملال

غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطفِ خواب سے

ساز یہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے ۴۲

اقبالؔ کے فلسفۂ حیات کی اساس خودی کا تصور ہے اور خودی سے ان کی مراد اپنے نفس کو پہچاننا، اپنی صلاحیتوں پر بھروسہ کرنا اور خودداری ہے۔ اقبالؔ سے پیشتر غالبؔ بھی خودداری اور خود بینی کا درس اپنے اشعار میں جا بجا دیتے نظر آتے ہیں مثلاً:

ہنگامۂ زبونی ہمت ہے انفعال

حاصل نہ کیجیے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو ۴۳

یا

دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم

اے خانماں خراب نہ احساں اُٹھایئے ۴۴

اقبالؔ درسِ خودداری دیتے ہوئے کہتے ہیں:

عشقِ بتاں سے ہاتھ اُٹھا اپنی خودی میں ڈوب جا

نقش و نگارِ دہر میں خونِ جگر نہ کر تلف ۴۵

یا

تری زندگی اسی سے تری آبرو اسی سے

جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی ۴۶

غالبؔ تخلیق فن کے سلسلے میں ''سوزِ دروں'' اور ''دلِ گداختہ'' کی اہمیت کے قائل تھے ان کے نزدیک

حسنِ فروغِ شمع سخن دور ہے اسدؔ

پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی ۴۷

اقبالؔ بھی اس حقیقت سے بخوبی آشنا ہیں کہ جب تک قلب ونظر روشن نہ ہو شاعر اپنے فن کے حوالے سے کوئی حیات بخش اور حیات آفریں پیغام نہیں پیش کر سکتا۔

سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عینِ حیات

ہو نہ روشن تو سخن مرگِ دوام اے ساقی ۴۸؎

جستہ جستہ بکھرے ہوئے مذکورہ شعری حوالے اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ غالبؔ اور اقبالؔ کا زاویۂ نگاہ اور فکر و خیال اپنی اصل کے اعتبار سے یکساں ہے۔ غالبؔ کی ''نوائے گرم'' میں جو جذبات کارفرما تھے ان کی اہمیت و افادیت کو محسوس کرتے ہوئے نہ صرف اقبالؔ بلکہ آنے والے تمام شعرا نے اس سے مستفیض ہونے میں فخر محسوس کیا بالخصوص اقبالؔ نے غالبؔ کی پُر جلال آواز اور مردانہ لب و لہجے کو ''بانگِ درا'' اور ''نوائے جرس'' بنا کر اجتماعی مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنالیا۔

اس باب میں پیش کردہ منتشر شعری حوالوں سے قطع نظر مخصوص تصورات کے حوالے سے بھی دونوں عظیم شعراء کے مابین گہری ہم آہنگی اور فکری ربط ملاحظہ کیا جا سکتا ہے لہٰذا آنے والے ابواب میں غالبؔ اور اقبالؔ کے فکری اشتراک کا تجزیہ مختلف تصورات کے آئینے میں پیش کیا جائے گا تا کہ تحقیق کی جا سکے کہ دونوں شعراء کی تخلیقی بصیرتوں، فکری رویوں اور ذہنی بالیدگی میں کہاں تک مطابقت و مشابہت کا رنگ جھلکتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ عبداللہ، ڈاکٹر سید، مسائلِ اقبال ، صفحہ ۱۱۵

۲۔ اقبال بال جبریل، کلیات اقبال اُردو ، صفحہ ۳۰۹

۳۔ ایضاً، صفحہ ۳۶۳

۴۔ ایضاً، صفحہ ۳۷۹

۵۔ عبداللہ، ڈاکٹر، سید، مسائل اِقبال، صفحہ ۱۲۰

۶۔ ایضاً صفحہ ۱۱۶

۷۔ غالب، دیوانِ غالب جدید، صفحہ ۵۱

۸۔ ایضاً، صفحہ ۱۳۹

۹۔ اقبال، بانگِ درا، کلیات اقبال اُردو، صفحہ ۲۵۰

۱۰۔ غالب، دیوانِ غالب جدید، صفحہ ۲۴۹

۱۱۔ اقبال ، بانگِ درا، کلیات اقبال اُردو، صفحہ ۱۰۷

۱۲۔ غالب، دیوانِ غالب جدید، صفحہ ۱۳۵

۱۳۔ اقبال، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اُردو، صفحہ ۳۸۴

۱۴۔ غالب، دیوانِ غالب جدید، صفحہ ۱۳۲

۱۵۔ اقبال ، بالِ جبریل، کلیات اقبال اُردو، صفحہ ۲۹۸

۱۶۔ غالب، دیوانِ غالب جدید، صفحہ ۲۷۴

۱۷۔ اقبال، بال جبریل، کلیات اقبال اُردو، صفحہ ۳۱۰

۱۸۔ غالب، دیوانِ غالب جدید، صفحہ ۴۵

۱۹۔ اقبال، بالِ جبریل، کلیات اقبال اُردو، صفحہ ۲۹۹

۲۰۔ غالب، دیوانِ غالب جدید، صفحہ ۱۹۸

۲۱۔ اقبال ، بانگِ درا، کلیات اقبال اُردو، صفحہ ۱۰۲

۲۲۔ غالبؔ، دیوانِ جدید، صفحہ ۱۶۰

۲۳۔ ایضاً، صفحہ ۱۹۹

۲۴۔ اقبالؔ ، بانگِ درا، کلیات اقبالؔ اُردو، صفحہ ۱۰۲

۲۵۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۱۱۵

۲۶۔ اقبالؔ ، بالِ جبریل، کلیات اقبالؔ اُردو، صفحہ ۳۹۷

۲۷۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۱۳

۲۸۔ اقبالؔ ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۳۰۶

۲۹۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۲۸۳

۳۰۔ اقبالؔ، بال جبریل، کلیات اقبالؔ اُردو۔ صفحہ ۳۹۳

۳۱ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۲۴۸

۳۲۔ اقبالؔ بال جبریل، کلیات اقبالؔ اُردو، صفحہ ۴۰۶

۳۳۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ا

۳۴۔ اقبالؔ، بانگِ درا، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۶۸

۳۵۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید۔ صفحہ ۷۶

۳۶۔ ایضاً، صفحہ ۲۶۱

۳۷۔ اقبالؔ، بانگِ درا، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۱۰۱

۳۸۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید۔ صفحہ ۱۲۹

۳۹۔ ایضاً صفحہ ۱۴۷

۴۰۔ اقبالؔ، بانگِ درا ، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۱۰۸

۴۱۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۱۰۴

۴۲۔ اقبالؔ، بانگِ درا، کلیات اقبالؔ اُردو، صفحہ ۱۵۵

۴۳۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۱۴۸

۴۴۔ ایضاً، صفحہ ۱۶۰

۴۵۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۳۳۱

۴۶۔ ایضاً، صفحہ ۳۳۷

۴۷۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۱۹۸

۴۸۔ اقبالؔ، بال، جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۳۰۴

غالبؔ اور اقبالؔ کا تصورِ خودی

غالبؔ اور اقبالؔ کا تصورِ خودی

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی [1]

نہ صہبا ہوں، نہ ساقی ہوں، نہ مستی ہوں، نہ پیمانہ
میں اس میخانۂ ہستی میں ہر شے کی حقیقت ہوں [2]

غالبؔ اور اقبالؔ دونوں کے نظامِ فکر میں خودشناسی، خوداعتمادی، خودنگری، انانیت، خودبینی اور اپنی ذات پر بھروسہ رکھنے کے موضوعات مشترکہ طور پر موجود ہیں بلکہ علامہ اقبالؔ کے فکر ونظر کے جملہ مباحث کا محور اور مرکز یہی بنیادی نکتہ اور خیال ہے۔ غالبؔ احساسِ خودی سے اس حد تک سرشار تھے کہ اپنی شاعرانہ عظمت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ دیگر شعراء تو شعوری کوشش سے خود شعر تخلیق کرتے ہیں اور شعر تک رسائی حاصل کرتے ہیں لیکن میرا معاملہ الگ ہے کیونکہ خود فنِ شعر کوشش کر کے مجھ تک رسائی حاصل کرتا اور پہنچتا ہے۔

ما نہ بودیم بدیں مرتبہ راضی غالبؔ
شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فنِ ما [3]

دونوں شعراء نے زندگی میں خودی کو پانے اور اس کی تربیت اور نشوونما کی ضرورت پر زور دیا ہے زندگی میں پیش آنے والی مشکلات پر قابو پانا، خود کو مستحکم کرنا اور معرفتِ ہستی کا دوسرا نام خودی ہے۔ اگر انسان احساسِ کمتری کا شکار نہ ہو اور اپنی حقیقت سے آگاہ ہو اور اسے اپنے زورِ بازو پر مکمل بھروسہ ہو تو اس کے اندر ترقی کرنے اور ایک بے پناہ قوت بن جانے کے لامحدود امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔

خودی اقبالؔ کے تمام فکر وفلسفہ کا نچوڑ اور جگر کاویوں کا حاصل ہے اس خیال کی عالمانہ تشریح اور فلسفیانہ توضیح خواہ کچھ ہی ہو لیکن اس کا سیدھا سادا مفہوم خودداری اور خوداعتمادی ہی ہے جو غالبؔ مرزا کی شخصیت کا بھی سب سے زیادہ نمایاں پہلو ہے لہذا تصورِ خودی کے بارے میں اولین اشارے ہمیں کلامِ غالبؔ میں بھی جا بجا بکھرے نظر آ جاتے ہیں مثلاً جب وہ یہ کہتے ہیں۔

ہنگامۂ زبونیِ ہمت ہے، انفعال
حاصل نہ کیجئے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو ۴

غالبؔ کے خیال میں کسی غیر کا احسان مند ہونا پست ہمتی کی دلیل ہے کیونکہ احسان شرمندگی کا باعث ہے اور شرمندگی ہمت اور حوصلے کی شکست۔ اس لئے زمانے سے کچھ حاصل کرنا گویا اس کا احسان لینا ہے اس لئے زمانے سے اور کچھ تو دور کی بات، عبرت بھی حاصل کرنا خوددار لوگوں کو زیب نہیں دیتا۔

''اسرارِ خودی'' سے بہت پہلے اقبالؔ نظم ''شمع و شاعر'' (۱۹۱۲) کے ایک بند میں مذکورہ خیال بڑے بلیغ انداز میں پیش کرتے ہیں اور خود اعتمادی کی تعلیم دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر انسان اپنے آپ کو ہیچ مقدار سمجھنا چھوڑ دیں اور دوسروں کا احسان مند اور دست نگر بن کر رہنے کی بجائے خود اپنی قوتوں اور صلاحیتوں پر بھروسہ رکھیں تو ان کی منزل بآسانی انہیں مل سکتی ہے۔

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں! ذرا
دانہ تو، کھیتی بھی تُو، باراں بھی تُو، حاصل بھی تُو

آہ کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے
راہ تو، رہرو بھی تو، رہبر بھی تو، منزل بھی تو

وائے نادانی! کہ تو محتاجِ ساقی ہو گیا
مے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو، محفل بھی تو ۵

انگلستان جانے سے پہلے لکھی جانے والی نظم ''تصویرِ درد'' کے بعض اشعار میں بھی نظریۂ خودی کے اولین آثار ملتے ہیں جن میں اقبالؔ اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ انسان اپنی تکمیل کے لئے خارج کا محتاج نہیں بلکہ خود اپنا مرکز و محور ہے۔

نظر میری نہیں ممنونِ سیرِ عرصۂ ہستی
میں وہ چھوٹی سی دنیا ہوں کہ آپ اپنی ولایت ہوں ۶

قیامِ انگلستان کے زمانے کی ایک نظم ''پیامِ عشق'' میں درسِ خودداری دیتے ہوئے کہتے ہیں:

نہیں ہے وابستہ زیرِ گردوں کمال شانِ سکندری سے

تمام ساماں ہے تیرے سینے میں، تُو بھی آئینہ ساز ہو جا ے

تصورِ خودی تک اقبالؔ کی رسائی ذات و کائنات کے بارے میں بعض اہم سوالوں کے جوابات کی تلاش سے ہوئی یعنی انسان کیا ہے؟ انسانی زندگی کیا ہے؟ کائنات اور اس کی اصل کیا ہے؟ کیا یہ محض فریبِ نظر ہے یا کچھ اور؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جوابات کی جستجو میں انسان مدتوں سے سرگرداں رہا ہے۔ قدیم یونانیوں نے اس کا جواب یہ دیا تھا کہ کائنات یا انسان کا وجود محض دھوکا ہے۔ یونانیوں سے متاثر ہو کر خصوصاً افلاطون کے خیالات کے زیرِ اثر مشرق و مغرب کے حکماء اور صوفیاء کا مسلک بھی ایک مدت تک یہی رہا۔ یہ فلسفہ چونکہ زوال آمادہ اور کمزور قوموں کو مایوسی اور شکست خوردگی کے کرب سے نجات دلاتا تھا اس لئے انہوں نے اسے بآسانی قبول کر لیا۔ مسلمانوں نے بھی اپنے زوال اور سیاسی اور معاشرتی بحران کے زمانے میں عملی زندگی سے کنارہ کشی کی خاطر اسے اپنا لیا۔ نفیِ ذات یعنی کائنات اور اپنے وجود سے انکار کا یہ فلسفہ اقبالؔ کے لئے قطعاً قابل قبول نہ تھا وہ یہ ماننے کے لئے بالکل تیار نہ تھے کہ میرا وجود محض وہم و گمان ہے اگر ایسا ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ میرے اندر وہ کون ہے جو مجھے اپنے وجود کے انکار کا احساس دلا رہا ہے۔

یہ احساس اس امر کا بدیہی ثبوت ہے کہ میں موجود ہوں اور میری روح یا میری انا یا میری خودی ساری کائنات سے زیادہ یقینی اور قطعی ہے۔ اس طرح کے سوالات جن سے انسان کے وجود کا اثبات ہوتا ہے اردو شاعری میں اقبالؔ سے پہلے غالبؔ نے بھی اٹھائے تھے۔

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود

پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں

غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے؟
نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے؟

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟
ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے؟ ۸

غالبؔ نے وجدانی طور پر جو محسوس کیا اس کا اظہار اشعار کے پیرائے میں بیان کر دیا ہے جب کہ اقبالؔ نے ان سوالوں کے جواب میں دلائل اور براہین سے کام لیا ہے اور اسے ایک مستقل فلسفۂ حیات میں ڈھال کر پیش کرتے ہیں۔ اقبالؔ نے اس کا مفہوم اس حدیث سے اخذ کیا ہے

من عرف نفسہ فقد عرف ربہ

(جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا)۔

اقبالؔ نے خودی کی ماہیت کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کے مطابق خودی احساسِ نفس اور تعینِ ذات کا نام ہے۔ خودی کا مرکز خود شخصیت ہے جس کو کشاکش کے ذریعے برابر تقویت ملتی ہے۔ یہ شعور کا وہ روشن نکتہ ہے جس سے تمام انسانی تخیلات و جذبات مستنیر ہوتے ہیں۔ خودی فطرتِ انسانی کی منتشر اور غیر محدود قوتوں کی شیرزاہ بندی کرتی ہے۔ ۹

اقبالؔ کے یہاں خودی کا لفظ غرور و تکبر کے مروجہ معنوں میں استعمال نہیں ہوا بقول ڈاکٹر فرمان فتحپوری:

''خودی اقبالؔ کے نزدیک نام ہے احساسِ غیرت مندی کا، جذبۂ خودداری کا، اپنی ذات و صفات کے پاس و احساس کا، اپنی انا کو جراحت و شکست سے محفوظ رکھنے کا، حرکت و توانائی کو زندگی کا ضامن سمجھنے کا، مظاہرات فطرت سے برسرِ پیکار رہنے کا اور دوسروں کا سہارا تلاش کرنے کی بجائے اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کا، یوں سمجھ لیجئے کہ اقبالؔ کے نقطۂ نظر سے ''خودی'' زندگی کا آغاز، وسط اور انجام سبھی کچھ ہے۔۔۔۔۔۔'' ۔۱۰

مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ کیجئے۔

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے [11]

خودی ایک لامحدود سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں ہے

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں
تو آبجو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں [12]

خودی سے متصف یعنی خوددار شخص ابدی حیات کا مالک ہوتا ہے۔

ہو اگر خود نگر و خود گرو خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے [13]

اقبالؔ کے مقابلے میں غالبؔ کے ہاں اس تصور کی فلسفیانہ موشگافیاں تو نہیں ملتیں غالبؔ کی خودداری کا دائرہ بھی بظاہر محدود ہے پھر بھی کئی جگہ خیالات میں یکسانیت ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ بجا طور پر فرماتے ہیں کہ:

''اگر چہ غالبؔ کی خودی اور بے خودی اور اقبالؔ کی خودی اور بے خودی کے مفہوم میں دائرۂ اثر کے اعتبار سے خاصا فرق ہے، پھر بھی ان کے ڈانڈے کئی جگہ باہم مل جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح حقیقت اور مجاز میں معناً واضح فرق ہو بھی تب بھی ان کے کئی رخ ہم شکل ہوتے ہیں۔۔۔غالبؔ کے یہاں جو شدید احساس اِنا ہے اس کے پیرایہ ہائے اظہار بڑی آسانی سے اقبالؔ کے شعورِ انا کے ترجمان بن سکتے ہیں اگر چہ عملی تشریح و تعبیر میں جدا ہی کیوں نہ ہوں۔'' [14]

یوں تو غالبؔ کی انا اور اقبالؔ کی خودی کی علمی و فکری سطح مختلف نوعیت کی ہے لیکن ان دونوں شعراء کے افکار کے پسِ پردہ جو شخصی احساس اور نفسی رجحان کارفرما ہے اس میں گہرا ربط نظر آتا ہے۔ یہ درست ہے کہ غالبؔ کی انا یا شعورِ خودکا دائرہ محدود اور شخصی نوعیت کا ہے لیکن اس شخصی انا کا دائرۂ اثر بھی بڑی وسعت کا حامل ہے۔ مثلاً جب وہ یہ کہتے ہیں کہ:

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا [15]

تو ان کی مراد ذاتِ واحد نہیں بلکہ وہ تمام نوع کی ترجمانی کر رہے ہیں۔

مقاصد آفرینی:

خودی کی بیداری میں اقبال مقاصد کو سب سے مقدم رکھتے ہیں خودی تخلیقِ مقاصد سے زندہ اور بیدار ہوتی ہے انسان اپنی ذات کے اثبات اور تکمیل کے لئے ضروری سمجھتا ہے کہ نئے نئے مقاصد تخلیق کرتا رہے۔ اقبال نے مقصد اور نصب العین کے معنوں میں مدعا، جستجو، آرزو، تمنا، سوزِ آرزو، داغِ آرزو، چراغِ آرزو اور ذوقِ طلب وغیرہ الفاظ و تراکیب استعمال کی ہیں۔ مقاصد کی لگن انسان کو خطرات سے بے نیاز اور مشکلات سے بے پرواہ کر دیتی ہے۔ ''ذوقِ طلب'' اور ''سوزِ آرزو'' کی بدولت زندگی کا قافلہ آگے بڑھتا ہے۔ زندگی میں مقاصد کی اہمیت کو اقبال نے بہت پہلے جان لیا تھا مثلاً ''طلبۂ علی گڑھ کے نام'' کا یہ شعر ملاحظہ ہو

موت ہے عیشِ جاوداں، ذوقِ طلب اگر نہ ہو
گردشِ آدمی ہے اور، گردشِ جام اور ہے [16]

مقاصد کے ذریعے انسان سعی و عمل پر آمادہ ہوتا ہے اور اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہے کیونکہ حقائق کی دنیا خودی کی منزل اولین ہے طلسمِ زمان و مکان کو توڑ کر جب وہ آگے بڑھتی ہے تو ضمیرِ وجود میں اس کو بے شمار نئے عالم آشکارا نظر آتے ہیں۔

خودی کی یہ ہے منزلِ اولیں
مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر
طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود
کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود

ہر اک منتظر تیری یلغار کا

تری شوخیِ فکر و کردار کا ۱۷

اقبالؔ کے نزدیک زندگی کی اصل آرزو میں پوشیدہ ہے۔ آرزو عالم رنگ و بو کی جان ہے۔ ترقی کے سارے سامان اور ارتقاد کے تمام اسباب، آرزو اور تمنا ہی کی بدولت معرضِ وجود میں آتے ہیں۔ جو شخص اپنی ذات کی تکمیل اور خودی کی تعمیر کا خواہاں ہو اُس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اپنے آپ کو کسی نہایت بلند مقصد سے آشنا کرے۔

زندگی در جستجو پوشیدہ است

اصل او در آرزو پوشیدہ است

آرزو جانِ جہانِ رنگ و بوست

فطرتِ ہر شے امینِ آرزو ست ۱۸

یا

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم

از شعاعِ آرزو تابندہ ایم ۱۹

آرزو ہی کی بدولت اقبالؔ انسان کو کائنات کے نظام میں ایک بے بس اور منفعل ہستی تسلیم نہیں کرتے۔ اس لئے وہ کسی قیمت پر اس کا سودا کرنے کو تیار نہیں۔

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی

مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی ۲۰

اقبالؔ کی طرح غالبؔ کے نزدیک بھی عمل کی محرک انسانی تمنا اور آرزو ہے۔ ذوق و شوق، تمنا، دائمی اضطراب اور آرزو مندی غالبؔ کے بھی مرغوب مضامین نظر آتے ہیں۔ غالبؔ کے نزدیک بھی آرزو کی کوئی منزل اور آخری حد مقرر نہیں اسی لئے کہتے ہیں۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب

ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا ۲۱

ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے

میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے ۲۲

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا

وا ماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں ۲۳

غالبؔ کے نزدیک انسانی تمناؤں کا پورا نہ ہونا بھی اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ہم حسنِ لامحدود کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ لازم نہیں کہ اس سفر میں ہم اپنی حقیقی اور آخری منزل کو پاسکیں کیونکہ آرزومندی کے لئے منزل سے بے نیازی لازمی ہے۔

ہوں میں بھی تماشائیِ نیرنگِ تمنا

مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے ۲۴

غالبؔ اور اقبالؔ دونوں کے نزدیک آرزومندی بے نتیجہ رہے تو بہتر ہے اسی لئے غالبؔ نیرنگِ تمنا کا تماشا کرنے میں لطف محسوس کرتے ہیں جب کہ اقبالؔ فرماتے ہیں۔

تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری

مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے ۲۵

لحد میں بھی یہی غیب و حضور اتنہا ہے

اگر ہو زندہ تو دل نا صبور رہتا ہے ۲۶

غالبؔ کے نزدیک موت بھی دامِ تمنا میں ایک کمزور اور بیمار شکار کی حیثیت رکھتی ہے۔

خیالِ مرگ کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے

مرے دامِ تمنا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی ۲۷

غالبؔ کو دائمی ناامیدی اور حسرت منظور ہے لیکن یہ منظور نہیں کہ ان کا نالہ تاثیر کا منت پذیر ہو۔ ان کی انا اور خود

داری آنسو بہا کر مقصد براری کو اپنے لئے توہین خیال کرتی ہے۔

رنجِ نو میدیِ جاوید گوارا رہیو

خوش ہوں گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں ۲۸

تمنا کی آزادی کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ خوب سے خوب تر کی تلاش کے سفر میں پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتی اس صحرانوردی میں خواہ کتنی صعوبتیں پیش آئیں ذوق جستجو میں کمتری نہیں آنے پاتی بلکہ سمندر کی موجیں آگے ہی آگے اٹھتی اور بڑھتی ہیں اسی طرح قدم بلکہ نقشِ قدم بھی آگے ہی کو دوڑتا ہے۔

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا

حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا ۲۹

غالبؔ اپنے تخیل کی بیاباں نوردی میں جو قدم آگے بڑھاتے ہیں اس میں پھر پیچھے پلٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیٔ خیال

تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے ۳۰

غالبؔ اور اقبالؔ دونوں ہی کے کلام میں پُر جوش آرزومندی کی بے شمار مثالیں مل جاتی ہیں لیکن غالبؔ اور اقبالؔ کی آرزومندی میں ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ غالبؔ کی آرزومندی کی نوعیت خالصتاً انفرادی، شخصی اور ذاتی ہے جب کہ اقبالؔ نے اپنی آرزومندی کو اجتماعی آرزوؤں اور امنگوں کی صورت دے دی ہے بقول ڈاکٹر یوسف حسین خان:

''غالبؔ بے ریا انسان تھا وہ کبھی بلند اخلاقی یا اجتماعی نصب العین کا دعویدار نہیں ہوا اس کی آرزو مندی زیادہ تر مادی مُرفہ حالی اور حسن پر تصرف حاصل کرنے تک محدود رہی''۔ ۳۱

یہ ایک حقیقت ہے کہ غالبؔ بھی اقبالؔ کی طرح اس خیال کے حامی ہیں کہ ایک آرزو پوری ہو جائے تو ضرور ہے کہ دوسری آرزو روشنی کے مینار کی طرح دور سے دکھائی دینے لگے جس کی طرف انسان کو بڑھنا چاہیئے کیونکہ دل تو ہمیشہ تمناؤں کی نئی منزلوں کا خواہاں رہتا ہے اور شوق کی کوئی منزل نہیں ہے شاید اسی لئے ذوق دشت نوردی مرنے کے بعد بھی انہیں چین نہیں لینے دیتا۔

اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعدِ مرگ

ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں ۳۲

پروفیسر خورشید الاسلام کے الفاظ میں:

''وہ حرکت چاہتے ہیں اور ان کے شوق کی انتہا نہیں وہ دریا کا سا جوش رکھتے ہیں اور اپنی رفتار کے آگے بیابان کو بھی خاطر میں نہیں لاتے وہ اپنی تمناؤں کی پرورش کرتے ہیں اور۔۔۔۔ شدتِ جذبہ کے ساتھ ان کا تعاقب کرتے ہیں''۔۳۳

یہ درست ہے کہ غالبؔ کی فکر اقبالؔ کی طرح منظّم اور مربوط نہیں دونوں کے مقاصد کے اہداف اور موضوعات بھی جدا جدا ہیں اس کے باوجود زندگی کی بنیادی حقیقتوں کے باب میں اکثر دونوں شعراء کا رویہ یکساں ہے۔

تصوّرِ عشق:

اقبالؔ کا تصورِ عشق بھی خودی کے تصور کے تابع ہے۔ جذبۂ عشق کے بغیر خودی کا ارتقاء ممکن نہیں آرزو کی تکمیل کے لئے راستے کی رکاوٹوں سے برسرِ پیکار ہونا پڑتا ہے اور اس پیکار میں قوت بخشنے والی شے عشق ہی ہے۔ عشق زندگی کی اعلیٰ ترین تخلیقی صلاحیت ہے۔ بے پناہ محرکاتی قوت ہے جو خودی کو استحکام بخشتی ہے۔ غالبؔ کے برعکس اقبالؔ نے عشق کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ قلب کی لمحاتی کیفیات کے زیرِ اثر نہیں بلکہ ایک نظامِ فکر کے تحت کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر یوسف حسین خان:

''اقبالؔ کا تصورِ عشق، دوسرے شعراء کے متصوفانہ یا رسمی عشق سے بالکل مختلف ہے عشق ان کے یہاں زندگی کا ایک زبردست محرک عمل ہے جو ایک طرف تسخیرِ فطرت میں انسان کی مدد کرتا ہے دوسری طرف اسے کائنات کے ساتھ متحد رکھتا ہے۔ عشق سے فرد کی نظر میں اتنی بلندی اور قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی ہمتِ مردانہ کے سامنے جبریل کو 'صیدِ زبوں' خیال کرنے لگتا ہے اور وجدان کی کمند سے ذاتِ ایزدی پر قابو پانے کے منصوبے بناتا ہے۔۳۴

در دشتِ جنونِ من جبریلِ زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ'' ۳۵

عشق زندگی کا سب سے بڑا تعمیری اور تخلیقی عنصر ہے جس کی بدولت انسان کے پوشیدہ امکانات ظہور پذیر ہوتے ہیں:

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوزِ دمبدم
آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق
شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم ۳۶؎

اقبالؔ کے نزدیک عشق کی سب سے بڑی خصوصیت تخلیقِ آرزو اور تخلیقِ مقاصد ہے۔

شہید محبت نہ کافر نہ غازی
محبت کی رسمیں نہ ترکی نہ تازی
وہ کچھ اور شے ہے محبت نہیں ہے
سکھاتی ہے جو غزنوی کو ایازی ۳۷؎

عشق وہ آگ ہے جو انسان کے دل میں شرر بن کر رہتی ہے یہی شرر نورِ مطلق کی آنکھوں کا تارا ہے۔

شرر بن کے رہتی ہے انساں کے دل میں
یہ ہے نورِ مطلق کی آنکھوں کا تارا ۳۸؎

عشق ہی سے زندگی کے امکانات اجاگر ہوتے ہیں اور اس کی محدودیت بے کرانی میں بدل جاتی ہے

بنایا عشق نے دریائے ناپیدا کراں مجھ کو
یہ میری خودنگہداری مرا ساحل نہ بن جائے ۳۹؎

اقبالؔ کے نزدیک عشق کا تصور بہت وسیع مفہوم رکھتا ہے اس کی گوناگوں خوبیوں کے بیان میں اقبالؔ نے نو بہ نو تعبیریں و تفسیریں پیش کی ہیں۔ مثلاً:

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام

عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام
عشق دمِ جبرئیل عشق دلِ مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک
عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاس الکرام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات [40]

یا

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں تبکدۂ تصورات
صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق، صبرِ حسینؓ بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق [41]

یا

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات
علم مقامِ صفات، عشق تماشائے ذات [42]

علامہ اقبالؔ اس بلند و برتر تصورِ عشق کے ضمن میں عارفِ رومیؔ کے شاگردِ رشید ہیں انہوں نے حکمت و عرفان کے بیش بہا جواہر اسی مرشدِ کامل سے حاصل کئے ہیں لیکن اقبالؔ سے بہت پہلے غالبؔ بھی عشق کے رسمی و روایتی تصور سے انحراف کر چکے تھے۔ ان کے ہاں جذبۂ عشق کی کارفرمائی تمام مشرقی شعراء کے تصورات سے بہت مختلف ہے۔ غالبؔ ہوں یا اقبالؔ دونوں کے یہاں عشق ایک ہنگامۂ حیات، سوز و ساز، گرمی اور رونق کا موجب ہے۔ اقبالؔ کی طرح غالبؔ بھی اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ انسانی خودی کی تکمیل ہی میں اس کی ابدی مسرت کا راز پنہاں ہے اور یہ تکمیل عشق کی رہنمائی کے بغیر ممکن نہیں۔ غالبؔ بھی عشق کی اہمیت کے اس حد تک قائل ہیں کہ وہ اس کے بغیر انجمنِ ہستی'' کو

بے رونق سمجھتے ہیں زندگی کا سارا آب ورنگ اسی کی دین ہے۔ کسی کی خاطر مر مٹنے کی خواہش اسی کی بدولت ہے کچھ ہونے اور کچھ کرنے کی تمنا بھی اسی کے دامن میں پرورش پاتی ہے اگر خرمن میں بجلی یعنی دل میں عشق کی چنگاری نہ ہو تو وہ مردہ ہے جیسے شمع کی روشنی کے بغیر محفل بے رونق ہوتی ہے۔ غرض بزمِ ہستی کی تمامتر رونق اور چہل پہل عشق ہی کی بدولت ہے۔

رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں ۴۳

اسی خیال کو علامہ اقبال یوں پیش کرتے ہیں:

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نور حیات، عشق سے نارِ حیات ۴۴

اقبال کی طرح غالب بھی عشق کی تخلیقی اور وجدانی تاثیر، اس کی شرر باری، دل گدازی، آتش نفسی اور سیماب پائی کا ذکر اپنے اندازِ خاص میں کرتے نظر آتے ہیں۔

خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم
دل میں چھری چبھو، مژہ گر خونچکاں نہیں

ہے تنگِ سینہ دل اگر آتش کدہ نہ ہو
ہے عارِ دل نفس اگر آذر فشاں نہیں

نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب
سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں ۴۵

یا

ہم نے وحشت کدۂ بزمِ جہاں میں جوں شمع
شعلۂ عشق کو اپنا سر و ساماں سمجھا ۴۶

ڈاکٹر سید عبداللہ اپنے مقالے ''غالب...... پیشرو اقبال'' میں دونوں شعراء کے فلسفۂ خودی کا تجزیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اقبال کا فلسفۂ تسخیر وستیز بھی خودی سے مربوط ہے۔ زندگی جو خودی کی نمود ہے دائمی جدل و پیکار سے تشکیل پاتی ہے اور اسی پیکار سے ارتقاء پذیر ہو کر اُس منزلِ کمال کی طرف بڑھتی جاتی ہے جو زندگی کے مقدر میں ہے۔ اقبال کی شاعری میں تسخیرِ کائنات اور کشودِ حیات کی جو صورتیں پائی جاتی ہیں وہ تو ظاہر ہی ہیں مگر غالب کے کلام میں بھی ستیز، جارحانہ پیش قدمی اور اثباتِ خود کی صورتیں کچھ کم نہیں مثلاً نا آسودگی، ایک نئی زندگی کی تخلیق و تشکیل اور اس کے لئے جارحانہ اور انقلاب آفرین اندازِ فکر غالب کی کئی غزلیات میں ملتا ہے مثلاً ان کی یہ مشہور فارسی غزل جس کا مطلع ہے:

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم
قضا بہ گردشِ رطلِ گراں بگردانیم ۴۷

یا وہ غزل جس کا مطلع یہ ہے۔

رفتم کہ کہنگی ز تماشا بر افگنم
در بزمِ رنگ و بو نمطی دیگر افگنم ۴۸

اسی غزل میں وہ مشہور شعر بھی ہے جو علامہ اقبال کے پسندیدہ اشعار میں شامل تھا۔

تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر
بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم ۴۹

ڈاکٹر سید عبداللہ کی رائے میں یہ مخصوص احساس غالب کی تمام شاعری پر چھایا نظر آتا ہے ''لوح سے تمت تک'' ان کے یہاں طلب و سعی اور تگ و تاز کے ہزاروں مرحلے آتے ہیں، جن میں ان کا عزمِ تسخیر کارفرما نظر آتا ہے اسی اندازِ فکر اور طرزِ احساس نے غالب کو اقبال کی طرح عمل و توانائی کا شاعر بنایا ہے۔ غالب کے یہاں بھی سخت کوشی، خارا شگافی، ایک نئی دنیا آباد کرنے کا عزم اور اس کے لئے جہاد اور مجاہدہ کا ارادہ بھی بھرپور انداز میں موجود ہے یہاں تک کہ غالب کا عشق بھی انہیں رجحانات و خصوصیات کا آئینہ دار ہے۔

غالبؔ کے یہاں اردو شاعری کے روایتی عاشق کی سی انفعالیت نہیں بلکہ ایک صحت مندانہ جارحیت ہے، حرکت وتوانائی ہے۔ ان کے کلام میں عشاق کی روایتی عاجزی، مسکینی، انکساری، خاکساری اور پیش پا اُفتادگی کی بجائے زندگی کی حرارت، پندارِ محبت کا بھرم، وضعداری، تیکھے تیور، حرکت وفعالیت ہے جس میں غالبؔ کی انانیت اور خود داری کا رنگ جھلکتا ہے مثلاً یہ اشعار ملاحظہ کیجئے۔ ۵۰

غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو
وہ اپنی خُو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو ۵۱

ان پری زادوں سے لیں گے خُلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حُوریں اگر واں ہو گئیں ۵۲

پوچھ مت رسوائی اندازِ استغنائے حسن
دست مرہونِ حنا، رخسار رہنِ غازہ تھا ۵۳

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا ۵۴

زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسدؔ
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں ۵۵

غالبؔ کے یہاں عشق آفاق گیر وسعت کا حامل ہے۔ عشق ایک ایسی قوت ہے جو وجدان کی پرورش کرتی ہے، قلب ونظر کو جولانی بخشتی ہے یہی ذرّے کو صحرا اور قطرے کو دریا کی وسعتیں بخشتی ہے:

شوق ہے ساماں طراز نازش ارباب عجز

ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا ۵٦؎

زندگی کا مزا عشق ہی کی بدولت ہے یہ ایسا درد ہے جس کا کوئی علاج نہیں لیکن یہ خود ہر درد کی دوا ہے

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا

درد کی دوا پائی، دردِ بے دوا پایا ۵۷؎

عشق کی کارفرمائی اور کارگزاری سے حذر ممکن نہیں

کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر

پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے ۵۸؎

غالبؔ کے خیال میں عشق کے بغیر زندگی گزارنا ناممکن ہے:

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں

طاقت بقدرِ لذت آزار بھی نہیں ۵۹؎

عشق کرنا اور اس کے تقاضوں کو نبھانا اور اس کے معیار پر پورا اُترنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں اسی لئے کہتے ہیں:

ہر بو الہوس نے حسن پرستی شعار کی

اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی ٦٠؎

غالبؔ نے اپنی انفرادیت پسند طبیعت سے کام لیتے ہوئے عشق کے بندھے ٹکے مفہوم کو اپنا موضوع نہیں بنایا بلکہ عشق کی نفسیات کو سمجھتے ہوئے اس کے مختلف رنگ نکھارے ہیں۔ اقبالؔ نے انہی رنگوں میں مزید آمیزش کر کے عشق کے مفہوم کو وسعت اور بیکرانی بخشی اور اسے خودی کے ہم معنی قرار دیا جس کی کوئی حد مقرر نہیں

اَزل اس کے پیچھے اَبد سامنے

نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے ٦١؎

ضعفِ خودی:

اقبالؔ کے یہاں خودی جس طرح تربیت سے مستحکم ہوتی ہے اسی طرح لاپرواہی اور کوتاہ اندیشی سے ضعیف بھی

ہوجاتی ہے۔اقبالؔ کے نزدیک خودی کے ضعف اور کمزوری کا اولین سبب دستِ سوال کا دراز کرنا ہے۔وہ قوم یا وہ شخص جو کسی کا دست نگر ہوجائے وہ ذلت سے دوچار ہوجاتا ہے۔اسرارِ خودی کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''۔۔۔خودی کے استحکام کیلئے ہمیں جذبۂ محبت، جذب وعمل کی قوت پیدا کرنا چاہئیے اور سوال یعنی بے عملی کی ہر نوع سے بچنا چاہئیے۔'' ۶۲

سوال کی بھی بہت سی قسمیں ہیں دنیاوی مال و دولت اور جسم پرور اغراض کے لئے دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلایا جائے ایسا کرنے سے خودی ضعیف تر اور سوال کرنے والا خوار تر ہوجاتا ہے:

از سوال آشفتہ اجزائے خودی
بے تجلی نخلِ سینائے خودی
از سوال افلاس گردد خوار تر
از گدائی گدیہ گر نادار تر ۶۳

ذاتی اغراض کے لئے کسی سے رہنمائی چاہنا یا ہدایت طلب کرنا نیازمندی یا محبت کی دلیل نہیں بے غیرتی اور گداگری ہے۔

مانگنے والا گدا ہے صدقہ مانگے یا خراج
کوئی مانے یا نہ مانے میر و سلطاں سب گدا ۶۴

عزتِ نفس کا تقاضا تو یہ ہے کہ انسان بحرِ حیات میں اپنا پیمانہ نگوں رکھے کیونکہ مومیائی کی گدائی سے تو شکست بہتر ہے۔

چوں حباب از غیرتِ مردانہ باش
ہم بہ بحر اندر نگوں پیمانہ باش ۶۵

یا

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من، تیرا نہ تن ۶۶

ہاں اگر فقر و استغناء کے ساتھ دنیاوی حرص و ہوا سے بے نیاز ہو کر کسی مرشدِ کامل سے ہدایت و رہنمائی طلب

کی جائے تو خودی طاقتور بن جاتی ہے۔

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری
اک فقر سے کھلتے ہیں اسرارِ جہانگیری
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری
اک فقر سے مٹی میں خاصیت اکسیری ۶۷

اقبالؔ کی طرح غالبؔ بھی اپنی خودداری، انانیت اور وضعداری کو سامنے رکھتے ہوئے کسی کے آگے دستِ سوال دراز کرنے کو معیوب گردانتے ہیں۔ ان کے نزدیک احسان ایک ایسا بوجھ ہے جسے بے جان دیوار بھی برداشت نہیں کر سکتی تو انسان کا درجہ تو بہت بلند ہے۔ اس شعر میں دیکھیئے کہ دیوار کے جھک جانے کو مزدور کے احسانات کا نتیجہ قرار دے رہے ہیں۔

دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم
اے خانماں خراب نہ احساں اُٹھایئے ۶۸

غالبؔ کسی کی مدد اور کسی کا سہارا لے کر حقیقت کی تلاش میں بھی نکلنا مناسب نہیں سمجھتے۔ اسی لئے کہتے ہیں:

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آ گہی گر نہیں غفلت ہی سہی ۶۹

معاملاتِ عشق و محبت میں بھی غالبؔ مکمل سپردگی اور خودرفتگی کی بجائے اپنی انفرادیت اور خودداری برقرار رکھتے ہیں۔ غالبؔ اگر محبوب کے در پر جاتے ہیں اور اس کا دروازہ بند پاتے ہیں تو آواز دے کر خاص اپنے لئے دروازہ کھلواتے ہیں۔ اگر دروازہ پہلے ہی کھلا ہو تو اندر جانا اپنی غیرت کے خلاف خیال کرتے ہیں۔

ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے
یار کا دروازہ پائیں گر کھلا ۷۰

بندگی میں بھی انانیت کا یہ عالم ہے کہ اگر کعبے کا دروازہ کھلا نہ ہو تو بجائے دروازہ کھلوانے کی درخواست کرنے کے الٹے پاؤں واپس آ جاتے ہیں۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ وخودبیں ہیں کہ ہم

الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا اے

غالبؔ کے عشق میں عجز ونیا نہیں بلکہ انتہا درجے کی انانیت اور وضعداری ہے جس کا اظہار قدم قدم پر ملتا ہے۔

واہ وہ عزورِ عزو ناز یاں یہ حبابِ پاسِ وضع

راہ میں ہم ملیں کہاں؟ بزم میں وہ بلائے کیوں ۲ے

وفا کیسی، کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا

تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو ۳ے

عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر

دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچئے ۴ے

غالبؔ کو اپنی ذات کا عرفان حاصل ہے اسی لئے وہ فطرت کے رحم وکرم پر زندہ رہنے کی بجائے اپنی منزل خود ڈھونڈنا چاہتے ہیں۔ اپنے بازوؤں کی توانائی پر بھروسہ کر کے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا اور اپنا راستہ خود بنانا چاہتے ہیں کیونکہ:

مجبوری و دعوائے گرفتاریِ الفت

دستِ تہہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے ۵ے

غالبؔ کے سامنے اقبالؔ کی طرح نہ کوئی اجتماعی فلسفہ تھا نہ ہی وہ کسی انقلاب کے داعی تھے لیکن وہ رسوم و قیود سے بغاوت کر کے ایک نئی دنیا کی تعمیر کے خواہاں ضرور نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان کی یہ رائے وقیع ہے کہ:

''غالبؔ کی فکر جذباتی اور اقبالؔ کا جذبہ مفکرانہ انداز رکھتا ہے۔'' ۶ے

خودداری اور آزادگی غالبؔ کی شخصیت کا وہ جوہر ہے جس سے اقبالؔ بھی متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکے۔ دلی کالج کی پروفیسری کے سلسلہ میں ان کی خودداری ہی مزاحم ہوئی تھی، جب انتہائی تنگ دستی کے باوجود انہوں نے پروفیسری کی پیشکش کو محض اس لئے ٹھکرا دیا تھا کہ ان کا استقبال مغلیہ روایات اور شان وشوکت کے مطابق نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن

دوسری طرف انہوں نے مالی مشکلات سے تنگ آ کر قصائد بھی لکھے جن میں وہ گدائی کا کشکول اُٹھائے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے مقامی اور انگریز حکمران اور روساء کی شان میں جو قصیدے لکھے ہیں ان پر اقبالؔ احتجاج اور افسوس کئے بنا نہ رہ سکے ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

''غالبؔ واقعی بہت بڑا شاعر تھا لیکن محض پنشن میں اضافے کے خیال سے سرکارِ انگلشیہ کی مدح میں قصائد لکھنا بڑے افسوس کی بات ہے۔۔۔۔'' ۷؎

اس ضمن میں اقبالؔ سے پہلے خود غالبؔ اپنا محاسبہ فرما چکے تھے۔ ان کی عظمت کی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے اپنی شخصیت اور ذات کو پردوں میں نہیں چھپایا۔ اعترافِ گناہ کرتے ہوئے علاؤالدین احمد خان علائی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

''گورنمنٹ کی بھاٹ بھٹی گرتا تھا۔ خلعت پاتا تھا، خلعت موقوف بھٹی متروک۔'' ۸؎

میرزا تفتہ کے نام ایک اور خط میں لکھتے ہیں۔

''میں نثر کی داد اور نظم کا صلہ مانگنے نہیں آیا بھیک مانگنے آیا ہوں'' ۹؎

غالبؔ نے اپنے قصائد کے باب میں جو رائے خود پیش کی ہے اُسے اقبالؔ کی مذکورہ رائے کا پیش خیمہ قرار دیا جا سکتا ہے انہوں نے بارہا اعتراف کیا ہے کہ میرے دیوان میں ہے کیا؟ کچھ غزلیں ہیں جن میں ''شاہد بازی'' یعنی ہوا پرستی ہے اور کچھ قصیدے ہیں جن میں تونگر ستائی یعنی بادخوانی ہے یہ لکھ کر وہ خود افسوس کرتے ہیں کہ میں نے خود کو اتنا گرا دیا ہے کہ ہر اورنگ نشیں کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جانا چاہتا ہوں۔ مالی مسائل اور حالات کی الم سامانیوں نے غالبؔ کے اندر اُس خوددار شخص کو موت کے گھاٹ اُتار دیا جو خود تو کُجا کسی دوسرے کو بھی بھیک مانگتے نہیں دیکھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔

اگر انصاف کیا جائے تو غالبؔ جسے نہ ستائش کی تمنا تھی اور نہ صلے کی پرواہ'' انہوں نے قصائد میں بھی اپنی فطری وضعداری اور انانیت کو نبھائے رکھا۔ خود فرماتے ہیں کہ جہاں تک تشبیب اور گریز کا تعلق ہے میں فارسی کے اعلیٰ درجے کے قصیدہ گو شاعروں تک افتاں وخیزاں پہنچ جاتا ہوں، مگر مدح میں اُن کا ساتھ نہیں دیا جاتا کیونکہ یہ اس قدر مبالغہ آمیز ہے کہ تصور میں بھی نہیں آسکتا۔ حکیم غلام رضا خاں کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''سنو صاحب! میں فقیر آزادہ کیش ہوں۔ دنیا دار نہیں، مکار نہیں، خوشامد میرا شعار نہیں۔ جس میں

جو صفات دیکھتا ہوں، وہ بیان کرتا ہوں"۔80

غالبؔ کے قصائد کی مدحت طرازی روایتی قصیدہ گو شعراء سے مختلف ہے مدح سے اُن کا مقصود صرف انعام و اکرام حاصل کرنا نہ تھا شاید اس لئے اُن کے قصائد "حسنِ طلب" سے خالی ہیں وہ عام قصیدہ گو شعراء کی طرح دستِ سوال دراز نہیں کرتے۔ اُن کی نظم "گزارشِ مصنف بحضورِ شاہ" میں مانگنے کا انداز ملاحظہ ہو:

میری تنخواہ جو مقرر ہے
اُس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مردے کی چھ ماہی ایک
خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو تو ہوں بقیدِ حیات
اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار
آج مجھ سا نہیں زمانے میں
شاعر نغز گوئے خوش گفتار
رزم کی داستاں اگر سنیئے
ہے زباں میری تیغِ جوہر دار
بزم کا التزام گر کیجئے
ہے قلم میرا ابرِ گوہر بار
ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد
قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار
میری تنخواہ کیجئے ماہ بماہ
تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام
شاعری سے مجھے نہیں سروکار
تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار ۸۱؎

اس نظم میں مدح بھی ہے، اظہار مدعا بھی، فخر ومباہات کا انداز بھی اور خودداری، وضعداری کا خیال بھی۔ غموں اور محرومیوں کے باوجود اُن کے آہنگ میں مسکینی و بے کسی نہیں جھلکتی بلکہ اُن کا پروقار اور پرُ تمکنت لب ولہجہ ہر حال میں برقرار رہتا ہے اور اسی میں اسداللہ'' کے غالبؔ'' ہونے کا راز پنہاں ہے۔

ع حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

حوالہ جات

۱۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ۲۴۳

۲۔ اقبالؔ، بانگِ درا، کلیات اقبالؔ اُردو، صفحہ۶۹

۳۔ غالبؔ، کلیات غالبؔ فارسی، جلد سوم، صفحہ۱۵

۴۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ۱۴۸

۵۔ اقبالؔ ، بانگ درا، کلیات اقبالؔ اُردو، صفحہ۱۹۲

۶۔ ایضاً، صفحہ۶۹

۷۔ ایضاً ، صفحہ۱۳۰

۸۔ غالبؔ ، دیوان، غالبؔ جدید، صفحہ۲۵۰

۹۔ یوسف حسین، ڈاکٹر خان، روح اقبالؔ (لاہور: القمر انٹر پرائزز، جنوری ۱۹۹۶ء) صفحہ۱۴۳

۱۰۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر ، اقبالؔ سب کے لئے ،(کراچی: اُردو اکیڈی سندھ طبع اول، ۱۹۷۸ء) صفحہ۶۹

۱۱۔ اقبالؔ ، بال جبریل، کلیات اقبالؔ اُردو، صفحہ۴۱۹

۱۲۔ ایضاً، صفحہ۳۳۶

۱۳۔ اقبالؔ، ضرب کلیم، کلیات اقبالؔ اُردو، صفحہ۴۹۳

۱۴۔ عبداللہ، ڈاکٹر، سید، مسائل اقبالؔ، صفحہ۱۲۶

۱۵۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ۲۳

۱۶۔ اقبالؔ، بانگِ درا، کلیات اقبالؔ اُردو، صفحہ۱۱۵

۱۷۔ اقبالؔ، بال جبریل، کلیات اقبالؔ اُردو، صفحہ۴۲۰

۱۸۔ اقبالؔ، اسرار خودی، کلیات اقبالؔ فارسی، صفحہ۱۶

۱۹۔ ایضاً، صفحہ۱۷

۲۰۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیات اقبالؔ اُردو، صفحہ۳۰۶

۲۱۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ۴

۲۲۔ ایضاً، صفحہ۱۸۵

۲۳۔ ایضاً ، صفحہ۱۱۹

۲۴۔ نقوش، غالبؔ نمبر (حصہ دوم) شمارہ۱۱۳ (لاہور: ادارۂ فروغ اُردو اکتوبر ۱۹۶۹) صفحہ۳۲۴

۲۵۔ اقبالؔ، ضربِ کلیم، کلیات اقبالؔ اُردو، صفحہ۶۲۸

۲۶۔ ایضاً، صفحہ۵۲۶

۲۷۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ۱۶۲

۲۸۔ ایضاً ، صفحہ۱۱۳

۲۹۔ ایضاً، صفحہ۱۱

۳۰۔ ایضاً، صفحہ۱۶۹

۳۱۔ یوسف حسین، ڈاکٹر، خان، متحرک جمالیات، صفحہ۷۶

۳۲۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ۱۵۰

۳۳۔ خورشیدالاسلام، پروفیسر، غالبؔ......تقلید و اجتہاد (علیگڑھ ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۷۹ء) صفحہ۱۵۱

۳۴۔ یوسف حسین، ڈاکٹر خان، روحِ اقبالؔ، صفحہ۳۷

۳۵۔ اقبالؔ، پیامِ مشرق، کلیات اقبالؔ فارسی، صفحہ۳۳۶

۳۶۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ۳۲۴

۳۷۔ ایضاً، صفحہ۴۳۸

۳۸۔ اقبالؔ، بانگِ درا، کلیات اقبالؔ اُردو از حو صفحہ۵۸

۳۹۔ اقبالؔ، بال جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ۳۰۲

۴۰۔ ایضاً ، صفحہ۳۸۷

۴۱۔ ایضاً ، صفحہ۴۰۴

۴۲۔ اقبالؔ، ضربِ کلیم، کلیات اقبالؔ اُردو، صفحہ۴۸۳

۴۳۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ۱۲۹

۴۴۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۳۸۷

۴۵۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۱۱۵

۴۶۔ ایضاً، صفحہ ۱۴

۴۷۔ غالبؔ، کلیات غالبؔ فارسی، جلد سوم، صفحہ ۲۹۳

۴۸۔ ایضاً ، صفحہ ۲۴۲

۴۹۔ ایضاً ، صفحہ ۲۴۳

۵۰۔ عبداللہ، ڈاکٹر، سید، مسائلِ اقبالؔ، صفحہ ۱۲۶۔۱۲۷

۵۱۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۱۵۳

۵۲۔ ایضاً ، صفحہ ۱۳۸

۵۳۔ ایضاً ، صفحہ ۱۳

۵۴۔ ایضاً ، صفحہ ۱۷

۵۵۔ ایضاً ،۱۲۰

۵۶۔ ایضاً ، صفحہ ۱۹

۵۷۔ ایضاً ، صفحہ ۵

۵۸۔ ایضاً، صفحہ ۲۷۸

۵۹۔ ایضاً ، صفحہ ۱۳۹

۶۰۔ ایضاً ، صفحہ ۲۴۸

۶۱۔ اقبالؔ، بال جبریل، کلیات اقبالؔ اُردو ، صفحہ ۴۱۹

۶۲۔ اقبالؔ، دیباچہ اسرار خودی، (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز ۱۹۷۱)

۶۳۔ اقبالؔ، اسرار خودی، کلیات اقبالؔ فارسی، صفحہ ۲۳

۶۴۔ اقبالؔ، بال جبریل، کلیات اقبالؔ اُردو، صفحہ ۴۰۹

۶۵۔ اقبالؔ، اسرار خودی، کلیات اقبالؔ فارسی، صفحہ ۲۴

۶۶۔ اقبالؔ، بال جبریل، کلیات اقبالؔ اُردو، صفحہ ۳۲۳

۶۷۔ ایضاً، صفحہ ۴۵۲

۶۸۔ غالبؔ، دیوان غالبؔ جدید، صفحہ ۱۶۰

۶۹۔ ایضاً صفحہ ۲۴۳

۷۰۔ ایضاً، صفحہ ۳۱۷

۷۱۔ ایضاً، صفحہ ۴۶

۷۲۔ ایضاً ، صفحہ ۱۴۱

۷۳۔ ایضاً ، صفحہ ۱۵۳

۷۴۔ ایضاً ، صفحہ ۲۲۸

۷۵۔ ایضاً ، صفحہ ۲۰۶

۷۶۔ یوسف حسین، ڈاکٹر خان، متحرک جمالیات، صفحہ ۳۲

۷۷۔ نذیر نیازی، سید، اقبالؔ کے حضور (کراچی: اقبالؔ اکیڈمی ۱۹۷۱ء) صفحہ ۲۷۸

۷۸۔ غالبؔ، خطوطِ غالبؔ، مرتبہ غلام رسول مہر (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، بار ہفتم، ۱۹۹۳ء) صفحہ ۱۷۶

۷۹۔ ایضاً ، صفحہ ۱۷۶

۸۰۔ ایضاً ، صفحہ ۵۳۲

۸۱۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۳۳۴

غالبؔ اور اقبالؔ کا تصورِ شعر و سخن

غالبؔ اور اقبالؔ کا تصورِ شعر وسخن

فنِ شاعری کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی ماہیئت کیا ہے؟ کیا شاعری کو الہام کا درجہ حاصل ہے یا یہ کوئی اکتسابی شے ہے جسے محنت وریاضت کا ثمرہ کہنا چاہیئے ؟ یہ وہ مختلف سوالات ہیں جو فن کی بابت مختلف ذہنوں میں ابھرتے رہے ہیں۔ایک مکتبِ فکر کے خیال کے مطابق فن کا مقصد تخلیقِ حسن ہے۔یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حسن کیا ہے؟ کیا اس کا کوئی مادی وجود ہے یا یہ فنکار کے اپنے ہی کسی باطنی جذبے کا خارجی اظہار ہوتا ہے؟ نیز یہ سوال بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے کہ فن کا کمال یا منتہا و مقصود کیا ہے؟

فنِ شاعری کے باب میں تخلیقِ شعر سے وابستہ ان سوالوں کا جواب ڈھونڈا جائے تو بعض کے نزدیک شعر کا حسن اس کے ظاہری پیکر وہیئت میں مضمر ہے۔الفاظ کی بندش، قافیہ اور ردیف کی چستی شاعری کے بے جان پیکر میں جان ڈال دیتے ہیں،

بعض کے خیال کے مطابق شعر کا حُسن شاعر کے فکر وخیال کی بلندی اور حسنِ تخیل میں مخفی ہوتا ہے۔

جب کہ بعض کے مطابق شعر کا حُسن نہ تو محض الفاظ میں ہوتا ہے نہ معنی میں بلکہ ہئیت ومواد کی ہم آہنگی اور یک رنگی حسنِ شعر کی تخلیق کا سبب بنتی ہے بقول اقبالؔ:

میں شعر کے اسرار سے محرم نہیں لیکن
یہ نکتہ ہے تاریخ امم جس کی ہے تفصیل
وہ شعر کہ پیغامِ حیاتِ ابدی ہے
یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگِ سرافیل ؂۱

الغرض ہر بڑے فنکار اور عظیم شاعر کے کلام میں فن کا ایک مخصوص تصُور اور خیال کارفرما ہوتا ہے کسی شاعر کے جملہ نظریاتِ حیات اور نظریۂ فن کا مستند ترین ماخذ اُس کا کلام ہی ہوتا ہے کیونکہ شاعر اپنے شعر کے آئینے میں ہمیشہ سچ بولتا ہے۔اقبالؔ سے پہلے غالبؔ اردو ادب کے ایسے شاعر ہیں جن کے کلام اور خطوط میں نظریۂ فن کی بابت واضح اشارے ملتے ہیں۔لیکن یہ اشارے اقبالؔ کے نظامِ فکر کی مانند مسلسل ومربوط نہیں بلکہ غیر منظّم اور منتشر صورت میں ملتے ہیں۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی رائے کے مطابق:

''اُردو میں فن کے بارے میں کوئی واضح تصور رکھنے اور اس کی روشنی میں شعر کہنے کا بے قاعدہ اور غیر

منظّم سلسلہ غالبؔ سے اور منظّم و با قاعدہ سلسلہ اقبالؔ سے شروع ہوتا ہے۔ درمیان میں حالیؔ کی
اصلاحی کوششیں بھی قابلِ ذکر ہیں کہ اقبالؔ نے ان سے بہت کچھ رہنمائی حاصل کی ہے۔۔۔۔
غالبؔ اور حالیؔ نے فنِ شاعری کے بارے میں غور وفکر کی جو طرح ڈالی تھی اُس پر اقبالؔ نے ایک
شاندار عمارت تعمیر کردی'' ۔[۲]

اقبالؔ نے فن اور رموزِ فن پر جس منطقی اور حکیمانہ انداز میں اظہارِ خیال کیا ہے اس کی نظیر اردو شعروادب کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ان کے تصورِ فن کی انفرادیت یہ ہے کہ یہ نظریہ بھی دیگر نظریات کی طرح ان کے ذہنی ارتقاء کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں وسعت اور ہمہ گیری پیدا ہوتی گئی۔ غالبؔ اور اقبالؔ کی فکری ہم آہنگی نظریاتِ شعروسخن کے باب میں بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔ ادب کی دنیا میں اقبالؔ سے پہلے غالبؔ جا بجا اپنے نظریۂ شعروشاعری کی طرف بلیغ اشارے کرتے نظر آتے ہیں جس سے ان کی بالغ نظری، روشن خیالی، بصیرت و بصارت اور تنقیدی شعور کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

جدّت وندرت:

فن کے بارے میں غالبؔ کا نقطۂ نظر اپنے زمانے سے کسی قدر جدا اور دورِ مابعد سے زیادہ قریب تھا۔ انہوں نے پہلی مرتبہ مروجہ شعروادب کی دنیا میں موجود تنگی و تشنگی اور محدودیت کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ اس کے خلاف صدائے احتجاج بھی بلند کرتے نظر آئے کہ:

بقدر شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہئیے وسعت مرے بیاں کے لئے [۳]

ادب کی دنیا میں غالبؔ ہی وہ پہلے ''بت شکن'' تھے جنھوں نے دوش کے آئینے میں فردا کا عکس دیکھ کر اُردو غزل کی مروجہ ''فارم واسلوب ومعنویت'' کے خلاف آواز اُٹھائی۔ حالیؔ ''یادگارِ غالبؔ'' میں اس امر کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میرؔ وسوداؔ اور ان کے مقلدین نے اپنی غزل کی بنیاد اس بات پر رکھی کہ جو عاشقانہ مضامین صدیوں اور قرنوں سے اولاً فارسی اور اس کے بعد اُردو غزل میں بندھتے چلے آتے ہیں وہی مضامین بہ تبدیلِ الفاظ اور بہ تغیرِ اسالیب بیانِ عامہ اہلِ زبان کی معمولی بول چال اور روزمرہ میں ادا کئے جائیں۔ چنانچہ میرؔ سے لے کر ذوقؔ تک جتنے مشہور غزل گو مرزا کے سوا، اہلِ زبان میں گزرے ہیں ان کی

غزل میں ایسے مضامین بہت ہی کم نکلیں گے جو اس محدود دائرے سے خارج ہوں۔۔۔ برخلاف اس کے مرزا نے اپنی غزل کی عمارت دوسری بنیاد پر قائم کی ہے ان کی غزل میں زیادہ تر ایسے اچھوتے مضامین پائے جاتے ہیں جن کو اور شعراء کی فکر نے بالکل مس نہیں کیا۔۔۔ جب میرؔ و سوداؔ اور ان کے مقلدین کے کلام میں ایک ہی قسم کے خیالات اور مضامین دیکھتے دیکھتے جی اکتا جاتا ہے اور اس کے بعد مرزا کے دیوان پر نظر ڈالتے ہیں تو اس میں ہم کو ایک دوسرا عالم دکھائی دیتا ہے۔ جس طرح کہ ایک خشکی کا سیاح سمندر کے سفر میں یا ایک میدان کا رہنے والا پہاڑ پر جا کر ایک بالکل نئی اور نرالی کیفیت مشاہدہ کرتا ہے اسی طرح مرزا کے دیوان میں ایک اور ہی سماں نظر آتا ہے۔'' ۴

غالبؔ کو خود بھی اس امر کا احساس تھا کہ میدان شاعری میں ان کی لے یکسر جداگانہ اور منفرد ہے اسی لئے فرماتے ہیں:

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ ''غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور'' ۵

غالبؔ کے تصورِ فن کی تشکیل میں ان کی فطری انفرادیت، نسلی برتری اور خاندانی عظمت کا بھی برابر کا ہاتھ رہا یہی وجہ ہے صرف شاعری کو وہ اپنے لئے ذریعۂ عزت نہیں گردانتے

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے ۶

غالبؔ کے تصورفن میں بھی برتری کا احساس نمایاں نظر آتا ہے۔ ان کے تصورِ فن میں افتادگی نہیں بلکہ خوب سے خوب تر کی تلاش ہے اسی لئے وہ قدم قدم پر روایت شکنی، قیود سے خلاصی اور ایک قسم کا اعلان آزادی کرتے نظر آتے ہیں انہیں حیرت ہے کہ:

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں
پابستگی رسم و رہِ عام بہت ہے ۷

غالبؔ نے اردو شاعری کی روایت کو ایک نیا موڑ بخشا اور نئے آنے والے شعراء کے لئے نئی راہوں کا تعین کیا خود فرماتے ہیں کہ:

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں ۸

غالبؔ اپنی شاعری کے امکانات سے خود بھی باخبر تھے اسی لئے فرماتے ہیں:

ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے ۹

بلاشبہ اقبالؔ ہی اُن ''یارانِ نکتہ داں'' میں سے تھے جنھوں نے غالبؔ کی فکرِ رسا کو نہ صرف سراہا بلکہ خود اپنے لئے پسند فرما کر اسے مزید وسعت اور ہمہ گیری عطا کی جس طرح مرزا غالبؔ نے کہا تھا کہ:

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم
قضا بہ گردشِ رطلِ گراں بگردانیم ۱۰

اسی طرح اقبالؔ نے شیخ عبدالقادر سے مخاطب ہو کر فرمایا:

اُٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افقِ خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں
شمع کی طرح جئیں بزم گہہِ عالم میں
خود جلیں، دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں ۱۱

اقبالؔ کا نظریۂ شعران نظموں میں پوری جزئیات کے ساتھ نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے جو انہیں نے مختلف شعراء کی شان میں تحریر کی ہیں۔

''بانگِ درا'' میں یہ نظمیں داغؔ، شبلیؔ، حالیؔ، غالبؔ، عرفیؔ اور شیکسپیئر سے متعلق ہیں۔ بالخصوص مرزا غالبؔ کے حضور نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے اقبالؔ ان کے تخیل کی بلند پروازی، روح و بدن کے رشتوں کے ادراک اور حسن کی اس جستجو کی اہمیت بھی واضح کرتے ہیں جو زندگی کو ہمہ وقت متحرک اور بیدار رکھتی ہے اور انسان کو نت نئی دنیاؤں سے متعارف کرواتی ہے۔

ع تیری کشتِ فکر سے اُگتے ہیں عالم سبزہ وار ۱۲

نظم غالبؔ میں اقبالؔ اپنا فنی مطمحِ نظر واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ غالبؔ کی طرح سچا شاعر وہ ہے جس کی

نوا زندگی سے کچھ چھینے نہیں بلکہ اس کے سرمائے میں اضافہ کرے۔اس کی شاعری زندگی کی عکاس ہو۔اس کے حسن گویائی سے بے جان تصویریں بول اٹھیں۔اس نظم میں اقبالؔ یہ نازک نکتہ بھی بیان کرتے ہیں کہ صرف تخیل کی بلند پروازی سے عظیم شاعری تخلیق نہیں کی جاسکتی۔غالبؔ کی سی عظیم شاعری تخلیق کرنے کے لئے تخیل کی بلندی میں فکر کی بلندی کو بھی شامل کرنا پڑتا ہے۔خود اقبالؔ کے اپنے کلام کی سب سے نمایاں خوبی ان کے طرزِ ادا کی ندرت اور طرفگی ہے۔غالبؔ کی طرح اقبالؔ کو بھی احساس ہے کہ ان کا اندازِ بیان اور طرزِ کلام ''کچھ اور'' ہی شے ہے۔

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے درد مند کا طرزِ کلام اور ہے ۱۳؎

اقبالؔ کی جدت طراز فطرت نے ہر جگہ اپنی انفرادیت کا لوہا منوایا ہے اور مروجہ اسلوب کو ایسے اچھوتے اور دلکش انداز میں استعمال کیا ہے جو اردو شاعری میں یقیناً اختراعات کا درجہ رکھتے ہیں بقول مجنوں گورکھپوری

''اقبالؔ کا اصلی اجتہاد یہ ہے کہ وہ پرانے الفاظ وفقرات اور پرانے اسالیب وروایات کو بالکل نئے انداز سے استعمال کرکے ہماری زندگی کی نئی ضرورتوں کے لئے کام میں لائے''۔۱۴؎

اقبالؔ کا کلام گوناگوں مضامین اور خیالات کا ایک نگار خانہ ہے فکر وخیال کی ندرت وجدت کے ساتھ ساتھ انہوں نے اس بات کا بھی بھرپور خیال رکھا ہے کہ ان کے کلام میں کہیں پامال الفاظ استعمال نہ ہوں انہوں نے بکثرت نئی نئی تراکیب، علامات اور اصطلاحات وضع کی ہیں جو وسعتِ معانی کی وجہ سے اردو زبان کا جزو بن چکی ہیں مثلاً شرابِ زندگی، رزم گاہِ خیر وشر، ذوقِ آگہی، کوششِ ناتمام، قلزمِ ہستی، کفِ تقدیر، داغِ آرزو اور اسی طرح کی بے شمار تراکیب سے اردو زبان کو جو وسعت حاصل ہوئی ہے اسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

الہامی شاعری:

غالبؔ اور اقبالؔ دونوں کے فکر وخیال کے مطابق شاعری الہامی اور وہبی چیز ہے اکتساب نہیں۔غالبؔ اپنی الہامی شاعری کے باب میں فرماتے ہیں:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے ۱۵؎

شاید غالبؔ کے فن کی اسی خصوصیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے عبدالرحمٰن بجنوری نے یہ تاریخی رائے دی کہ

''ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں مقدس وید اور دیوانِ غالبؔ'' ۱۶

یہاں تک کہ غالبؔ کو اپنی الہامی شاعری کی داد بھی انسانوں سے نہیں روح القدس ہی سے ملتی ہے یعنی

پاتا ہوں اُس سے داد کچھ اپنے سخن کی میں
روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں ۱۷

ایک جگہ اور فرماتے ہیں:

گر ذوقِ سخن بدہر آ میں بودے
دیوان مرا شہرتِ پرویں بودے
غالبؔ اگر ایں فن سخن دیں بودے
آں دیں را ایزدی کتاب ایں بودے ۱۸

شاید اسی لئے غالبؔ کو لوگوں سے اپنی قدر ناشناسی کا کوئی گلہ نہیں تھا نہ ستائش کی تمنا تھی اور نہ صلے کی پرواہ:

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ
گر نہیں ہے مرے اشعار میں معنی نہ سہی ۱۹

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا ۲۰

فنِ شاعری کے معاملے میں یہ بے نیازی اقبالؔ کے یہاں بھی نمایاں نظر آتی ہے۔

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ ۲۱

مری نوا میں نہیں ہے ادائے محبوبی
کہ بانگِ صورِ سرافیل دلنواز نہیں ۲۲

خوش آ گئی ہے جہاں کو قلندری میری

وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے ۲۳

اقبالؔ مرقع چغتائی کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ کسی قوم کی روحانی صحت کا دارومدار اس کے شعراء اور آرٹسٹ کی الہامی صلاحیت پر ہوتا ہے لیکن یہ ایسی چیز نہیں جس پر کسی کو قابو حاصل ہو یہ ایک عطیہ ہے۔ خود اقبالؔ کے اندر شاعری کا ملکہ بچپن ہی سے ودیعت تھا اور پھر اُن کی شعر کہنے کی کیفیت بھی کسی الہام سے کم نہ تھی۔ گویا

تھا ضبط بہت مشکل اس سیلِ معانی کا

کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتاب آخر ۲۴

فن اور زندگی:

غالبؔ کا الہامی انداز اقبالؔ تک آتے آتے ''شاعری جزویست از پیغمبری'' کی حدوں کو چھوتا نظر آتا ہے ان کے نزدیک سچا فن زندگی کا خادم ہوتا ہے۔

علم از سامانِ حفظِ زندگی است

علم از اسبابِ تقویمِ خودی است

علم و فن از پیش خیزانِ حیات

علم و فن از خانہ زادانِ حیات ۲۵

اقبالؔ ''ادب برائے ادب'' کے نظریے کے سخت مخالف ہیں ان کے نزدیک شاعری مقصود بالذات نہیں بلکہ زندگی کی اعلیٰ قدروں کے حصول کا ایک ذریعہ ہے سید سلیمان ندوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر میرا مطمحِ نظر نہیں رہا۔ مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہوا اور بس۔ اس بات کو مدنظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں کیا عجب آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں۔ اس واسطے کہ فن غایت درجہ کی جانکاہی چاہتا ہے اور یہ بات موجودہ حالات میں میرے لئے ممکن نہیں۔'' ۲۶

اسی خیال کو اشعار کے دلکش پیرائے میں یوں بیان کرتے ہیں:

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست
سوئے قطاری کشم، ناقۂ بے زمام را ۲۷

ارمغانِ حجاز میں ایک جگہ فرماتے ہیں۔

سُرود رفتہ باز آید کہ ناید؟
نسیمے از حجاز آید کہ ناید؟
سرآمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید؟ ۲۸

یا

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ ۲۹

چونکہ فن زندگی سے الگ کوئی چیز نہیں اس لئے فنکار کے لئے ضروری ہے کہ وہ زندگی کا دور سے تماشا کرنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ اس کی دوڑ دھوپ میں خود بھی شریک ہو۔ اگر ایسا نہیں تو فن مصنوعی اور اجتماعی قدروں کے لئے ہلاکت کا موجب ہوگا۔

نہ جدا رہے نوا گر تب و تابِ زندگی سے
کہ ہلاکی امم ہے یہ طریقِ نے نوازی ۳۰

اقبالؔ شاعری کو عبادت کا درجہ دیتے ہیں ''جاوید نامہ'' میں مولانا روم کی زبان سے شعر اور شاعری کی عظمت بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ایک سچا شعر خس و خاشاک کو چمن زار میں بدل دیتا ہے آسمان کے سینے میں شگاف ڈال دیتا ہے۔ شاعر کی فطرت سراپا جستجو اور اس کی حیثیت ملت کے سینے میں دل کی سی ہوتی ہے۔ شعر اور شاعر اگر سوز و مستی سے سرشار ہوں تو تزئینِ عالم کا سبب ہوتے ہیں اگر شاعری کا مقصود آدم گری ہو تو پھر وہ 'وارثِ پیغمبری'' بن جاتی ہے۔

شعر را مقصود اگر آدم گری است
شاعری ہم وارثِ پیغمبری است ۳۱

اقبالؔ کو اپنی الہامی شاعری پر بجا ناز ہے کہ وہ اس سے اپنے بلند مقاصد حاصل کر سکتے ہیں۔

کیا عجب میری نوا ہائے سحر گاہی سے
زندہ ہو جائے وہ آتش کہ تری خاک میں ہے ۳۲

معنی آفرینی:

اقبال کے برعکس غالب نے فنِ شاعری کو فلسفیانہ وحکیمانہ خیالات یا کسی منظم ومنضبط نظامِ فکر کا آلہ بنانا مناسب نہیں سمجھا ان کے نزدیک بڑی شاعری ہمیشہ مقصد کی قید سے آزاد رہتی ہے کیونکہ شاعری نظریہ نہیں ہوتی نظریے کے اظہار کا ایک ذریعہ ہو سکتی ہے۔ اشعار کے آئینے میں دل کے بھید عیاں ہو جاتے ہیں یعنی:

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے ۳۳

جب کہ اقبال کے خیال میں:

گفتار کے اُسلوب پہ قابو نہیں رہتا
جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات ۳۴

اقبال کی طرح غالب بھی اس حقیقت کے متوالے ہیں کہ احساسات وجذبات ایک بہتا ہوا دریا ہوتے ہیں اگر انہیں بحر، وزن، قافیہ ردیف اور الفاظ کی قید میں جکڑ دیا جائے تو شاعر کے اندر جو تلاطم اور ہیجان برپا ہوتا ہے اس کی بھرپور تصویر کشی ممکن نہیں۔ ان کے خیال کے مطابق:

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابندِ نے نہیں ہے ۳۵

اقبال سے پہلے صرف غالب ہی ایسے شاعر تھے جو محض قافیہ پیمائی کو شاعری نہیں سمجھتے تھے۔ وہ معنی آفرینی پر نہ صرف زور دیتے تھے بلکہ خود بھی اس پر شدت سے قائم تھے:

غالب بنود شیوۂ من قافیہ بندی
ظلمی ست کہ بر کلک و ورق می کنم امشب ۳۶

غالب ورائے شاعری چیزے دگر" کے قائل تھے چنانچہ ایک خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:

"لعنت ہے مجھ پر اگر میں نے کوئی ریختہ یا اس کے قوافی پیش رکھ لئے ہوں۔ صرف بحر اور ردیف

قافیہ دیکھ لیا اور اس زمین میں غزل قصیدہ لکھنے لگا۔۔۔۔ بھائی شاعری معنی آفرینی ہے قافیہ پیمائی نہیں۔۔۔۔"۳۷

غالبؔ تخلیقِ شعر کے باب میں آورد کے قائل نہ تھے، نہ تصنّع و تکلّف اور لفظی شعبدہ گری کو پسند کرتے تھے۔ لکھنوی شعراء کی قافیہ پیمائی، محاورہ بندی، صنائع بدائع اور رعایتِ لفظی سے غالبؔ کو کوئی سروکار نہ تھا مرزا حاتم علی بیگ مہر کے نام ایک خط میں شعروسخن کی تعریف درج ذیل الفاظ میں کرتے ہیں:

"سخن ایک معشوقہ پری پیکر ہے۔ تقطیع شعر اس کا لباس اور مضامین اس کا زیور ہے۔ دیدہ وروں نے شاہدِ سخن کو اس لباس اور اس زیور میں روکشِ ماہِ تمام پایا ہے۔"۳۸

غالبؔ کی طرف اقبالؔ نے بھی جا بجا اس امر کی یقین دہانی کروانے کی کوشش کی ہے کہ ان کی شاعری کی بنیاد الفاظ و بیان پر نہیں بلکہ افکار و معانی پر استوار ہے۔ وہ کہتے ہیں:

حدیثِ بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھ کو
نہ کر خارا شگافوں سے تقاضا شیشہ سازی کا ۳۹

حسنِ الفاظ:

فن اظہارِ حسن ہے جس کا شیوہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس لئے ظاہر کرے کہ دوسرے اسے دیکھیں۔ غالبؔ نے کیا خوب کہا ہے کہ:

اسدؔ ارباب فطرت قدردانِ لفظ و معنی ہیں
سخن کا بندہ ہوں لیکن نہیں مشتاق تحسیں کا ۴۰

یا

حسن بے پروا خریدارِ متاعِ جلوہ ہے
آئینہ زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے ۴۱

عبدالغفور نساخ کو ایک خط میں ان ہی کے کلام کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"الفاظ متین، معانی بلند، مضامین عمدہ، بندش دل پسند، ہم فقر لوگ اعلائے کلمۃ الحق میں بے باک و گستاخ ہیں"۴۲

یہاں غالبؔ نے اپنا فنی مطمعٔ نظر بالکل واضح کر دیا ہے کہ وہ شعر کی اصل بنیاد تو معانی کو سمجھتے ہیں لیکن الفاظ کی خوبی اور اہمیت کو بھی فراموش نہیں کرتے۔ اسی لئے انہیں عُرفیؔ، ظہوریؔ اور بیدلؔ جیسے نکتہ دانوں سے خاص عقیدت رہی۔

اسدؔ ہر جا سخن نے طرح باغِ تازہ ڈالی ہے

مجھے رنگِ بہار ایجادیٔ بیدلؔ پسند آیا ۴۳

ظہوریؔ کے متعلق کہتے ہیں:

ہوں ظہوریؔ کے مقابل میں خفائیؔ غالبؔ

میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں ۴۴

اقبالؔ نے بھی تخیل و تفکر، لفظ و معنی اور آمد و آورد کے باہمی تعلق و تناسب پر جا بجا اظہار خیال کیا ہے لفظ و معنی کے باہمی ربط کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ارتباطِ حرف و معنی؟ اختلاطِ جان و تن

جس طرح اخگر قبا پوش اپنی خاکستر سے ہے ۴۵

اقبالؔ ''ارتباطِ حرف و معنی'' کو ''اختلاطِ جان و تن'' کہتے ہیں اور ان کے نزدیک اس اختلاط کی مثال چنگاری پر پڑی ہوئی راکھ کی ہے اس لئے لفظ کو معنی کا پردہ نہیں بلکہ اس کا آئینہ ہونا چاہیئے، اس لئے کہ اصلیت معنی کی ہے جس کی تابانی لباس الفاظ سے اس طرح پھوٹتی ہے جس طرح راکھ سے چنگاری۔ وہ مزید فرماتے ہیں۔

نغمہ گر معنی ندارد مردہ ایست

سوزِ او از آتشِ افسردہ ایست ۴۶

غالبؔ اور اقبالؔ دونوں کے یہاں خیالات کی گہرائی کے باوجود تراکیب اور بندشوں کے انتخاب میں بھی ایک خاص سلیقہ اور توازن نظر آتا ہے کیونکہ شعر کا طلسم اور سحر لفظ اور معنی کے مجموعی اثر میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ غالبؔ ہوں یا اقبالؔ دونوں نے اپنی شاعری میں علم معنی اور علم بیان میں مہارت کو ملحوظ رکھا بقول ڈاکٹر یوسف حسین خان:

''غالبؔ اور اقبالؔ شاعری کو آتشؔ کی طرح مرصّع سازی نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کے نزدیک یہ ایک روحانی چیز تھی جس کا سرچشمہ وجدان اور ماورائے تعقل ہے''۔ ۴۷

اقبالؔ کے یہاں ہیئت برائے ہیئت کی مخالفت بڑے واضح انداز میں ملتی ہے ان کے خیال میں فنکار کے لئے

لازم ہے کہ وہ زندگی کا دور سے تماشا کرنے پر اکتفانہ کرے بلکہ اس کی دوڑ دھوپ میں خود بھی شریک ہو۔اس کے بغیر فن مصنوعی اور اجتماعی قدروں کے لئے ہلاکت کا موجب ہوگا۔

نہ جدا رہے نوا گر تب و تاب زندگی سے
کہ ہلاکئی امم ہے یہ طریق نے نوازی ۴۸؎

اقبالؔ کے نزدیک فنکار کا اصل کمال یہ ہے کہ وہ نہ صرف فطرت سے فائدہ اٹھائے بلکہ اسے جمیل تر صورت میں پیش کرے۔

جمیل تر ہیں گل ولالہ فیض سے اس کے
نگاہِ شاعر رنگیں نوا میں ہے جادو ۴۹؎

اقبالؔ فنِ شاعری کے ذریعے ایک نئی دنیا کی تخلیق کے آرزو مند ہیں اگر شاعر اپنے تخیل سے زندگی کی حقیقت کو نہیں سمجھتا یا زندگی کو فروانی نہیں بخشتا تو وہ بے مصرف اور بے کار ہے۔

سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عینِ حیات
ہو نہ روشن تو سخن مرگِ دوام اے ساقی ۵۰؎

شعلہ نوائی:

اقبالؔ کے نزدیک حقیقی شاعر وہ ہے جو اپنے اظہار کی توانائی اور جوشِ عشق کی بدولت اپنے دل و دماغ پر ایسی کیفیت طاری کرے جسے بیان کرنے پر وہ خود مجبور ہو جائے۔یہی کیفیت فن کی جان ہے کہ اس میں جلالی و جمالی پہلو ساتھ ساتھ ہوں۔

دلبری بے قاہری جادو گریست
دلبری با قاہری پیغمبریست ۵۱؎

ڈاکٹر یوسف حسین خان کے خیال کے مطابق:

''اقبالؔ اپنے آرٹ کو جن مقاصد کے لئے وقف کرتا ہے اس کی وجہ سے اس کے کلام میں غیر معمولی عظمت اور تاثیر پیدا ہوگئی ہے وہ اپنی شعلہ نوائی کے ذریعے اپنے دل کی خلش کو دور کرتا ہے۔۵۲؎

غزلے زدم کہ شاید بنوا قرار م آید
تپ شعلہ کم نہ گردد ز گسستن شرارہ'' ۵۳

اقبالؔ کا کہنا ہے کہ شعر کے ذریعے وہ اپنے دل کی بھڑکتی ہوئی آگ میں سے صرف ایک شرارہ باہر پھینک سکا ہے باقی آگ اب بھی سینے میں موجود ہے۔ نظم ''عبدالقادر کے نام جو'' بانگِ درا'' کے دوسرے حصے میں شائع ہوئی اس میں بھی اقبالؔ اپنے شعری منصوبے کا منشور پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اٹھ کے ظلمت ہوئی پیدا افقِ خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں ۵۴

یعنی وہ اپنی گرمیِ گفتار سے زندگی کی نئی روح تخلیق کرنا چاہتے تھے۔

اندھیری شب ہے، جدا اپنے قافلے سے ہے تُو
ترے لئے ہے مرا شعلۂ نوا قندیل ۵۵

یا

عزیز تر ہے متاعِ امیر و سلطاں سے
وہ شعر جس میں ہو بجلی کا سوز و برّاقی ۵۶

اقبالؔ سے پیشتر غالبؔ نے بھی اپنے ''سخنِ گرم'' کا جابجا ذکر کیا ہے اور بعض فارسی شعروں میں یہ مضمون بھی باندھا ہے کہ شعر کہتے وقت میرا دل پگھل کر ایک آگ کے دریا کے مثل ہو جاتا ہے جس سے میں اپنی شعری تخلیق کے لئے حرارت مستعار لیتا ہوں۔

بینیم از گداز دل در جگر آتشے چو سیل
غالبؔ اگر دمِ سخن رہ بہ ضمیر من بری ۵۷

غالبؔ کے اُردو کلام میں بھی ''آگ'' کے ان گنت روپ ملتے ہیں جن کے اظہار سے ان کے کلام میں روشنی اور حرارت کا احساس نمایاں نظر آتا ہے۔ مثلاً یہ اشعار ملاحظہ کیجئے:

لکھتا ہوں اسدؔ سوزشِ دل سے سخن گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت ۵۸

عرض کیجئے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں

کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا ۵۹

مجھے انتعاشِ غم نے پئے عرض حال بخشی

ہوسِ غزل سرائی، تپشِ فسانہ خوانی ۶۰

ہوں گرمی نشاطِ تصور سے نغمہ سنج

میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں ۶۱

آتش پرست کہتے ہیں اہل جہاں مجھے

سرگرمِ نالہ ہائے شرر بار دیکھ کر ۶۲

غالبؔ اور اقبالؔ دونوں کو اس بات کا احساس ہے کہ شعلہ نوائی سے خیالی پیکروں کو زندۂ جاوید بنایا جا سکتا ہے لیکن بعض اوقات جذبے کی تخلیق پھول کی طرح ہوتی ہے جو دل میں کھلتا ہے اور اکثر وہیں مرجھا کے ختم ہو جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری زباں خواہ کتنی منجھی ہوئی کیوں نہ ہو اس میں یہ صلاحیت نہیں کہ روح کے تاروں میں بیدار نغموں کو ظاہر کر سکے اقبالؔ اس مضمون کو یوں ادا کرتے ہیں:

ہر معنئ پیچیدہ در حرف نمی گنجد

یک لحظہ بہ دل در شو شاید کہ تو دریابی ۶۳

اسی مضمون کو غالبؔ یوں پیش کرتے ہیں:

سخنِ ما ز لطافت نہ پذیرد تحریر

نشود گرد نمایاں ز رمِ توسنِ ما ۶۴

یا

ہجوم فکر سے دل مثلِ موج لرزے ہے
کہ شیشہ نازک و صہبائے آبگینہ گداز ۶۵

یہاں تک کہ بعض اوقات شاعر کو اپنی زندگی بھی داؤ پر لگانا پڑتی ہے:

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشے میں ہے
آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے ۶۶

''دل گداختہ'' خونِ جگر:

فن اور کمالِ فن کے سلسلے میں غالبؔ اور اقبالؔ دونوں ہی نے سوز و گداز اور خلوص کو کمالِ فن کا منبع قرار دیا ہے غالبؔ اس حقیقت سے باخبر تھے کہ ''دلِ گداختہ'' کے بغیر ''حسنِ فروغ شمع سخن'' کسی طور ممکن نہیں۔ میرؔ کی شاعری میں جذبے کی جو گہرائی اور گرمی ہے وہ اسی ''دلِ گداختہ'' کا فیضان ہی تو ہے۔

حسنِ فروغِ شمع سخن دور ہے اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی ۶۷

غالبؔ کے ''دلِ گداختہ'' کو اقبالؔ نے اپنی شاعری میں ''خونِ جگر'' سے تعبیر کیا ہے۔ خونِ جگر سے مراد فنکار کا خلوص ہے جس کی پرورش جذبے کی آغوش میں ہوتی ہے اپنی نظم ''مسجدِ قرطبہ'' میں اقبالؔ فرماتے ہیں کہ معجزہ ہائے ہنر آنی و فانی ہیں سوائے ان کے جن کی تہہ میں خلوص اور خونِ جگر کی آمیزش ہو:

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صورت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود
قطرۂ خونِ جگر، سِل کو بناتا ہے دل
خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود ۶۸

نقش ہیں سب نا تمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر ۶۹

نغمہ وشعر کی تاثیر کا راز نے نواز اور شاعر کے دل میں تلاش کرنا چاہیئے کیونکہ حقیقی شاعر کا ہر مصرعہ اس کے دل کا قطرۂ خون ہوتا ہے۔

آیا کہاں سے نالۂ نے میں سرورِ مے
اصل اس کی نے نواز کا دل ہے کہ چوبِ نے
جس روز دل کے رمز مغنی سمجھ گیا
سمجھو تمام مرحلہ ہائے ہنر ہیں طے[1]

جب صاحبِ ساز کا لہو رگِ ساز میں رواں ہو تو نغمے کا زیر و بم دلوں کی تسخیر کی ضمانت بن جاتا ہے:

خونِ دل و جگر سے ہے میری نوا کی پرورش
ہے رگِ ساز میں رواں صاحبِ ساز کا لہو[1]

یا

ع مصرعِ من قطرۂ خونِ من است[2]

جب تک کوئی نظریہ یا فلسفہ دل کی گہرائیوں میں اتر کر جذبے کی آنچ سے پگھل نہ جائے فن کے سانچے میں نہیں ڈھل سکتا۔

فن اگر سوزے ندارد حکمت است
شعرمی گردد چو سوز از دل گرفت[3]

یا

یا مردہ ہے یا نزع کے عالم میں گرفتار
جو فلسفہ لکھا نہ گیا خونِ جگر سے[4]

صد نالۂ شبگیرے، صد صبحِ بلا خیزے
صد آہِ شرر ریزے، یک شعرِ دلآویزے[5]

علامہ اقبال گرامی کو ایک خط میں تخلیقِ شعر کی بابت لکھتے ہیں۔

''شاعری کی جگر کاوی کا اندازہ عام لوگ نہیں لگا سکتے۔ ان کے سامنے شعر بنا بنایا آتا ہے۔ وہ اس روحانی اور لطیف کرب سے آشنا نہیں ہو سکتے جس نے الفاظ کی ترتیب پیدا کی۔ جہاں اچھا شعر دیکھو، سمجھ لو کہ کوئی نہ کوئی مسیح مصلوب ہوا ہے۔ اچھے خیال کا پیدا کرنا اوروں کے لئے کفارہ ہوتا ہے۔''[۶]

اس سے اقبالؔ کے خلوص کا اظہار ہوتا ہے وہ اپنی شاعری کو مافی الضمیر کے اظہار کا ایک ذریعہ خیال کرتے تھے۔ اقبالؔ سے پیشتر غالبؔ کے یہاں شاعری کی جگر کاوی کا ذکر منشی شیو نرائن آرام کے نام ایک خط میں کچھ یوں ہوتا ہے۔

''کل آپ کا خط آیا۔ رات بھر میں نے فکرِ شعر میں خونِ جگر کھایا۔ اکیس شعروں کا قصیدہ کہہ کر تمہارا حکم بجالایا۔ خدا کرے تمہیں پسند آئے میری محنت کی داد مل جائے گی۔''[۷]

ڈاکٹر یوسف حسین خان کے خیال میں:

''زندگی ایک حسین قدر ہے۔ شاعر کا سینہ تجلی زارِ حسن ہوتا ہے اس کے دل میں کائنات کے حسین ترین اوصاف کا عکس موجود ہوتا ہے۔ بغیر جلوۂ حسن کے وہ تخلیق شعری نہیں کر سکتا تخلیق کا شوق شاعر کو مجبور کرتا ہے کہ وہ موزونیت کو ہاتھ سے نہ جانے دے اس موزونیت کا شعور جس قدر ہوگا اسی قدر اس میں تخلیقِ حسن کی صلاحیت زیادہ ہوگی۔''[۸]

غالبؔ اور اقبالؔ دونوں کے ہاں یہی قدر مشترکہ طور پر موجود ہے۔ غالبؔ فرماتے ہیں:

سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویا ہوں جواہر کے
جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو[۹]

اسی خیال کا اظہار علامہ اقبالؔ کچھ یوں کرتے ہیں:

حُسن کا گنجِ گرانمایہ تجھے مل جاتا
تو نے فرہاد نہ کھودا کبھی ویرانۂ دل[۱۰]

رمزیت و ایمائیت:

رمزیت و ایمائیت شاعری کو پرُلطف اور بامزہ بناتی ہے۔ نطشے کے خیال کے مطابق:

جو چیز ہمہ گیر ہوتی ہے وہ اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ چھپانے کی کوشش کرتی ہے۔ چنانچہ شاعری لفظوں کا آرٹ ہے شاعر کا ایک ایک لفظ اپنے اندر ایک جہانِ معنی سمیٹے ہوئے ہوتا ہے یہی ایمائیت شاعری کی جان ہے۔ غالبؔ اپنے اشعار میں آنے والے ایک ایک لفظ کو ''گنجینۂ معنی کا طلسم'' قرار دیتے ہیں اسی لئے ان کے اشعار ذو معنی اور پہلودار ہوتے ہیں۔ جس قدر الفاظ کے طلسم کو کھولا اور سمجھا جاتا ہے اسی قدر نئے نئے مطالب دریافت ہوتے ہیں۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اُس کو سمجھئے

جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے ۸۱؎

غالبؔ نے اپنے اشعار میں بہت سی باتیں رمز و ایما کے پیرائے میں بیان کی ہیں اور بادہ و ساغر کے پردے میں مشاہدۂ حق کی گفتگو کی ہے:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

مقصد ہے ناز و غمزہ و لے گفتگو میں کام

چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر ۸۲؎

غالبؔ کا کلام علامتوں اور اشارتوں کا ایک نگار خانہ ہے جس میں ان کے نادرہ کار تخیل نے اچھوتے رنگ بھرے ہیں وہ ''شاہدِ سخن'' کو رمزیت و ایمائیت کے پردے میں روپوش رکھنا ہی مناسب سمجھتے تھے۔ غالبؔ کے بعد اقبالؔ نے بھی رمز و ایما کو اپنی شاعری کا جوہر بنایا۔ ان کے نزدیک شاعر اپنی بات ''در حدیثِ دیگراں'' بیان کرتا ہے اور بلاغت کا کمال بھی یہی ہے یعنی

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا

حرفِ تمنا جسے کہہ نہ سکیں روبرو ۸۳؎

رمز و ایما کی بدولت شاعر کے محدود مشاہدے میں بے پایانی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اقبالؔ کے خیال میں شعر کا مطلب محدود نہیں ہونا چاہئے کیونکہ حقیقی شعر زندگی کی طرح لامتناہی و بے کراں ہوتا ہے۔ رمز و ایماء کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

برہنہ حرف نگفتن کمالِ گویائی است

حدیثِ خلوتیاں جُز بہ رمز وایمانیست ۸۴

ابلاغ:

شاعری میں رمز وایما کی ضرورت اور اہمیت سمجھنے کے باوصف غالبؔ اور اقبالؔ دونوں شعر کو چیستان بنانے کے قائل نہ تھے۔ غالبؔ کے نزدیک حسنِ بیان کی اس سے بہتر تعریف نہیں ہوسکتی کہ جو بات قائل کے منہ سے نکلے وہ سامع کے دل میں اس طرح اتر جائے کہ اس کو یہ شبہ ہو کہ یہ بات تو پہلے ہی سے میرے دل میں بھی موجود تھی۔

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اس نے کہا

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے ۸۵

علامہ اقبالؔ بھی شعروشاعری کو اپنے فکر وخیال کے ابلاغ کا ذریعہ سمجھتے تھے محمد دین فوق کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

''میرا مقصود شاعری سے شاعری نہیں بلکہ یہ ہے کہ اوروں کے دلوں میں بھی وہی خیالات موجزن ہو جائیں جو میرے دل میں ہیں اور بس''۔ ۸۶

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

''میرا مقصود گاہ گاہ نظم لکھنے سے صرف اسی قدر ہے کہ چند مطالب جو میرے ذہن میں ہیں ان کو مسلمانوں تک پہنچادوں اور بس۔'' ۸۷

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا

غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے ۸۸

اقبالؔ کے نزدیک فن وہی ہے جو زندگی بخش اور زندگی کا ترجمان ہو۔ ان کے خیال میں شاعری مقصود بالذات نہیں بلکہ یہ زندگی کی اعلیٰ قدروں کے حصول کا ایک ذریعہ ہے اور جو شاعری اس معیار پر پوری نہیں اترتی وہ مذموم ہے اسے مسترد کردینا چاہیئے۔ ان کی نظم ''فنونِ لطیفہ'' اسی نظریہ شاعری کی غمّاز ہے۔

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر، خوب ہے لیکن

جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

مقصودِ ہنر، سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا ۸۹

اقبالؔ کی نظر میں ان شاعروں اور فنکاروں کی کوئی وقعت نہیں ہے جو محض تفریحِ طبع اور عشقیہ جذبات میں ہیجان پیدا کرنے کے لئے شعر کہتے ہیں۔ انہیں ہند کے شعراء سے یہی شکایت تھی کہ ان کے فن میں وہ حرارت و تابنا کی نہیں جو ''عروقِ مردۂ مشرق'' میں زندگی کی لہر دوڑا سکے۔ ضربِ کلیم کی نظم ''ہنرورانِ ہند'' میں فرماتے ہیں۔

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل اِن کا
ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار
چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ، بدن کو بیدار
ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ! بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار ۹۰

اقبالؔ سے پہلے غالبؔ بھی فن کے امکانات اور اس کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرما گئے تھے کہ:

ہر بُنِ مو سے دمِ ذکر نہ ٹپکے خوں ناب
حمزہ کا قصّہ ہوا، عشق کا چرچا نہ ہوا
قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کُل
کھیل لڑکوں کا ہوا، دیدۂ بینا نہ ہوا ۹۱

غالبؔ نے اردو شاعری کو جو نیا آہنگ بخشا اس میں بڑا طنطنہ و طمطراق ہے۔ غالبؔ سے پہلے اردو شاعری میں جو نسائیت، افسردگی اور انفعالیت در آئی تھی غالبؔ نے نہ صرف اسے دور کیا بلکہ اپنی رجائیت اور آرزومندی سے اسے

ایک پُر اعتماد اور پُر جلال شعری آہنگ بھی بخشا۔ غالبؔ کی نوائے گرم میں جو مردانگی اور وقار تھا اُسے اقبالؔ نے ''بانگِ درا'' اور ''نوائے جرس'' بنا کر اجتماعی مقاصد کے لئے برتا اور غالبؔ کی رکھی ہوئی بنیاد پر ایک ایسا رجائیت آمیز تصورِ فن پیش کیا جس نے شاعری کا دھارا بدل کر رکھ دیا۔

فن اور خودی:

ڈاکٹر یوسف حسین خان ''روحِ اقبالؔ'' میں رقمطراز ہیں:

''اقبالؔ کا آرٹ کا نظریہ اس کے فلسفۂ خودی کے تابع ہے۔ اس کے نزدیک آرٹ خودی کے اظہار کا ایک وسیلہ ہے اور وہ آرٹ جس میں خودی باقی نہیں رہتی کوئی مستحسن چیز نہیں۔ چنانچہ اس نے اپنے اس اصول کا اطلاق فنِ اداکاری پر کیا ہے اپنی نظم ''تیاتر'' میں اس نے بتایا ہے کہ اداکاری کا کمال یہ ہے کہ خودی باقی نہ رہے لیکن اگر خودی نہ رہی تو آرٹ کی تخلیق کیسے ہو سکتی ہے؟''[۹۲]

اس ضمن میں اقبالؔ کے اشعار ملاحظہ فرمایئے نظم کا عنوان ہے ''تیاتر''۔

تری خودی سے ہے روشن ترا حریمِ وجود
حیات کیا ہے اسی کا سرور و سوز و ثبات
حریم تیرا، خودی غیر کی! معاذ اللہ
دوبارہ زندہ نہ کر کاروبارِ لات و منات
یہی کمال ہے تمثیل کا کہ تُو نہ رہے
رہا نہ تُو، تو نہ سوزِ خودی نہ سازِ حیات[۹۳]

اپنی نظم ''دین و ہنر'' میں اسی خیال کا اظہار یوں کرتے ہیں:

سرود و شعر و سیاست، کتاب و دین و ہنر
گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عینِ حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ
ہوئی ہے زیرِ فلک اُمتوں کی رُسوائی
خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ[۹۴]

اقبالؔ کے نزدیک فن وہ ہے جو دلوں میں مستقل تلاطم اور ابدی زندگی کا سوز وساز پیدا کرے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب شاعر یا مغنی کا نفس خودی کا داعی ومحافظ ہو۔ وہ نغمہ یا شعر جو زندگی کی قوتوں کو لوریاں دے دے کر سُلا دے یا حسرت وحرمان سے لبریز ہو وہ ان کے نزدیک ''سرودِ حرام'' ہے۔ اپنی نظم ''شعرِ عجم'' میں فرماتے ہیں:

ہے شعرِ عجم گرچہ طرب ناک و دلآویز
اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیرِ خودی تیز
افسردہ اگر اس کی نوا سے ہو گلستاں
بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغِ سحر خیز ۹۵

اپنی نظم ''سرودِ حرام'' میں فرماتے ہیں:

اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام
حرام میری نگاہوں میں نائے و چنگ و رباب ۹۶

اقبالؔ کے نزدیک ہر فن کا مقصد زندگی کے حسن کو نکھارنا اور فرد اور معاشرے کو پستی سے بلندی کی طرف لے جانا ہے۔ اسے حیاتِ ابدی کا سوز بخشنا، انقلاب کی لذت سے آشنا کرنا اور ہر آن ایک نئے دور کی جستجو میں سرگرمِ عمل اور متحرک رکھنا اسی کا کام ہے۔ ''سرودِ حلال'' میں فرماتے ہیں۔

کھل تو جاتا ہے مغنی کے بم و زیر سے دل
نہ رہا زندہ و پائندہ تو کیا دل کی کشود
ہے ابھی سینۂ افلاک میں پنہاں وہ نوا
جس کی گرمی سے پگھل جائے ستاروں کا وجود
جس کی تاثیر سے آدم ہو غم و خوف سے پاک
اور پیدا ہو ایازی سے مقامِ محمود ۹۷

مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ غالبؔ کے رجائیت آمیز لب و لہجے نے اقبالؔ کی فکرِ بلند کو ایک نئی راہ دکھائی اور انہوں نے ایک زندہ اور زندگی بخش تصورِ فن پیش کیا۔ جمالیات زندگی سے الگ کوئی غیر حقیقی یا ماورائی چیز نہیں دونوں شعراء کا فن اس لئے زندہ و پائندہ ہے کہ اس کی جڑیں زندگی میں پیوست ہیں اور دونوں شعراء کی شاعری نغمۂ حیات سے ہم آہنگ ہے بقول اقبالؔ

اہلِ زمیں کو نسخۂ زندگیِ دوام ہے
خونِ جگر سے تربیت پاتی ہے جو سخنوری ۹۸

حوالہ جات

۱۔ اقبالؔ، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبالؔ اُردو ، صفحہ۵۹۴

۲۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اقبالؔ سب کے لئے (کراچی: اُردو اکیڈمی، طبع اول، ۱۹۷۸ء) صفحہ۲۱۰

۳۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ۲۸۷

۴۔ حالیؔ، یادگارِ غالبؔ، صفحہ۱۲۵

۵۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ۷۷

۶۔ ایضاً، صفحہ۳۲۷

۷۔ ایضاً، صفحہ۲۸۳

۸۔ ایضاً، صفحہ۱۳۸

۹۔ ایضاً، صفحہ۲۸۸

۱۰۔ غالبؔ، کلیاتِ غالبؔ فارسی، جلد سوم، صفحہ۲۹۳

۱۱۔ اقبالؔ، بانگِ درا، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ۱۳۲

۱۲۔ ایضاً، صفحہ۲۶

۱۳۔ ایضاً، صفحہ۱۱۴

۱۴۔ مجنوں گورکھ پوری، اقبالؔ، (گورکھ پور: ایوانِ اشاعت، س۔ن) صفحہ۸۹

۱۵۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ۲۵۶

۱۶۔ عبدالرحمٰن بجنوری، ڈاکٹر، محاسنِ کلامِ غالبؔ مقدمہ دیوانِ غالبؔ جدید المعروف، نسخۂ حمیدیہ ،(آگرہ: مفیدِ عام پریس۔ س۔ن) صفحہ۳۳

۱۷۔ غالبؔ۔ دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ۱۱۵

۱۸۔ غالبؔ، کلیاتِ غالبؔ فارسی، جلد سوم، صفحہ۴۰۸

۱۹۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ۱۷۶۔

۲۰۔ ایضاً، صفحہ۱

۲۱۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اردو، صفحہ ۳۴۳

۲۲۔ ایضاً، صفحہ ۳۳۰

۲۳۔ ایضاً، صفحہ ۳۴۰

۲۴۔ ایضاً، صفحہ ۳۴۴

۲۵۔ اقبالؔ، اسرارِ خودی، کلیاتِ اقبالؔ فارسی، صفحہ ۱۷

۲۶۔ اقبالؔ، مکاتیبِ اقبالؔ مرتبہ عطااللہ ، شیخ، اقبالؔ نامہ، جلد اوّل (علی گڑھ: ادارۂ اقبالؔ۔س۔ن) صفحہ ۱۰۸

۲۷۔ اقبالؔ، زبورِ عجم، کلیاتِ اقبالؔ فارسی، صفحہ ۴۴۷

۲۸۔ اقبالؔ، ارمغانِ حجاز، کلیاتِ اقبالؔ فارسی، صفحہ ۸۹۴

۲۹۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اردو، صفحہ ۳۴۳

۳۰۔ اقبالؔ، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبالؔ اردو، صفحہ ۵۳۶

۳۱۔ اقبالؔ، جاوید نامہ، کلیاتِ اقبالؔ فارسی، صفحہ ۶۳۲

۳۲۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۳۵۷

۳۳۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۱۶۸

۳۴۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۳۹۹

۳۵۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۲۶۸

۳۶۔ غالبؔ، کلیاتِ غالبؔ فارسی، جلد سوم، صفحہ ۵۶

۳۷۔ غالبؔ، خطوطِ غالبؔ مرتبہ غلام رسول مہر، صفحہ ۱۶۳

۳۸۔ ایضاً، صفحہ ۵۷۳۔۵۷۴

۳۹۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۳۲۴

۴۰۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۳۸

۴۱۔ ایضاً، صفحہ ۱۹۷

۴۲۔ غالبؔ، خطوطِ غالبؔ مرتبہ غلام رسول مہر، صفحہ ۴۸۴
۴۳۔ غالبؔ، دیوانِ غالب جدید، صفحہ ۳
۴۴۔ ایضاً، صفحہ ۱۳۴
۴۵۔ اقبالؔ، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبالؔ اردو، صفحہ ۵۱۷
۴۶۔ اقبالؔ، زبورِ عجم، کلیاتِ اقبالؔ فارسی، صفحہ ۵۷۷
۴۷۔ یوسف حسین، ڈاکٹر، خان، روحِ اقبالؔ، صفحہ ۳۶
۴۸۔ اقبالؔ، زبورِ عجم، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۵۳۶
۴۹۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۳۰۵
۵۰۔ ایضاً، صفحہ ۳۰۴
۵۱۔ اقبالؔ، زبورِ عجم، کلیاتِ اقبالؔ فارسی، صفحہ ۵۸۷
۵۲۔ یوسف حسین، ڈاکٹر، خان، روحِ اقبالؔ، صفحہ ۳۴
۵۳۔ اقبالؔ، زبورِ عجم، کلیاتِ اقبالؔ فارسی، صفحہ ۴۰۶
۵۴۔ اقبالؔ، بانگِ درا، کلیات اقبالؔ اُردو، صفحہ ۱۳۲
۵۵۔ اقبالؔ، بال جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۳۵۵
۵۶۔ ایضاً، صفحہ ۳۵۸
۵۷۔ غالبؔ، کلیاتِ غالبؔ فارسی، جلد سوم، صفحہ ۳۷۰
۵۸۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۵۵
۵۹۔ ایضاً، صفحہ ۲۳
۶۰۔ ایضاً، صفحہ ۳۰۹
۶۱۔ ایضاً، صفحہ ۱۲۲
۶۲۔ ایضاً، صفحہ ۷۶
۶۳۔ اقبالؔ، پیامِ مشرق، کلیاتِ اقبالؔ فارسی، صفحہ ۳۰۳

۶۴۔ غالبؔ، کلیاتِ غالبؔ فارسی ، جلد سوم، صفحہ ۱۵

۶۵۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۸۰

۶۶۔ ایضاً، صفحہ ۲۴۵

۶۷۔ ایضاً، صفحہ ۱۹۸

۶۸۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۳۸۶

۶۹۔ ایضاً، صفحہ ۳۹۳

۷۰۔ اقبالؔ، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۵۷۶

۷۱۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۴۰۵

۷۲۔ اقبالؔ، پیامِ مشرق، کلیاتِ اقبالؔ فارسی، صفحہ ۱۸۷

۷۳۔ ایضاً، صفحہ ۲۷۶

۷۴۔ اقبالؔ، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبالؔ فارسی، صفحہ ۵۰۴

۷۵۔ اقبال

۷۶۔ ایس۔ایم منہاج الدین ، ڈاکٹر ، افکار و تصوراتِ اقبالؔ ، (ملتان: کاروانِ ادب، اشاعت اول ، ۱۹۸۵ء) صفحہ ۵۵

۷۷۔ غالبؔ، مکاتیب غالبؔ، مرتبہ غلام رسول مہر، صفحہ ۱۹۸

۷۸۔ یوسف حسین، ڈاکٹر، خان، روحِ اقبالؔ، صفحہ ۳۶

۷۹۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۱۴۹

۸۰۔ اقبالؔ، بانگِ درا، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۶۱

۸۱۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۲۶۲

۸۲۔ ایضاً، صفحہ ۷۵

۸۳۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۳۸۴

۸۴۔ اقبالؔ، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبالؔ فارسی، صفحہ ۱۶۰

۸۵۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۲۴۶

۸۶۔ ایس۔ ایم منہاج الدین، ڈاکٹر، افکار و تصوراتِ اقبالؔ، صفحہ ۳۳

۸۷۔ ایضاً، صفحہ ۳۳

۸۸۔ اقبالؔ، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۵۰۴

۸۹۔ اقبالؔ، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۵۸۰

۹۰۔ ایضاً، صفحہ ۵۹۱

۹۱۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۴۶

۹۲۔ یوسف حسین، ڈاکٹر، خان، روحِ اقبالؔ، صفحہ ۴۳

۹۳۔ اقبالؔ، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۵۶۸

۹۴۔ ایضاً، صفحہ ۵۶۲

۹۵۔ ایضاً، صفحہ ۵۹۰

۹۶۔ ایضاً، صفحہ ۵۸۸

۹۷۔ ایضاً، صفحہ ۵۸۷

۹۸۔ اقبالؔ، بانگِ درا، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۲۱۱

کلامِ غالبؔ و اقبالؔ
میں تحرّک، سخت کوشی اور خاراشگافی

کلامِ غالبؔ و اقبالؔ میں تحرّک، سخت کوشی اور خاراشگافی

غالبؔ اور اقبالؔ میں فکری ہم آہنگی اور ذہنی مطابقت کی ایک اور صورت دونوں شعراء کے کلام میں حرکت و حرارت، جوش انگیزی اور فعالیت ہے۔ گو غالبؔ کا دور شکست و ریخت کی ہولناکیوں سے عبارت تھا لیکن انہوں نے اپنی فکرِ رسا سے کام لے کر انفعالیت کی بجائے حرکی تصورات پیش کئے اور آنے والے شعراء کے لئے انقلابی سمتوں کا تعین کیا جب متحرک جمالیات کی یہ روایت اقبالؔ تک پہنچی تو غالبؔ کی نوائے گرم اور لہجے کی مردانگی نے انہیں بھی نئے خطوط پر سوچنے پر مجبور کر دیا کیونکہ یہ انداز اقبالؔ کو اپنی مخصوص مقصدیت کے ابلاغ کے لئے موزوں نظر آیا۔ غالبؔ نے اپنے بارے میں بجا طور پر کہا تھا کہ:

ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں [1]

جب کہ اقبالؔ اپنی شاعری کے بارے میں کچھ یوں گویا ہوئے:

ہر درد مند دل کو رونا مرا رُلا دے
بے ہوش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگا دے [2]

یا

ایک بُلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک
اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک [3]

ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے مقالے ''غالبؔ...... پیشروِ اقبالؔ'' میں غالبؔ اور اقبالؔ کے مشترکہ افکار و نظریات اور خصائص کی درجہ بندی کرتے ہوئے جو فہرست پیش کی ہے اس میں غالبؔ کی جوش انگیزی، ارتقائے حیات کے لئے سخت کوشی اور خاراشگافی کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا ہے۔ ان کے خیال میں اسی جوش انگیزی اور خاراشگافی کے سبق کو اقبالؔ کی اصطلاح میں ''ستیز'' کہا جا سکتا ہے۔[4]

علامہ اقبالؔ کو پیغمبرِ حرکت و حرارت کہا گیا ہے کیونکہ حرکت و اضطراب ان کا پسندیدہ مضمون ہے جو ان کے کلام میں اوّل تا آخر جاری و ساری نظر آتا ہے بقول مولانا صلاح الدین احمد

''حرارت و حرکت شعرِ اقبالؔ کا اہم ترین اور عظیم ترین عنصر ہے اور اس میں قطعاً کوئی کلام نہیں کہ

اقبالؔ کی شاعری کا حسن وامتیاز اور اس کے پیغام کی سطوت وصولت اسی کے جمال سے مستنیر اور اسی کی قوت سے آفاق گیر ہے'' ۵

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی رائے میں:

''اقبالؔ کے پیغام کی اساس سعی مسلسل اور عمل پیہم پر ہے اور یہ سعیِ مسلسل وعملِ پیہم عبارت ہے، نصب العین سے اس شدید لگاؤ اور گہری وابستگی کا جس کے بارے میں غالبؔ نے حکم لگایا ہے کہ:

وفا داری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے

مَرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو'' ۶

غالبؔ اور اقبالؔ دونوں ذوقِ عمل اور امکانات کے شاعر ہیں دونوں کے ہاں مایوسی اور ناامیدی کے موضوعات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ دونوں کے یہاں متحرک امیجری ہے، سکون وآرام طلبی کا نام نہیں، جدت، ندرت، تازگی، توانائی، حرارت وحرکت اور آرزومندی دونوں شعراء کے شعری تناظر میں موجود ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ غالبؔ کے یہاں اس کی نوعیت انفرادی تجربے کی سی ہے جب کہ اقبالؔ کا مقصد زندگی کے نئے امکانات اور نئی معنویت کی دریافت ہے:

آفرینند کائناتِ دیگرے

قلب را بخشد حیاتِ دیگرے ۷

ڈاکٹر اے۔ بی اشرف غالبؔ اور اقبالؔ کی شاعری میں تحرک کے پہلو کا جائزہ لیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''۔۔۔۔اسلوبیاتی سطح پر غالبؔ متحرک جمالیات کا حامل ہے بے شک وہ زندگی کو فانی تصور کرتا ہے لیکن اس کا تصور حیات بڑا حرکی اور فعال ہے اس لحاظ سے وہ اقبالؔ کے حرکی فلسفے کے قریب تر ہے دونوں کے یہاں زندگی میں حرکت پیدا کرنے کے لئے آرزوؤں اور تمناؤں کا ہجوم ہے۔۔۔

حرکت وعمل کا فلسفہ اقبالؔ کے عمرانی نظریات کا ناگزیر حصّہ تھا جب کہ غالبؔ سکون آشنا نظامِ جاگیرداری کے ردعمل کے طور پر حرکت کی تمنا کرتے ہیں۔ اس جمود وتعطل کے شکار معاشرے میں حرکت وعمل کی پرچھائیں دیکھنا اُن کے لئے ندرت کا باعث بنتا ہے لیکن یہ شوقِ عمل کسی اجتماعی ضابطے کا پابند نہیں۔ اقبالؔ عمل کو زندگی کی ابدیت کا ضامن بناتے ہیں غالبؔ کے نزدیک بھی اس دائمی حرکت وعمل کا محرک انسانی تمنا اور آرزو ہے اور اقبالؔ کے نزدیک بھی لیکن دونوں میں فرق

مقصد کا ہے۔'' ۸ے

غالبؔ کا تصورِ عشق اور فلسفۂ زندگی دونوں حرکت و عمل سے عبارت ہیں۔ غالبؔ کی شاعری میں حرکت و عمل ان کے ذاتی اضطراب اور شخصیت کے عرفان کی بدولت ہے اس کا کوئی اجتماعی مقصد نہیں۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان کی رائے کے مطابق:

''متحرک تصورات اور علامتی پیکر غالبؔ کے اردو دیوان اور فارسی کلیات میں بکھرے پڑے ہیں اگر کوئی تجزیہ کرنے بیٹھے تو اس کا سارا کلام متحرک علامتوں اور پیکروں کی داستان معلوم ہوتا ہے جنہیں طرح طرح سے پیش کیا گیا ہے یہی ''گنجینۂ معنی کا طلسم'' ہے جس کی طرف اس نے اشارہ کیا ہے۔ اس کی کارگاہِ خیال میں متحرک تصاویر ہمیں قدم قدم پر نظر آتی ہیں جو زندگی کی حرکت و عمل کی غمازی کرتی ہیں۔ کہیں سکون طلبی نہیں ملے گی''۔ ۹ے

غالبؔ کے درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجئے۔ جن میں متحرک خیالات، ذوق و شوق، تمنا اور دائمی اضطراب اور آرزومندی کا اظہار ہر لفظ سے عیاں ہے۔

اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعدِ مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پانو ۱۰ے

یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا
جادہ، اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا ۱۱ے

بسکہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا ۱۲ے

احباب چارہ سازئ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا ۱۳ے

خیالِ مرگ کب تسکیں دل آزردہ کو بخشے
مرے دامِ تمنا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی ۱۴

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیِ اُستاد نہیں ۱۵

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا ۱۶

یاس و اُمید نے یک عربدہ میداں مانگا
عجز ہمت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا ۱۷

ضعف سے ہے، نے قناعت سے، یہ ترکِ جستجو
ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ ہم ۱۸

جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں، اسدؔ
صحرا ہماری آنکھ میں یک مشتِ خاک ہے ۱۹

غالبؔ نے اپنے اکثر اشعار میں یہی تلقین کی ہے کہ ہم سوزِ دروں پیدا کریں اور عمل کی راہ پر گامزن ہو جائیں ورنہ ہم اپنی حیات کی خود تکذیب کریں گے۔ زندگی کی وسعتوں کو سامنے رکھتے ہوئے غالبؔ نے جہدِ مسلسل اور سعیِ پیہم کو روحِ ہستی قرار دیا ہے۔

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے ۲۰

یعنی انسان خود کو ماحول میں اسیر پا کر ناامید نہ ہو بلکہ زندگی سنوارنے کے مواقع پیدا کرے۔ گردش لیل و نہار کا اسیر ہوتے ہوئے بھی وہ اپنی منزل اولیٰ کی طرف گامزن ہو سکتا ہے اقبالؔ نے اس خیال کو یوں پیش کیا ہے۔

سعی پیہم ہے ترازوئے کم و کیف حیات

تیری میزاں ہے شمارِ سحر و شام ابھی ۲۱

غالبؔ تن آسانی کے سخت مخالف ہیں ان پر جتنی مشکلات ٹوٹتی ہیں زندگی مزید آسان ہو جاتی ہے ان کا یہ تجزیہ حقیقت پر مبنی ہے کہ قطرے کو گوہر بننے تک سینکڑوں مصائب کے طوفان کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اسی لئے زندگی کی پرخار راہوں کو دیکھ کر ان کا جی خوش ہوتا ہے۔

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں

جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر ۲۲

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب

اک آبلہ پا وادیٔ پُرخار میں آوے ۲۳

غالبؔ مصائبِ زیست کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں انہیں ان کی جرأت و ہمت اس مقام پر لے آئی ہے کہ آشوبِ غم سے بھی ان کی تسلی نہیں ہوتی۔ سعی پیہم انہیں مقاماتِ آہ و فغاں ڈھونڈنے کی ترغیب دیتی ہے

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق

نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی ۲۴

دلم ای شوق ز آشوب غمی نکشاید

فتنۂ چند زہنگامہ ستانی بمن آر ۲۵

اس سلسلے میں علامہ اقبالؔ کی کیفیت بھی غالبؔ سے جدا نہیں:

اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم

مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں ۲۶

غالبؔ تحرکِ عمل کے اس حد تک خواہاں ہیں کہ کوششِ ناتمام اور "سعیِ بے حاصل" کو بھی تقلید سے بہتر سمجھتے ہیں

بس ہجوم نا امیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذّت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے [۲۷]

یہاں بھی اقبالؔ کی فکر غالبؔ کی فکر کے متوازی نظر آتی ہے جب وہ یہ کہتے ہیں کہ:

رازِ حیات پوچھ لے خضرِ خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوشش نا تمام سے [۲۸]

غالبؔ کی حیات آفرین فکر نا اُمیدی میں بھی امید کا پہلو نکال لیتی ہے اسی لئے وہ ناکامیوں کے آگے ہتھیار نہیں ڈالتے بلکہ سرگرمِ عمل رہتے ہیں۔ ان کے ذوق وشوق کا یہ عالم ہے کہ:

نہ لائی شوخیِ اندیشہ تاب رنجِ نومیدی
کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے [۲۹]

علامہ اقبالؔ کے نزدیک بھی کشاکش اور پریشانی سے اہلِ دل ترکِ تمنا نہیں کرتے ہیں بلکہ غموں سے انسان کی فطرت درجۂ کمال کو پہنچتی ہے:

حادثاتِ غم سے ہے انساں کی فطرت کو کمال
غازہ ہے آئینۂ دل کے لئے گردِ ملال [۳۰]

ڈاکٹر یوسف حسین خان نے اپنی کتاب "غالبؔ اور اقبالؔ کی متحرک جمالیات" میں دونوں شعراء کے کلام میں حرکت وحرارت کا تفصیلی تجزیہ پیش کیا ہے۔ متحرک جمالیات سے ان کی مراد یہی ہے کہ شاعری میں ایسے افکار و خیالات، استعارات اور علامتی پیکر برتے جائیں جن سے حرکت وعمل کا احساس ہو غالبؔ اور اقبالؔ دونوں نے اپنی شاعری میں جو حقائق پیش کئے ہیں ان کا مشاہدہ سکون وجمود کی حالت میں نہیں بلکہ فکر کی حالت میں کیا ہے فرق صرف یہ ہے کہ غالبؔ کی فکر جذباتی اور وجدانی ہے اور اقبالؔ کے جذبہ و وجدان میں بھی تعقل جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان کی رائے میں:

> "دائمی حرکت، غالبؔ اور اقبالؔ دونوں کا پیغام ہے۔ اقبالؔ تو اپنی مقصدیت کی خاطر متحرک ہونے کی دعوت دیتا ہے لیکن غالبؔ طبعاً متحرک اور بے چین ہے۔ اس کے ذوق تماشا نے اس کے ذہن وتخیل

کو متحرک رکھا۔ یہ تماشا، تماشا کی خاطر ہے۔ اس کی کوئی خاص منزل نہیں اور اگر ہے تو بہت مبہم اور غیر معین۔۔۔۔'' ۳۱

غالبؔ کے خیال میں کائنات سوائے حرکت کے کچھ اور نہیں اسی لئے انہیں ''نیرنگِ تمنا'' کا تماشا کرنے میں خاص لطف آتا ہے۔ انسانی تمناؤں کا پورا نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ہم لامحدود خیر اور لامحدود حسن کی طرف بڑھ رہے ہیں چاہے وہاں تک پہنچ نہ پائیں اس طرح آرزومندی کا سفر کبھی ختم نہیں ہوتا

ہوں میں بھی تماشائیِ نیرنگِ تمنا
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی برآوے ۳۲

غالبؔ کا خیال ہے کہ ایک آرزو پوری ہو جائے تو ضرور دوسری آرزو روشنی کے مینار کی طرح دور سے دکھائی دینے لگے جس کی طرف انسان کو بڑھنا چاہیئے۔ اگر منزل پر پہنچ گئے تو وہ رہرو کے نقشِ پا کی طرح جامد ہو جائے گی جب کہ دل تو ہمیشہ تمناؤں کی نئی منزلوں کا خواہاں رہتا ہے۔ غالبؔ دریافت کرتے ہیں کہ جب دشت امکاں نقش پا کی مانند ہے تو دیکھئے اب تمنا اپنا دوسرا قدم کس طرف کو اٹھاتی ہے۔ تمنا کے لئے دشت امکاں کے علاوہ دوسرے جہان بھی ہیں جن کی تسخیر کے امکانات ہیں:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب؟
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا، پایا ۳۳

انسان کا تخلیقی اضطراب اسے کبھی چین سے نہیں بیٹھنے دیتا وہ جتنا آگے بڑھتا ہے منزل کی روشنی اس سے دور ہٹتی جاتی ہے یعنی

ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے ۳۴

زندگی کی جدوجہد کے سفر میں انسان کبھی تھک کر پناہ تلاش کرتا ہے تاکہ دم لے کر آگے بڑھے۔ غالبؔ کہتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ سفر کی تھکاوٹ سے چور ہو کر راحت طلب کروں اور خود اپنے سائے کو اپنی آرام گاہ سمجھنے لگوں۔

سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی
ہر قدم سایہ کو میں اپنے شبستاں سمجھا ۳۵

ایک جگہ دیر وحرم کو شوق کی تھکاوٹ کی پناہ گاہیں بتاتے ہیں جہاں مسافر تھوڑی دیر آرام کر کے آگے بڑھتا ہے۔

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا

واماندگیِ شوق تراشے ہے پناہیں ۳۶

غالبؔ کے خیال میں شوق کی کوئی انتہا اور منزل نہیں ہوتی جو منزل آتی ہے وہ اس سے آگے کی منزلوں کی نشاندہی کرتی ہے۔ انسان ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔

شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں

جادہ ، غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں ۳۷

غالبؔ اپنے ذوق جستجو کی فروانی، سخت کوشی اور مشکلات سے کھیلنے کی صلاحیت کو ''بیاباں'' اور ''صحرا'' کے توسط سے بارہا بیان کرتے ہیں۔

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا

حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا ۳۸

غالبؔ اپنے تخیل کی بیاباں نوردی میں جو قدم آگے بڑھاتے ہیں اس میں پھر پیچھے پلٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیٔ خیال

تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے ۳۹

زندگی میں کشمکش اور کشاکش لازمی ہے اگر کوئی اس سے نجات حاصل کرنا چاہے تو یہ غیر فطری ہے۔ دریا کی موج کو دیکھو جب وہ حرکت میں آئی تو خود اس کی روانی ہی اس کے پاؤں کی زنجیر بن گئی۔

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی

ہوئی زنجیر، موجِ آب کو فرصت روانی کی ۴۰

اسی موضوع کو علامہ اقبالؔ اپنی نظم ''شمع وشاعر'' میں یوں بیان کرتے ہیں۔

دیکھ لو گے سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل

موجِ مضطر ہی اسے زنجیر پا ہو جائے گی ۴۱

غالبؔ کو صحرا نوردی سے کوئی تدبیر نہیں روک سکتی جس کے پاؤں میں زنجیر چکر بن جائے وہ تو ہمیشہ گردش ہی

میں رہے گا۔

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں ۴۲

ذوق دشت نوردی کا یہ عالم ہے کہ موت بھی انہیں بے حس و حرکت نہیں کر پاتی۔

اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعدِ مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں ۴۳

غالب کے خیال میں اس کائنات کا ذرّہ ذرّہ ہر لحہ تغیر اور انقلاب کی حالت میں ہے جیسے لیلیٰ کے اشارے پر مجنوں صحرا نوردی کو نکل کھڑا ہوتا ہے یا میخانے میں ساغر ہمہ وقت گردش میں رہتا ہے۔ اسی طرح عالم میں ہر ذرہ متحرک ہے کیونکہ قدرت کا منشا ہی گردش، انقلاب اور حرکت میں مضمر ہے۔

ذرّہ ذرّہ ساغرِ میخانۂ نیرنگ ہے
گردشِ مجنوں بچشمک ہائے لیلیٰ آشنا ۴۴

غالب کا دل ایک ایسا آفت کا ٹکڑا ہے جسے عافیت کوشی سے نفرت ہے کیونکہ وہ دائمی آوارگی کا خواہاں ہے۔

میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا ۴۵

غالب کی طرح فلسفۂ اقبال کی بنیاد مسلسل عمل اور دائمی حرکت و اضطراب پر استوار ہے اقبال کے نزدیک وجود کی بقا سعی و عمل کی مرہونِ منت ہے اقبال انسانی زندگی کا ارتقا جہدِ مسلسل میں تلاش کرتے ہیں ان کے نزدیک ''حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں'' ہے۔ اقبال کے خیال میں حرکت زندگی ہی کا دوسرا نام ہے جب کہ رک جانا، ٹھہر جانا، سکون اور جمود، موت کے مترادف ہیں ''ساقی نامہ'' میں عمل و حرکت اور سخت کوشی کے باب میں فرماتے ہیں۔

دما دم رواں ہے یمِ زندگی — ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی
فریبِ نظر ہے سکون و ثبات — تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود — کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی — فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

بہت اس نے دیکھے ہیں پست و بلند
سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند

سفر زندگی کے لئے برگ و ساز
سفر ہے حقیقت، حضر ہے مجاز

الجھ کر سلجھنے میں لذّت اسے
تڑپنے پھڑکنے میں راحت اسے

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

زمانے کے دھارے میں بہتی ہوئی
ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی

سفر اس کا انجام و آغاز ہے
یہی اس کی تقویم کا راز ہے

ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر
ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر [۴۶]

اقبالؔ کے نزدیک زندگی کے ارتقاء کی کوئی حد نہیں۔ زندگی کا دائمی سفر ہمیشہ سے جاری و ساری ہے

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
نہیں زندگی سے تہی یہ فضائیں
یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
چمن اور بھی، آشیاں اور بھی ہیں [۴۷]

اقبالؔ سے پیشتر غالبؔ اِسی آرزو کا اظہار درج ذیل الفاظ میں کرتے ہیں:

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے پرے ہوتا کاشکے مکاں اپنا [۴۸]

اقبالؔ کی نظم ''چاند اور تارے'' میں چاند تاروں کو زندگی کی حقیقت سمجھاتے ہوئے کہتا ہے کہ:

جنبش سے ہے زندگی جہاں کی
یہ رسمِ قدیم ہے یہاں کی
ہے دوڑتا اشہبِ زمانہ
کھا کھا کے طلب کا تازیانہ

اِس راہ میں مقام بے محل ہے
پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں
جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں ۴۹

نظم ''خضرِ راہ'' بھی اقبالؔ کے دعوتِ عمل میں بلند مقام رکھتی ہے اِس نظم میں اقبالؔ نے خضر کی زبانی زندگی کا راز حرکت و عمل کو قرار دیا ہے۔

کیوں تعجب ہے مری صحرا نوردی پر تجھے
یہ تگا پوئے دَما دَم زندگی کی ہے دلیل ۵۰

زندگی کی حقیقت سخت کوشی میں مضمر ہے اور حرکت ہی میں زندگی کا ارتقاء پوشیدہ ہے۔ کیونکہ:

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے خبر رازِ دوام زندگی ۵۱

زندگی میں کسی بھی مقام پر پہنچ کر ٹھہر جانا اور اسے آخری اور حتمی منزل مان لینا درست نہیں کیونکہ زندگی تو ایک دائمی فعلیت کی حالت ہے جو ہر آن نت نئے روپ میں ہمارے سامنے جلوہ گر ہوتی ہے۔ اقبالؔ خضرؑ کی زبانی زندگی کی توجیہہ اس طور کرتے ہیں۔

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِّ آدم ہے ضمیرِ کُن فکاں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی ۵۲

نظم کے آخر میں اقبالؔ خضر کے حرکت و عمل کے پیغام کو ملتِ بیضا کے مستقبل کے لئے چراغِ راہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔

ذوقِ سفر اور منزل سے آگے بڑھ جانے کی تلقین اقبالؔ نے اپنے کلام میں جا بجا کی ہے۔ ان کے نزدیک منزل نشانِ راہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی جسے پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ جانا چاہئیے کیونکہ یہی دائمی حرکت تو زندگی کا منتہا و مقصود ہے بقول ڈاکٹر یوسف حسین خان:

''اس کے نزدیک انسان ایسا مسافر ہے جو منزل پر نہیں پہنچنا چاہتا اور اگر لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل میں بیٹھنے سے انکار کر دیتا ہے۔ حیات بس ذوقِ سفر ہے اور کچھ نہیں یہ زندگی کا بڑا جاندار اور متحرک نقطۂ نظر ہے۔'' ۵۳

درجہ ذیل اشعار ملاحظہ کیجئے۔

نہ دیا نشانِ منزل مجھے اے حکیم تو نے
مجھے کیا گلہ ہو تجھ سے تو نہ رہ نشیں نہ راہی ۵۴

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہمنشیں ہو تو محمل نہ کر قبول ۵۵

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں ۵۶

خودی کی بیداری کے حوالے سے اقبالؔ نے مقاصد آفرینی کی ضرورت پر بے حد زور دیا ہے جو ایک حرکی عمل ہے انسان اپنی ذات کے اثبات و تکمیل کے لئے ضروری سمجھتا ہے کہ نئے نئے مقاصد کی تخلیق کرتا رہے۔ حقائق کی دنیا تو خودی کی پہلی منزل ہے۔ زمان و مکان کے طلسم کو توڑ کر جب خودی آگے بڑھتی ہے تو اُسے ضمیرِ وجود میں ایسے بے شمار عالم نظر آتے ہیں جن کے ظہور میں آنے کا امکان موجود نظر آتا ہے۔

خودی کی یہ ہے منزلِ اولیں
مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر
طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود
کہ خالی نہیں یہ ضمیرِ وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا
تری شوخیِ فکر و کردار کا ۵۷

ایک سخت کوش انسان اپنی دنیا آپ تخلیق کرنے کی کوشش کرتا ہےاور اپنی زندگی کو اپنے عمل سے بناتا اور سنوارتا ہے۔

وہی جہاں ہے ترا جس کو تُو کرے پیدا
یہ سنگ وخشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے ۵۸

اقبالؔ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی انائے مطلق کی تخلیق کا سلسلہ ازل سے جاری ہےاور ہمیشہ جاری وساری رہے گا۔ کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَاْنٍ ۔ ذاتِ باری کا حرکی تصور ہے۔ زندگی ہر لحہ انقلاب کی حالت میں ہے کائنات کی تکمیل کا سفر ابھی اختتام کو نہیں پہنچا یعنی یہ کائنات نقاشِ ازل کا نا تمام نقش ہے جو کمال کے مدارج طے کرنے میں مصروف ہے۔

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کن فیکون ۵۹

اقبالؔ سے پیشتر غالبؔ زندگی کی مسلسل حرکت اور خوب سے خوب تر کی جستجو کی طرف کچھ یوں اشارہ کرتے ہیں۔

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ، دائم نقاب میں ۶۰

یعنی حق تعالیٰ اس کائنات کو پیدا کر کے فارغ ہو کر نہیں بیٹھ گیا بلکہ ہر لحظہ اپنی ذات کی جلوہ گری میں مصروف ہے۔
اقبالؔ رسمی تصوّف سے سخت بیزار تھے کیونکہ اس میں ترکِ دنیا اور زندگی سے گریز کی تعلیم دی جاتی ہے جب کہ اسلامی تصوف میں زندگی کے دائمی اور تخلیقی ارتقاء کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے کیونکہ سالک کا منتہا ابدی قدریں ہوتی ہیں

جب سالک "اِلٰی ربِّکَ مُنتھٰھا" کے حرکی اصول پر عمل کرے گا تو اُس کی تلاش و جستجو اور منزل پر پہنچنے کا سفر کبھی ختم نہیں ہوگا۔ یعنی

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلّی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے ۶۱

دراصل اقبالؔ خوب سمجھ چکے تھے کہ مسلمانوں نے صدیوں سے تن آسانی و سہل انگاری، یاس، قنوطیت، بے عملی اور کشمکشِ حیات سے گریز کی جو روش اختیار کر رکھی ہے اس کی تلافی صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ انہیں سخت کوشی، جفا طلبی اور عمل پیہم کی زیادہ سے زیادہ تلقین کی جائے، اسی لئے فرماتے ہیں:

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج* ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ** ۶۲

اقبالؔ کے نزدیک ایسی زندگی جس میں ذوق و شوق، خواہشِ انقلاب اور جذبۂ تسخیر نہ ہو وہ موت سے بھی بدتر ہے

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب ۶۳

غالبؔ کے نزدیک بھی انسانی عظمت کا راز اس کے دائمی اضطراب و اضطرار میں پوشیدہ ہے کیونکہ انسان کے ہنگامہ خیز دل کو بنانے کے لئے سینکڑوں قیامتوں کو پگھلا کر بنایا گیا ہے اسی لئے دل کی ہنگامہ زائیاں روزِ قیامت سے کہیں زیادہ ہیں:

صد قیامت بگدازند و بہم آمیزند
تا خمیر دل ہنگامہ گزین تو شود ۶۴

غالبؔ اور اقبالؔ دونوں ہی نے زندگی کو لامحدود اور وسیع امکانات کا ایک سلسلہ قرار دیا۔ انسان کو زندگی صرف اس لئے عطا نہیں ہوئی کہ وہ اپنی معینہ مدتِ عمر کاٹ کر واپس چلا جائے بلکہ اس کو کسی مقصد کے لئے اس دنیا میں بھیجا گیا ہے اور انسانیت کی سربلندی کا راز حرکت و عمل اور آگے بڑھتے رہنے کی اُمنگ میں پوشیدہ ہے اِسی لئے غالبؔ کہتے ہیں کہ:

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے ۶۵

*: زجاج بمعنی شیشہ استعارہ ہے ضعف اور ناتوانی کے لئے

**: سنگ اِستعارہ ہے قوت کے لئے

جب کہ اقبالؔ اسی خیال کی ترجمانی اپنے اندازِ خاص میں اس طور کرتے ہیں:

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں

کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر ۶۶

حقیقت تو یہ ہے کہ غالبؔ کا متحرک اندازِ فکر ان کی فطرت کا تقاضا تھا۔ ان کے پیش نظر نہ کوئی پیغام تھا نہ ہی کسی خاص مقصد کا ابلاغ انہیں منظور تھا۔ جب کہ اُن کے برعکس اقبالؔ ایک مخصوص نظامِ فکر کے داعی تھے۔ اسلامی روایات اور قرآنی حقائق ہر لحظہ ان کے پیش نظر تھے اور وہ امتِ مسلمہ کی گم گشتہ عظمت وسطوت کو بحال کر کے ان کی زندگی میں تغیر وانقلاب پیدا کرنے کے متمنی تھے۔ غالبؔ اور اقبالؔ کے فلسفۂ عمل وحرکت میں جو فرق ہے اسے ڈاکٹر یوسف حسین خان کی اس رائے کی روشنی میں بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

''غالبؔ کوئی عملی انسان نہیں تھا اور نہ اس کے پیش نظر کوئی مخصوص اجتماعی مقاصد تھے جیسے کہ اقبالؔ کے سامنے تھے بایں ہمہ اس نے حقیقت کا متحرک حالت میں مشاہدہ کیا اور حقیقت کو اپنے تخیل کی گرفت میں لانے کے لئے اس نے جو علامتی پیکر اور استعارے استعمال کئے وہ متحرک محسوس ہوتے ہیں۔ اس کے حسن ادا کی یہ خوبی ہے کہ ہئیت، موضوع اور جذبہ اس طرح سے شیر وشکر ہیں کہ ان کے علیحدہ وجود باقی نہیں رہے۔۔۔ اس کی متحرک جمالیات میں صحرا، بیاباں، خار اور آبلہ پا کے علامتی پیکر نہ صرف سخت کوشی اور خار اشگافی کو ظاہر کرتے ہیں بلکہ وہ ان کے ذریعے سے حسن آفرینی کرتا ہے۔۔۔'' ۶۷

مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تھوڑے بہت فرق کے باوجود غالبؔ اور اقبالؔ دونوں جفا طلبی، سخت کوشی اور تحرک کی طرف مائل ہیں۔ سکون، راحت اور آرام کی تمنا دونوں کے ہاں نظر نہیں آتی اسی لئے دونوں کا نظامِ فکر حرکی اور توانا اقدار کا امین ہے۔ بقول ڈاکٹر یوسف حسین خان:

''اقبالؔ کے حرکی تصورات اُس کے ذہن کی تخلیق ہیں اور غالبؔ کا متحرک نقطۂ نظر اس کی فطرت کا اقتضاء ہے۔ دونوں کی متحرک جمالیات میں ان کے یہ رویے نمایاں ہیں۔ دونوں کو اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ آزادی اور حرکت کے اصول کے بغیر انسان کی روح اور مادی زندگی کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔'' ۶۸

الغرض اُردو شاعری کی روایت میں غالبؔ کی آواز اپنی بلند آہنگی، جارحانہ انداز، جوش وخروش اور تحرک کی بنیاد پر دور سے پہچانی جاسکتی ہے۔ غالبؔ کی غزل کا یہ مردانہ لب ولہجہ جو پختگی واستواری، دلبری وقاہری اور اعتماد ویقین جیسی صفات سے متصف تھا، ان کے بعد اس کی صدائے بازگشت زیادہ گھن گرج کے ساتھ صرف کلامِ اقبالؔ ہی میں محسوس کی جاسکتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۱۲۲

۲۔ اقبالؔ، بانگِ درا، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۴۸

۳۔ ایضاً ، صفحہ ۱۷۰

۴۔ عبداللہ ، ڈاکٹر، سید، مسائلِ اقبالؔ، صفحہ ۱۱۶

۵۔ صلاح الدین احمد، مولانا، صریرِ خامہ (لاہور: المقبول پبلی کیشنز، اشاعت سوّم ۱۹۶۹) صفحہ ۱۹۲

۶۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اقبالؔ سب کے لئے، صفحہ ۹۲

۷۔ اقبالؔ، زبورِ عجم، کلیاتِ اقبالؔ فارسی، صفحہ ۵۸۰

۸۔ اے۔بی۔اشرف، ڈاکٹر، میر، غالبؔ اور اقبالؔ (ملتان: جائزہ پرنٹرز۔اشاعت اول، ۱۹۹۹ء) صفحہ ۷۶۔۷۷

۹۔ یوسف حسین خان، ڈاکٹر، متحرک جمالیات، صفحہ ۱۷

۱۰۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۱۵۰

۱۱۔ ایضاً، صفحہ ۱۳

۱۲۔ ایضاً، صفحہ ۲

۱۳۔ ایضاً، صفحہ ۴۱

۱۴۔ ایضاً، صفحہ ۱۶۲

۱۵۔ ایضاً، صفحہ ۱۳۵

۱۶۔ ایضاً، صفحہ ۴۵

۱۷۔ ایضاً، صفحہ ۸

۱۸۔ ایضاً، صفحہ ۱۰۶

۱۹۔ ایضاً، صفحہ ۲۳۳

۲۰۔ ایضاً، صفحہ ۲۸۷

۲۱۔ اقبالؔ، بانگِ درا، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ۲۷۹

۲۲۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ۷۶

۲۳۔ ایضاً، صفحہ۲۶۱

۲۴۔ ایضاً، صفحہ۱۷۶

۲۵۔ غالبؔ، کلیاتِ غالبؔ فارسی، جلدسوم، صفحہ۲۱۷

۲۶۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ۳۵۳

۲۷۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ۲۴۷

۲۸۔ اقبالؔ، بانگِ درا، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ۱۲۴

۲۹۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ۱۸۹

۳۰۔ اقبالؔ، بانگِ درا، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ۱۵۵

۳۱۔ یوسف حسین، ڈاکٹر، خان، محترک جمالیات، صفحہ۷۵

۳۲۔ نقوش، غالبؔ نمبر، حصہ دوم، شمارہ ۱۱۳، صفحہ۳۲۴

۳۳۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ۴

۳۴۔ ایضاً، صفحہ۱۸۵

۳۵۔ ایضاً، صفحہ۱۴

۳۶۔ ایضاً، صفحہ۱۱۹

۳۷۔ ایضاً، صفحہ۱۱۳

۳۸۔ ایضاً، صفحہ۱۱

۳۹۔ ایضاً، صفحہ۱۶۹

۴۰۔ ایضاً، صفحہ۱۷۰

۴۱۔ اقبالؔ، بانگِ درا، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ۱۹۴

۴۲۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ۱۱۳

۴۳۔ ایضاً، صفحہ۱۵۰

۴۴۔ ایضاً، صفحہ۱۹

۴۵۔ ایضاً، صفحہ۱۹

۴۶۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ۴۱۷تا۴۱۹

۴۷۔ ایضاً، صفحہ۳۵۳

۴۸۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ۴۹

۴۹۔ اقبالؔ، بانگِ درا، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ۱۱۹

۵۰۔ ایضاً، صفحہ۲۵۷

۵۱۔ ایضاً، صفحہ۲۵۸

۵۲۔ ایضاً، صفحہ۲۵۸۔۲۵۹

۵۳۔ یوسف حسین ، ڈاکٹر ، خان، متحرک جمالیات، صفحہ۱۷۰

۵۴۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ۳۲۷

۵۵۔ اقبالؔ، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ۵۳۴

۵۶۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ۳۳۹

۵۷۔ ایضاً، صفحہ۴۲۰

۵۸۔ ایضاً، صفحہ۳۶۰

۵۹۔ ایضاً، صفحہ۳۲۰

۶۰۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ۱۳۲

۶۱۔ اقبالؔ، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ۵۸۹

۶۲۔ ایضاً، صفحہ۴۷۲

۶۳۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ۳۹۲

۶۴۔ غالبؔ، کلیاتِ غالبؔ فارسی، جلد سوم، صفحہ۱۵۳

۶۵۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۲۸۳

۶۶۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۲۹۹

۶۷۔ یوسف حسین، ڈاکٹر، خان، متحرک جمالیات، صفحہ ۲۰۱ تا ۲۰۲

۶۸۔ ایضاً، صفحہ ۹۷ تا ۹۸

غالبؔ اور اقبالؔ کا تصورِ تصوُّف

غالبؔ اور اقبالؔ کا تصورِ تصوّف

اردو شاعری بالخصوص صنفِ غزل میں تصوف کو ہمیشہ سے اہم مقام حاصل رہا ہے۔ یوں بھی غزل ایک ایسی شائستہ صنفِ سخن ہے جس میں تہذیب کا رنگ جھلکتا ہے اور اس کی سب سے نمایاں خوبی رمزیت وایمائیت ہے۔ یعنی شاعر اپنے احساسات وجذبات اور قلبی واردات کا اظہار اشاروں اور کنایوں میں کرتا ہے۔ بالفاظِ دیگر ''مشاہدۂ حق'' کی گفتگو کو ''بادہ وساغر'' کے حوالے سے بیان کرتا ہے۔ بقول غالبؔ

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر [1]

صنفِ غزل کے بارے میں آل احمد سرور کی رائے ہے کہ

''غزل میں سخن ماورائے سخن ہوتا ہے اُس کا بیان سطور میں نہیں بین السطور میں بھی ہوتا ہے۔'' [2]

اچھی شاعری وہ ہے جو ہماری زندگی کی بصیرت میں اضافہ کرے اور ہماری آنکھوں کو وہ جلوے دکھائے جواب تک ہماری نگاہوں سے پوشیدہ تھے۔ شعر کی اس غرض وغایت کو پورا کرنے کے لئے صوفیانہ افکار ہمیشہ سے غزل کے روایتی مضامین میں شامل رہے ہیں کیونکہ تصوف کے بارے میں ایک عام خیال یہ بھی رہا ہے کہ

''تصوف برائے شعر گفتن خوب است''

غالبؔ اور اقبالؔ دونوں کی حکیمانہ فطرت کو تصوف سے خاص مناسبت تھی، دونوں کا فلسفیانہ مزاج حیات و کائنات کی حقیقتوں کی تہہ تک پہنچ جانا چاہتا تھا لہٰذا دونوں نے مسائلِ تصوف پر کھل کر اظہارِ خیال کیا ہے۔ عبدالرحمان بجنوری نے ''محاسنِ کلامِ غالبؔ'' میں درست لکھا ہے کہ:

''لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں لیکن کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں، کونسا نغمہ ہے جو اس سازِ زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں ہے۔'' [3]

انہی نغماتِ زندگی میں سے ایک نغمہ صوفیانہ خیالات پر مبنی ہے۔

تصوف سے دلچسپی:

غالبؔ اور اقبالؔ دونوں مسائلِ تصوف کے رمز شناس تھے۔ دونوں صوفیاء اور تصوف سے فطری لگاؤ اور گہری وابستگی رکھتے تھے۔ حالیؔ نے یادگارِ غالبؔ'' میں غالبؔ کے اس فکری میلان کا ذکر جا بجا کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

''تصوف سے ان کو خاص مناسبت تھی۔ حقائق و معارف کی کتابیں اور رسائل کثرت سے ان کے مطالعے میں گزرے تھے۔ انہی متصوفانہ خیالات نے مرزا کو نہ صرف اپنے ہمعصروں میں، بلکہ بارھویں اور تیرھویں صدی کے تمام شعراء میں ممتاز بنا دیا۔'' ۴

ایک اور جگہ وضاحت فرماتے ہیں کہ:

''مرزا حقائق و معارف کی کتابیں اکثر مطالعہ کرتے تھے اور ان کو خوب سمجھتے تھے۔ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ فرماتے تھے کہ میں شاہ ولی اللہ کا ایک فارسی رسالہ، جو حقائق و معارف کے نہایت دقیق مسائل پر مشتمل تھا، مطالعہ کر رہا تھا اور ایک مقام بالکل سمجھ میں نہ آتا تھا اتفاقاً اسی وقت مرزا صاحب آنکلے میں نے وہ مقام مرزا کو دکھایا۔ انہوں نے کسی قدر غور کے بعد اس کا مطلب ایسی خوبی اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا کہ شاہ صاحب بھی شاید اس سے زیادہ نہ بیان کر سکتے تھے۔'' ۵

حالؔی کی پیش کردہ آراء کی روشنی میں اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ غالبؔ کی تصوف سے دلچسپی سرسری و سطحی نہ تھی اگر چہ وہ شیعہ مسلک سے تعلق رکھنے کی بنا پر یہی کہتے رہے کہ انہوں نے تصوف کو محض ''تفننِ طبع'' کے لئے لگا رکھا ہے لیکن ان کے یہاں ایسے مضامینِ تصوف کی بھی کمی نہیں جن کا تعلق داخلی واردات سے ہے۔ اگر چہ انہوں نے علامہ اقبالؔ کی طرح تصوف کا کوئی نیا فلسفہ تو پیش نہیں کیا لیکن تعصّبات اور تنگ نظری کی مخالفت اکثر کرتے نظر آتے ہیں:

حسد سے دل اگر افسردہ ہے، گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو ۶

غالبؔ کو اپنی مسائلِ تصوف سے آگاہی اور ان کے بیان پر بڑا ناز تھا ایک جگہ اپنی شاعری کو الہامی قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے ۷

ایک جگہ از راہِ شوخی فرماتے ہیں:

دیکھیو غالبؔ سے گر الجھا کوئی
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا ۸

اور کبھی شاعرانہ تعلّی سے کام لیتے ہوئے بصد ناز فرماتے ہیں:

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا ۹

غالبؔ نہ صوفی تھے نہ ولی اور نہ ہی انہیں اقبالؔ کے ہم مرتبہ فلسفی قرار دیا جا سکتا ہے لیکن قدرت کی طرف سے انہیں بھی مفکرانہ ذہن عطا ہوا تھا۔ اسی لئے ان کے یہاں حقائق و معارف کے وہ دقیق نکات ملتے ہیں جو انہیں صوفی اور فلسفی ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔ بقول یوسف جمال انصاری

''غالبؔ کیفیات کے شاعر تھے۔ جس کیفیت میں سرشار ہوتے اس کا اظہار کر دیتے۔ نوجوانی کے کلام میں تصوف کی جو جھلکیاں نظر آتی ہیں، بڑھاپے کے خطوط میں انہی کی تائید ملتی ہے۔ گویا تمام عمر تصوف کے خیالات میں گھرے رہے۔ کہیں تصوف ایک فکری مسلک ہے اور کہیں ایک روحانی تجربہ اور بعض اوقات یہ دونوں کیفیتیں گھل مل گئی ہیں۔'' ۱۰

غالبؔ کے چند صوفیانہ اشعار ملاحظہ کیجئے۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا ۱۱

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں ۱۲

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا ۱۳

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بُو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا ۱۴

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفی منصور نہیں ۱۵

غالبؔ کے ہاں تصوف کے میلان کی ایک وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کا کچھ حصہ فضلِ حق خیرآبادی کی صحبت میں بھی گزارا نیز غالبؔ کے تصوف سے شغف کا تذکرہ نامکمل رہ جائے گا اگر غالبؔ اور سید علی غمگین شاہ خدا نما کے گہرے روابط کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ شاہ غمگین کا مرتبہ تصوف میں بلند تھا۔ غالبؔ مسائل تصوف سے آگاہی کے لئے خط وکتابت کے ذریعے شاہ غمگین سے مشورہ کرتے تھے یہ خط وکتابت تقریباً سولہ برس جاری رہی۔ (آئینۂ غالبؔ، مطبوعہ دہلی میں ان خطوط کے اقتباسات بصورت ترجمہ شائع ہوئے ہیں)۔ ان تعلقات نے غالبؔ پر صوفیانہ افکار کا ایک نیا دروازہ کھول دیا۔ ۱۶

غالبؔ کے فلسفیانہ اور حکیمانہ اندازِ نظر کی ایک اور وجہ مرزا عبدالقادر بیدلؔ بھی ہیں۔ جن سے غالبؔ اپنی فکری زندگی کے سفر کے آغاز ہی میں خاصے متاثر تھے۔ بقول نیاز فتح پوری

''غالبؔ نے بہت سے نکاتِ تصوف کا ذکر مختلف اندازِ بیان سے کیا ہے۔ اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ غالبؔ نے بیدلؔ کا غائر مطالعہ کیا تھا اور کلام بیدلؔ کی اس خصوصیت نے کہ کوئی اسے سمجھے یا نہ سمجھے اس کا اثر ضرور قبول کر لیتا ہے، غالبؔ کو بھی کافی متاثر کیا تھا۔'' ۱۷

غالبؔ کے یہاں تصوف کی جو موشگافیاں ملتی ہیں اُس کا ایک سبب ان کا ماحول بھی تھا کیونکہ انحطاط پذیر معاشرہ تصوف کے فروغ میں سازگار ثابت ہوتا ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی قدریں روبہ۔ زوال ہوں وہاں ذہن تصوف کے دامن میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ چنانچہ غالبؔ بھی مسائلِ تصوف بیان کئے بنا نہ رہ سکے لیکن انہوں نے حقائقِ زیست کو عقل کی بجائے دل کی کسوٹی پر پرکھا۔ ان کے یہاں فلسفیانہ افکار اور جذبات کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ ڈاکٹر شیخ محمد اکرام اس باب میں رقمطراز ہیں کہ:

''غالبؔ کا مطمحِ نظر کچھ اس قسم کا تھا کہ اگر انہوں نے اقبالؔ کی طرح فلسفہ کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہوتی تو وہ ایک مرتب اور مدون فلسفہ یادگار چھوڑ جاتے۔ لیکن خوش قسمتی یا بدقسمتی سے وہ اصلاً شاعر تھے، فلسفی نہ تھے۔ حقیقت کے مشاہدہ کے لئے انہوں نے فلسفیانہ نہیں شاعرانہ طریق کار اختیار کیا۔۔۔ انہوں نے حقیقت کا تجزیہ کر کے اسے فلسفیانہ اصولوں کی روشنی میں نہیں دیکھا۔ بلکہ غیر

شعوری طور پر ان کے حساس اور آزاد ذہن نے جو تاثرات اخذ کئے وہ انہوں نے پیش کر دیئے۔''[۱۸]

غالبؔ ہی کی طرح علامہ اقبالؔ کا فطری میلان آغاز ہی سے تصوف کی طرف تھا انہوں نے جس ماحول اور جن ہاتھوں میں تعلیم وتربیت پائی ان پر بھی تصوف کے اثرات گہرے تھے۔ بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

''اقبالؔ کی ابتدائی تعلیم وتربیت جس ماحول میں ہوئی تھی اس کا تقاضا یہ تھا کہ تصوف اور دینی مسائل سے انہیں گہری دلچسپی پیدا ہو جاتی۔ یہی ہوا اقبالؔ میں اسلام کی محبت شروع ہی سے ایسی رچ بس گئی کہ علم وعمر کے اضافے کے ساتھ اس میں پختگی اور شدت پیدا ہوتی گئی، حتیٰ کہ ان کی شخصیت رفتہ رفتہ ایک عظیم اسلامی مفکر میں ڈھل گئی۔''[۱۹]

اقبالؔ کے والد شیخ نور محمد پرہیزگار اور متقی انسان تھے اور اقبالؔ کے نزدیک پیر و مرشد کا درجہ رکھتے تھے۔ آپ کی والدہ محترمہ شب بیدار اور تہجد گزار خاتون تھیں۔ تعلیم کا آغاز ہوتے ہی آپ کو سید میر حسن جیسا استاد میسر آ گیا جنہوں نے آپ کو اسلامی علوم اور تصوف وعرفان سے بہرہ ور کیا۔ لاہور میں پروفیسر آرنلڈ کی صحبت میں فکر وفلسفہ کے رجحان اور ذوق سلیم کو جلا ملی۔ انگلستان میں براؤن اور نکلسن کی رفاقت میں فکر وفلسفہ کو سائنسی انداز میں پرکھنے کا سلیقہ پیدا ہوا۔

علامہ اقبالؔ کے دل میں علماء وفقرا کی بڑی قدر ومنزلت تھی۔ صوفیائے کرام اور بزرگانِ دین کے مزاروں پر حاضری دینا اور فاتحہ خوانی ضروری سمجھتے تھے۔ انگلستان جاتے وقت حضرت نظام الدین اولیا کے مزار پر بطور خاص حاضری دی اور ''التجائے مسافر'' کے عنوان سے دعائیہ نظم کہی جس کے منتخب اشعار درج ذیل ہیں۔

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا
بڑی جناب تری، فیض عام ہے تیرا
تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی
مسیحؑ و خضرؑ سے اونچا مقام ہے تیرا [۲۰]

اقبالؔ اُن تمام برگزیدہ شخصیات کے عقیدت مند تھے جن کی تعلیمات نے دائرہ اسلام کو وسعت بخشی۔ مولانا روم سے عقیدت خاص کا اظہار جا بجا کرتے ہیں۔ خود کو اُن کا مرید کہتے ہیں اور کشادہ دلی سے اکتساب فیض کا اعتراف کرتے ہیں۔

صحبت پیر روم سے، مجھ پر ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بجیب، ایک حکیم سر بکف [۲۱]

یا

اُسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن
اُسی کے فیض سے میرے سبو میں ہے جیحوں [۲۲]

علامہ کا تصوف سے والہانہ لگاؤ ہی تھا کہ انہوں نے فضیلت کی سند کے لئے ''ایران میں مابعد الطبیعات کا ارتقاء'' جیسے موضوع کو منتخب فرمایا۔ اُس وقت تک اقبالؔ عجمی تصوف کے متعلق خوش گمان تھے لیکن جب آپ نے عجمی تصوف کے نظام فکر کو سمجھنے کے لئے تحقیق کی تو آپ پر کھلا کہ عجمی تصوف کی بہت سی منازل میں قرآن وسنت سے انحراف کیا گیا ہے۔ لٰہذا انہوں نے نہ صرف عجمی تصوف کے خلاف صدائے احتجاج ہی بلند کی بلکہ اجتہاد سے کام لیتے ہوئے اسلامی تصوف کی بنیاد بھی رکھی۔ اِس انقلابِ فکر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خواجہ حسن نظامی کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

''میری نسبت بھی آپ کو معلوم ہے کہ میرا فطری اور آبائی میلان تصوف کی طرف ہے اور یورپ کا فلسفہ پڑھنے سے یہ میلان اور بھی تیز ہو گیا ہے۔۔۔مگر قرآن میں تدبر کرنے اور تاریخ اسلام کا بغور مطالعہ کرنے سے مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور میں نے محض قرآن کی خاطر اپنے قدیم خیالات کو ترک کر دیا اور اس مقصد کے لئے مجھے اپنے فطری اور آبائی رجحانات کے ساتھ ایک خوفناک دماغی اور قلبی جہاد کرنا پڑا'' [۲۳]

اقبالؔ نے افلاطونی فلسفہ حیات پر کڑی تنقید فرمائی کیونکہ عجمی صوفیاء نے اپنی تعلیمات میں بے عملی اور غلامی کی زندگی کو باعمل اور آزاد زندگی پر فوقیت دی۔ جس کے نتیجے میں اقوام خوف اور کمزوری میں مبتلا ہو کر اپنی خودی سے بیگانہ ہونے لگیں۔ اِس کے برخلاف اسلامی تصوف دلوں کو قوت اور توانائی بخشنے والا ہے اِسی لئے اقبالؔ صوفی کو تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

اے پیر حرم رسم و رہِ خانقہی چھوڑ
مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا

اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت

دے اُن کو سبق خود شکنی، خود نگری کا ۲۴

تصوف کے باب میں غالب اور اقبال کی فکر متنازعہ ہے۔ کیونکہ غالب وحدت الوجود کے قائل تھے اور اقبال وحدت الشہود پر یقین رکھتے تھے لیکن اس بنیادی فرق کے باوصف دیگر مضامینِ تصوف کی بابت دونوں عظیم شعرا کی فکر کے دھارے کہیں کہیں ملتے دکھائی دیتے ہیں۔ ذیل میں اس فکری اشتراک کا تفصیلی جائزہ لیا جائے گا۔

وحدت الوجود:

شیخ محی الدین ابنِ عربی نے وحدت الوجود یا ہمہ اوست کا نظریہ پیش کیا جس کے مطابق خدا اور کائنات ایک ہی ہیں۔ حقیقی وجود صرف ایک یعنی اللہ ہے اور کائنات میں جو کچھ نظر آتا ہے وہ اُسی وجودِ حقیقی کا عکس اور سایہ ہے۔ یہ تجلی خدا کے وجود سے الگ کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ غالب بھی فارسی شعرا کی تقلید بالخصوص بیدل کے تاثر کی بدولت وحدت الوجود کو اسلام کا اصل اصول جانتے تھے۔ اُن کے نزدیک صرف ایک ہی ذات حقیقی ہے جسے افلاطون ''الواحد'' شنکر ''برہمن''، ہیگل ''مطلق'' اسپنوزا ''جوہر'' اور شیخ اکبر ''الحق'' کہتا ہے۔ حالی ''یادگارِ غالب'' میں لکھتے ہیں۔

''مرزا اسلام کی حقیقت پر نہایت پختہ یقین رکھتے تھے اور توحید وجودی کو اسلام کا اصل اصول اور رکن رکین جانتے تھے۔ اگر چہ وہ بظاہر اہل حال سے نہ تھے، مگر جیسا کہ کہا گیا ہے'' من احب شیأ اکثر ذکرہ'' توحید وجودی اُن کی شاعری کا عنصر بن گئی تھی۔ اس مضمون کو انہوں نے جس قدر اصناف سخن میں بیان کیا ہے غالب اُنظیری اور بیدل کے بعد کسی نے نہیں بیان کیا'' ۲۵

ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

''انہوں نے تمام عبادات اور فرائض و واجبات میں سے صرف دو چیزیں لے لی تھیں۔ ایک توحید وجودی اور دوسرے نبیؐ اور اہل بیت نبیؐ کی محبت، اور اسی کو وہ وسیلہ نجات سمجھتے تھے'' ۲۶

غالب کے درج ذیل اشعار تصور وحدت الوجود کی عکاسی کرتے ہیں۔

ہے مشتمل نمودِ صور پر وجود بحر

یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں ۲۷

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ "انا البحر"
ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا ۲۸

شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ "ہے" پر ہمیں منظور نہیں ۲۹

ہاں کھائیو مت فریب ہستی
ہر چند کہیں کہ "ہے" نہیں ہے ۳۰

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے ۳۱

غالبؔ کے دل میں وحدت الوجود کا عقیدہ اس حد تک گھر کیے ہوئے تھا کہ وہ مشاہدہ اور کشف والہام کو بھی غیر ضروری جانتے تھے۔ جب ہر شے کی حقیقت ایک ہی ہے اور تمام اشیا ایک ہی ذات کا اظہار ہیں تو پھر عرفان حق کے لئے مشاہدہ غیر ضروری ہے:

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں ۳۲

ایک شعر میں "موحّد" کی صوفیانہ اصطلاح استعمال کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ہم موحّد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں ۳۳

غالبؔ کے خیال میں جس طرح ذرہ پرتوِ خورشید کا مظہر ہے اسی طرح اس کائنات کی ہر شے میں اللہ تعالیٰ ہی کی ذات کا ظہور نظر آتا ہے:

ہے تجلی تری سامانِ وجود

ذرّہ بے پرتوِ خورشید نہیں ۳۴؎

غالبؔ کے یہاں تصوف کا اگر کوئی عقیدہ ملتا ہے تو وہ صرف وحدت الوجود ہی ہے جسے وہ مضامین بدل کر پیش کرتے ہیں۔ مثلاً

کثرت آرائیِ وحدت ہے پرستاریِ وہم

کر دیا کافر ان اصنام خیالی نے مجھے ۳۵؎

باوجودِ یک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں

ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم ۳۶؎

اُتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے

جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں ۳۷؎

نظریہ وحدت الوجود کے سلسلے میں غالبؔ اور اقبالؔ کی فکری مطابقت اقبالؔ کی شاعری کے اولین دور تک ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ جب تک اقبالؔ نہ سفرِ یورپ پر گئے تھے اور نہ ہی رموزِ تصوف کی گرہیں ہی کھول پائے تھے۔ بانگ درا کی نظم ''جگنو'' کے آخری بند میں تمام مظاہر کی کثرت کو ایک ہی وحدت کا جزو قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں

حسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے

انساں میں وہ سخن ہے، غنچے میں وہ چٹک ہے

کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی

جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے

یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو؟

ہر شے میں جب کہ پنہاں خاموشیِ ازل ہو ۳۸؎

اقبالؔ جب تک وجودی تصورات کے قائل رہے وہ بھی حقیقت کو غیر متشخص اور کائنات کو فریب نظر سمجھتے رہے۔ اُن کے نزدیک یہ خدا ہی ہے جو کائنات کے بعض مظاہر میں سوتا ہے اور شعور انسانی میں آکر بیدار ہو جاتا ہے۔ مثلاً

کمالِ وحدت عیاں ہے ایسا کہ نوکِ نشتر سے تو جو چھیڑے
یقیں ہے مجھ کو گرے رگِ گُل سے قطرہ انسان کے لہو کا ۳۹

چمک تیری عیاں بجلی میں، آتش میں، شرارے میں
جھلک تیری ہویدا، چاند میں، سورج میں، تارے میں
جو ہے بیدار انساں میں وہ گہری نیند سوتا ہے
شجر میں، پھول میں، حیواں میں، پتھر میں ستارے میں ۴۰

۱۹۱۰ء سے ۱۹۲۲ء تک اقبال کے کلام میں وجودی تصوف کی کوئی اور جھلک نظر نہیں آتی۔ ''اسرارِ خودی'' اور ''رموزِ بے خودی'' اِس دور کی مثنویاں ہیں۔ ۱۹۱۴ء میں شیخ احمد سرہندی کے مکتوبات شائع ہو چکے تھے اِن مکتوبات میں وحدت الشہود پر زور دیا گیا تھا۔ اقبال نے ان نظریات سے بہت گہرا اثر قبول کیا ''اسرارِ خودی'' کی اشاعت سے وحدت الوجود کی مخالفت کے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ ایک خط میں نظریہ وحدت الوجود کے ترک کرنے کا صاف الفاظ میں اقرار کرتے ہیں۔

''مجھے اس امر کا اعتراف کرنے میں شرم نہیں کہ میں ایک عرصہ تک ایسے عقائد و مسائل کا قائل رہا جو بعض صوفیا کے ساتھ خاص ہیں اور جو بعد میں قرآن شریف پر تدبر کرنے سے غیر اسلامی ثابت ہوئے مثلاً شیخ محی الدین ابن عربی کا مسئلہ قدم ارواح، مسئلہ وحدت الوجود۔۔۔یا دیگر مسائل'' ۴۱

''اسرارِ خودی'' کے مقدمہ میں اقبال نے بہ صراحت عجمی تصوف کے اُن مہلک عناصر کے خلاف احتجاج کیا جن سے ذوقِ عمل مردہ ہوتا ہے نیز توحید اور وحدت الوجود مترادف نہیں۔ اِس دیباچہ میں اقبال نے حکیم افلاطون کے ساتھ ساتھ حافظ شیرازی کو بھی ''حکایت گوسفنداں'' کے حوالے سے اپنی تنقید کا نشانہ بنایا۔ افلاطون کو اقبال گوسفندی قدیم'' کہتے ہیں کیونکہ وہ دنیا کا پہلا فلسفی تھا جس نے زندگی کے منفی تصورات کو فروغ بخشتے ہوئے فرار کی تلقین کی۔

گوسفندے در لباسِ آدم است
حکم اِو برجانِ صوفی محکم است

فکر افلاطون زیاں را سود گفت

حکمتِ او بود را نابود گفت

بس کہ از ذوق عمل محروم بود

جانِ او وارفتۂ معدوم بود ۴۲

اقبالؔ خود فرماتے ہیں کہ افلاطون پر اعتراضات کی وجہ یہ ہے کہ اُس کا فلسفہ زندگی کی بجائے موت کو اپنا نصب العین قرار دیتا ہے جبکہ اقبالؔ اپنے تصورِ خودی کے تحت ہر اُس چیز کو مضر سمجھتے تھے جو خودی کو ضعیف کر دے یا ترکِ دنیا، بے عملی اور انفعالیت کا درس دے۔ اِسی لئے حافظ کی شاعرانہ عظمت تسلیم کرنے کے باوجود اقبالؔ اُس کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

ہوشیار از حافظ صہبا گسار

جامش از زہر اِجل سرمایہ دار

حافظِ جادوبیاں شیرازی است

عرفیِ آتش زباں شیرازی است

ایں سوئے ملکِ خودی مرکب جہاند

آں کنارِ آب رکنا باد ماند

بے نیاز از محفل حافظ گزر

الحذر از گوسفنداں الحذر ۴۳

اقبالؔ اپنے ایک خط میں تصوف کے بارے میں اپنی رائے پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''میں عرض کر چکا ہوں کہ کونسا تصوف میرے نزدیک قابل اعتراض ہے عجمی تصوف سے لٹریچر میں دل فریبی اور حسن و چمک پیدا ہوتا ہے مگر ایسا کہ جو طبائع کو پست کرنے والا ہے۔ اسلامی تصوف دل میں قوت پیدا کرتا ہے اور اس قوت کا اثر لٹریچر پر ہوتا ہے میرا تو یہی عقیدہ ہے کہ مسلمانوں کا لٹریچر تمام ممالک اسلامیہ میں قابل اصلاح ہے۔ یاسیت انگیز ادب کبھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ قوم کی زندگی کے لئے اُس کا اور اُس کے لٹریچر کا رجائی ہونا ضروری ہے'' ۴۴

اقبالؔ ایسے تصوف کے مخالف تھے جو خودی کو استحکام بخشنے کی بجائے بے عملی اور رہبانیت کو فروغ دے۔ ''ضربِ کلیم'' میں ''تصوف'' کے عنوان سے جو مختصر نظم ہے اُس میں اقبالؔ وضاحت کر دیتے ہیں کہ اگر تصوف خودی کی نگہبانی کا فرض انجام نہیں دے سکتا تو یہ بالکل بے فائدہ ہے:

یہ حکمت ملکوتی ، یہ علم لا ہوتی
حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکرِ نیم شبی ، یہ مراقبے، یہ سرور
تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں [۴۵]

صوفیانہ عقائد سے اُصولی اور نظریاتی اختلاف رکھنے کے باوجود اقبالؔ کے نزدیک وہ ہستیاں محترم رہیں جن کا عقیدہ وحدت الوجود تھا، عطارؔ ہوں، رومی ہوں، سنائیؔ ہو یا اسداللہ خان غالبؔ، اِن ہستیوں کا جب بھی ذکر آیا اقبالؔ نے ان کی عظمت اور خدمات کا اعتراف نہایت ادب اور فراخدلی سے کیا۔

حقیقت کائنات:

تمام دوسرے علوم کی طرح تصوف کی ابتداء بھی تحیّر سے ہوئی جب کائنات کی اصلیت کو جاننے اور حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کے لئے سلوک کا راستہ اختیار کیا گیا۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان روح اقبالؔ'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''انسان اِس امر پر غور کرنے کے لئے مجبور ہے کہ جس دنیا میں وہ زندگی گزار رہا ہے اُس کی کیا حیثیت ہے؟ کائنات میں اُس کی تقدیر کیا ہے؟ اور کائنات کا خالق کون ہے؟ عالم طبیعی اور حیات کا کارخانہ کس منصوبے کے تحت اور کس مقصد کی تکمیل کی خاطر وجود میں آیا'' [۴۶]

یہ تمام سوالات ہر ذی شعور اور احساس رکھنے والے کے ذہن میں وقتاً فوقتاً اُبھرتے ہیں۔ غالبؔ اور اقبالؔ دونوں ہی فلسفیانہ مزاج کے مالک تھے۔ لہٰذا دونوں حقیقت کائنات کو سمجھنا اور سمجھانا چاہتے ہیں غالبؔ پر جب تحیر کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو استعجاب کی حالت میں وہ یہ استفسار کرتے نظر آتے ہیں کہ جب عالم میں تو ہی تو ہے اور تیرے سوا کسی شے کی کوئی حقیقت نہیں تو پھر دنیا کی یہ ہنگامہ آرائی کس لئے؟ ایک صوفی کی طرح غالبؔ بھی اس سوال کا جواب پانے کے لئے سرگرداں ہیں کہ وجود کیا ہے؟ ہستی کسے کہتے ہیں؟ سبزہ وگل کا وجود، کیا اِن سب کی نوعیت ایک ہی ہے؟ درج ذیل غزل کے اشعار ملاحظہ کیجئے جہاں وہ حقیقت کی جستجو میں سوال کرتے ہیں کہ:

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود

پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟

ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟

غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟

شکن زلف عنبریں کیوں ہے؟

نگہہ چشم سرمہ سا کیا ہے؟ [۴۷]

صوفی نہ ہوتے ہوئے بھی یہاں غالبؔ اس مقام حیرت سے دوچار ہیں جس سے ایک صوفی کو سابقہ پڑتا ہے اِسی لئے اُن کا انداز استفہامیہ ہے۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا؟ [۴۸]

اِس اعتبار سے غالبؔ پہلا شاعر ہے جس نے داخلی دنیا سے قدم باہر نکالا اور وسیع کائنات کا مشاہدہ کیا۔ عالم خارجی کے ٹھوس حقائق کو پرکھا اور حیات انسانی کے داخلی مسائل پر اُن کا انطباق کیا۔

کائنات کے وسیع اور پیچیدہ طلسم کو جاننے کے لئے انسان اُس وقت سے سرگرداں ہے جب سے اُسے شعور اور احساس کی دولت ملی ہے وہ اس کائنات کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ تکوینی نظام سے پرے اُس حقیقت کا کھوج لگانے کے لئے بھی بے چین رہتا ہے جس کو جانے اور سمجھے بغیر خود اُس کا اپنا وجود بے معنی نظر آتا ہے۔ غالبؔ کی طرح اقبالؔ بھی اِس ادھیڑ بُن میں مصروف نظر آتے ہیں۔ کہ ایں کہنہ سرا چیست ؟ یہ تمام سوالات ایک صوفی کی حیرت اور استعجاب کے آئینہ دار ہیں۔

گل گفت کہ ہنگامۂ مرغان سحر چیست؟

ایں انجمن آراستہ بالائے شجر چیست؟

ایں زیر و زبر چیست؟

پایانِ نظر چیست؟

خارگلِ تر چیست؟

تو کیستی و من کیم ایں صحبت ما چیست؟

برشاخِ من ایں طائرکِ نغمہ سرا چیست؟

مقصود نوا چیست؟

مطلوب صبا چیست؟

ایں کہنہ سرا چیست؟ ۴۹

گل شاعرانہ زباں میں شبنم سے سوال کرتا ہے کہ مرغان چمن کا یہ ہنگامہ کس لئے ہے؟ مقصود نوا اور مطلوب صبا کچھ ہے یا نہیں۔ خار، گلِ تر اور پایانِ نظر کی حقیقت کیا ہے؟

کائنات میں ہر طرف قدرت کے صدہا جلوے روبرو ہیں۔ انہیں دیکھنے اور سمجھنے کی تاب و طاقت انسان کے بس سے باہر ہے۔ وہ دنگ ہے کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھے اِسے خیال کی ترجمانی غالبؔ یوں کرتے ہیں۔

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اُٹھایئے

طاقت کہاں کہ دید کا احساں اُٹھایئے ۵۰

جبکہ اقبالؔ اپنے مخصوص پیامیہ انداز میں کہتے ہیں۔

کھولی ہیں ذوق دید نے آنکھیں تری اگر

ہر رہگزر میں نقشِ کفِ پائے یار دیکھ ۵۱

آدمی دیکھتے دیکھتے تھک جاتا ہے لیکن قدرت کی جلوہ افروزیوں میں کوئی کمی نہیں آنے پاتی۔ غالبؔ کے خیال میں عالمِ آئینہ ایک سربستہ راز ہے جو ظاہر ہے وہ بھی اور جو نہاں ہے وہ بھی۔ اِس راز کو پانے کے لئے مشاہدے کی گہرائی چاہیے۔

لیکن مشاہدے کے باوجود بھی جب نگاہ ہر بار ناکام ہی لوٹے تو پھر کیا اُمید باقی رہ جاتی ہے بقول غالبؔ

ناکامیِ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز

تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی ۵۲؎

ایک جگہ اپنے ''دل ناعاقبت اندیش'' کو سمجھاتے ہوئے کہتے ہیں:

اے دل نا عاقبت اندیش، ضبطِ شوق کر

کون لاسکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست ۵۳؎

یا

کہہ سکے کون کی یہ جلوہ گری کس کی ہے

پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اُٹھائے نہ بنے ۵۴؎

اقبالؔ بھی غالبؔ کی طرح جلوۂ حق کو دیکھنے کے تمنائی نظر آتے ہیں اور اس آرزو کا اظہار یوں کرتے ہیں:

کبھی اے حقیقت منتظر، نظر آ لباسِ مجاز میں

کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں ۵۵؎

اقبالؔ اس حقیقت سے باخبر تھے کہ حق کی نشانیوں کو اپنے باطن میں دیکھ کر ہی حق کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ دیدۂ دل کو وا کیے بغیر حق تک رسائی ناممکن ہے۔ غالبؔ کی غزل ہی کی زمین میں لکھے گئے اقبالؔ کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی

ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

ہو دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر

ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی ۵۶؎

ایک اور جگہ فرماتے ہیں

عینِ وصال میں مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا

گرچہ بہانہ جو رہی میری نگاہِ بے ادب ۵۷؎

غالبؔ نے مضامینِ تصوف میں اچھوتے نکات پیدا کیئے۔ وہ روایت کی پاسداری کے باوجود پرانے خیالات کو نئی معنویت عطا کرتے ہیں بقول احتشام حسین

''حقیقت کی جستجو نے انہیں بت شکن بنادیا'' ۵۸

غالبؔ نے اپنے وجودی فلسفے پر مبنی خیالات کو ترکِ دنیا کے ساتھ نہیں ملایا۔ وہ اِس نتیجے پر پہنچے نظر آتے ہیں کہ یہ کائنات ارتقاء پذیر ہے۔ لحہ بہ لحہ تخلیق کا سلسلہ جاری وساری ہے:

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں ۵۹

یہاں غالبؔ اور اقبالؔ کی فکری راہیں ملتی نظر آتی ہیں کیونکہ اقبالؔ بھی ارتقائے حیات کے قائل ہیں۔ اقبالؔ ڈاکٹر نکلسن کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

''دنیا ایسی چیز نہیں جس کی تکمیل ختم ہوگئی ہے، بلکہ یہ ابھی معرضِ تکمیل میں ہے۔ تخلیق کا سلسلہ جاری ہے اور انسان بھی اس تخلیق میں اپنا حصہ ادا کر رہا ہے۔ قرآن میں بھی خدا کے سوا دوسرے خالقین کے موجود ہونے کا امکان ہے۔۔۔۔۔'' ۶۰

نیز فرماتے ہیں:

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دما دم صدائے کن فیکون ۶۱

اقبالؔ کے نزدیک کارخانہ قدرت میں انسان ایک منفعل ہستی نہیں کیونکہ کائنات کی ہر نا تمام چیز اپنی تکمیل کے لئے انسانی سعی کی محتاج ہے اقبالؔ کے خیال میں انسان کے لئے مقدر ہو چکا ہے کہ وہ اپنی گرد و پیش کی کائنات کی گہری آرزوؤں میں شریک ہو اور اس طرح خود اپنے مقدر، اور کائنات کی تقدیر کی تشکیل کرے۔ یہاں اقبالؔ کا تصوف، تصورِ خودی کا تابع ہو جاتا ہے۔ انسان اپنی خودی کے ذریعے کائنات اور ذات خداوندی میں تعلق قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے اور شعور کے اس مرکزی نقطے یعنی خودی سے عالم کی وحدت کا اظہار ہوتا ہے:

خودی کی جلوتوں میں مصطفائیؐ
خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی ۶۲

معرفتِ نفس سے معرفت الٰہی کی منزل آسان ہو جاتی ہے جب تک انسان اپنی فطرت کی تقاضوں اور اشاروں کو نہ سمجھے وہ حقیقت کی کنہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ خودی سے خدا بے حجاب ہوتا ہے اور خدا سے خودی اِسی لئے فرماتے ہیں:

تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود

مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا

وجود کیا ہے فقط جوہرِ خودی کی نمود

کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا ۶۳

اسی لئے کائنات کے تخلیقی ارتقاء کے لئے اقبالؔ مقاصد آفرینی، تحرک اور عمل پر بے حد زور دیتے ہیں۔

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم

از شعاعِ آرزو تابندہ ایم ۶۴

اقبالؔ کی طرح غالبؔ بھی اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ آرزوؤں کی پرورش کے بغیر زندگی میں کوئی لطف نہیں۔ آرزوؤں کے فروغ ہی سے زندگی میں تحرک اور جان ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اقبالؔ کی آرزومندی کی نوعیت اجتماعی ہے جبکہ غالبؔ انفرادی اور شخصی آرزومندی کا ذکر کرتے ہیں۔ تاہم وہ بھی یہی تلقین کرتے ہیں کہ

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ

اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ ۶۵

غالبؔ کے غم کے پس پردہ بھی طلب و اُمید کا اثباتی پہلو روشن نظر آتا ہے، جس سے لذتِ طلب اور لذتِ آرزو کا احساس پیدا ہوتا ہے:

نہ لائے شوخیِ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی

کفِ افسوس ملنا، عہدِ تجدیدِ تمنا ہے ۶۶

فضیلت آدم:

انسانی عظمت تصوف کا اہم موضوع رہا ہے۔ یہ امر باعث حیرت ہے کہ غالبؔ کائنات کو فریب نظر کہتے ہیں لیکن انسان کی عظمت کا اعتراف بھی کرتے ہیں کیونکہ انسان کو کائنات میں فعالی حیثیت حاصل ہے دنیا کا سارا تماشا

اُسی کی نگاہوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ اِسی لئے فرماتے ہیں۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
ہوتا نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا، مرے آگے ۶۷

غالبؔ کے خیال میں اگر چہ ہر آدمی انسان ہے اِس کے باوجود آدمی کے لئے انسان کامل بننا انسانیت کی معراج تک پہنچ جانا آسان نہیں:

بسکہ دشوار ہے، ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا ۶۸

غالبؔ کی طرح اقبالؔ بھی فضلیتِ آدم کا جابجا اظہار کرتے ہیں وہ اس خیال کے خامی ہیں کی کسی بھی تہذیب کا اعلیٰ معیار یہ ہے کہ اس میں فضلیت انسانی کو تسلیم کیا جائے کیونکہ انسان کا مرتبہ ساری کائنات سے بلند ہے۔

مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو، جاوداں تو ہے ۶۹

انسانی فضلیت کے باب میں غالبؔ اور اقبالؔ اسلامی روایات کو تسلیم کرتے ہیں۔ قرآن کریم میں انسانی عظمت کا اعتراف کیا گیا ہے، اُسے نیابت الٰہی کا حقدار ٹھہرایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُسے اشیا کا علم عطا کیا اور اسے اپنے لازوال مظاہر کا مظہر بنایا اور فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے سامنے سجدہ ریز ہوں۔ انسان کی فہم وفراست اور تصرفات کی کوئی انتہا نہیں۔ اِسی لئے غالبؔ اور اقبالؔ اپنے اپنے سماج میں ہونے والی تذلیل انسانیت پر تڑپ اُٹھتے ہیں اور غالبؔ خدا سے شکوہ سنج ہوتے ہیں کہ

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں ۷۰

جبکہ اقبالؔ یہی شکایت اپنے انداز خاص میں اس طور کرتے ہیں۔

اِسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن

زوالِ آدمِ خاکی، زیاں تیرا ہے یا میرا ا؎

غالبؔ انسان کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لئے ایک نہایت بلیغ مضمون فارسی شعر میں یوں ادا کرتے ہیں:

حق را ز خلق جُو کہ نوآموزِ دیدرا

آئینہ خانہ مکتب توحید بودہ است ۲؎

یعنی اگر تو ذاتِ واحد کو پانا چاہتا ہے تو اُسے خلقت میں تلاش کر۔ یہ کائنات آئینہ خانہ مکتبِ توحید کے مصداق ہے کہ یہاں کا ذرہ ذرہ اُس کی وحدانیت کی گواہی دے رہا ہے۔ کم وبیش اسی خیال کو اقبالؔ کچھ یوں پیش کرتے ہیں

کھولی ہیں ذوق دید نے آنکھیں تری اگر

ہر رہگذر میں نقش کف پائے یار دیکھ ۳؎

اقبالؔ کے نزدیک اثبات وتکمیلِ ذات کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے وجود کا ادراک اور مشاہدہ خود کرے اور اپنی دنیا نئے حالات وحقائق کے مطابق خود تخلیق کرے۔

وہی جہاں ہے ترا جس کو تُو کرے پیدا

یہ سنگ وخشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے ۴؎

یا

ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی

نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی ۵؎

غالبؔ کے خیال میں انسان کے علم وحکمت کی کوئی انتہا نہیں۔ اسی کی بدولت وہ تسخیر جہات کرتا ہے اور اپنے وجود کا سکّہ کائنات پر بٹھاتا ہے۔ نظامِ کائنات میں انسان کی فطرت اِس لئے مطمئن نہیں کہ وہ اِس سے بہت زیادہ کا طلبگار ہے۔ اُس کی تمناؤں کی کوئی حد اور انتہا نہیں۔ حق تعالیٰ دونوں جہان انسان کو عطا فرما کر یہ سمجھا کہ وہ مطمئن ہے لیکن غالبؔ کہتے ہیں:

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا

یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں ۶؎

حقیقت یہ ہے کہ دونوں جہان بھی انسان کی عظمت اور ہمت کے آگے ہیچ ہیں بقول علامہ اقبالؔ:

ہے یاد مجھے نکتۂ سلمانِ* خوش آہنگ

دنیا نہیں مردان جفاکش کے لئے تنگ ۷ے

غالبؔ اور اقبالؔ دونوں کے ہاں آرزومندی روحانی عمل ہے اسی کی بدولت انسان کائنات کے نظام میں بے بس اور منفعل ہستی نہیں رہتا بلکہ وہ اپنی تمناؤوں سے اپنے آپ کو نت نئے تجربوں میں الجھا تا رہتا ہے اِسی سے تمدن کی تخلیق ہوتی ہے۔ غالبؔ اس خیال کے حامی تھے کہ ''دشت اِمکاں'' جس میں فطرت اور معاشرہ دونوں شامل ہیں زندگی کے دائمی سفر میں نقش پا'' سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ غالبؔ کو حیرت ہے کہ دشت اِمکاں کے بعد نفس انسانی کا دوسرا قدم کہاں اور کس عالم میں جا کر پڑے گا۔ وہ فرماتے ہیں۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب

ہم نے دشت اِمکاں کو ایک نقش پا پایا ۸ے

اقبالؔ اپنے مخصوص، شاعرانہ انداز میں بتاتے ہیں کہ جب حضرت آدمؑ جنت سے زمین پر اترے تو روحِ ارضی نے اُن کا والہانہ استقبال کیا اور یقین دلایا کہ میرے تمام پوشیدہ خزانے تیرے تصرف کے لئے ہیں اور تو اپنے تدبر اور فکر کی بدولت فطرت کو بآسانی تسخیر کر سکتا ہے۔

خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں

آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں

جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں

جنت تری پنہاں ہے ترے خون جگر میں

اے پیکرِ گل! کوششِ پیہم کی جزا دیکھ! ۹ے

غالبؔ کے خیال میں حضرتِ انسان کا مرتبہ دونوں جہان سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ ان کی ہمت عالی دنیا اور عقبیٰ کے عوض بک جانا اپنی توہین سمجھتی ہے۔ ایک عالم کو وہ نقد اور دوسرے کو ادھار کہتے ہیں انسان کی قدر و قیمت یہ ہے کہ اُسے نہ تو نقد دنیا اور نہ نسیہ عقبیٰ کے بدلے خریدا جا سکتا ہے۔ انسان کی قیمت خود اُس کی انسانیت ادا کرے تو کرے ورنہ یہ کسی دوسرے کے بس کی بات نہیں:

*: سلمان، مسعود، سعد سلمان غزنوی دور کا نامور ایرانی شاعر جو غالباً لاہور میں پیدا ہوا۔

نسیہ و نقد دو عالم کی حقیقت معلوم
لے لیا مجھ سے میری ہمت عالی نے مجھے ۸۰؎

غالبؔ عظمت انسان کے اس حد تک قائل نہیں کہ فرماتے ہیں کہ میرا دل صرف میرا دل ہی نہیں بلکہ ساری کائنات کی دھڑکنیں اِس میں سنائی دیتی ہیں اِس لئے میں دو عالم پر فریفتہ ہوں کہ میری بدولت ہر ذرّے کا جام، سرشارِ تمنا ہے۔

جام ہر ذرہ ہے سر شارِ تمنا مجھ سے
کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے ۸۱؎

انسان کی عظمت کا راز اُس کے دائمی اضطراب میں پنہاں ہے کیونکہ سینکڑوں قیامتوں کو یکجا کر کے ہم آمیز کیا تو انسان کا خمیر تیار ہوا ہے اِسی لئے انسان کی ہنگامہ خیزیاں روزِ محشر کے ہنگاموں سے بڑھ کر ہیں۔

صد قیامت بگدازند و باہم آمیز اند
تا خمیرِ دلِ ہنگامہ گزیں تو شود ۸۲؎

زندگی کی ہنگامہ زائیاں اور گہما گہمی انسانی دل یعنی جذبات کی رہین منت ہیں۔انسان عمل پیہم سے کام لے کر اپنی اور عالم کی تخلیق کا راز دار بنتا اور اپنی مخفی قوتوں کو بیدار کر کے تکمیل حیات کرتا ہے۔یہ نہایت بلیغ موضوع ہے جسے غالبؔ اور اقبالؔ دونوں نے بڑی بلاغت سے ادا کیا ہے۔انسانی دل کی یہی ہنگامہ خیزی اُسے ایسا اعتماد بخشتی ہے کہ وہ نہ صرف فطرت کو تسخیر کرتا ہے بلکہ تمدن میں بھی اپنی منشا کے مطابق تصرفات کرتا ہے۔اِس تخلیقی اعتماد کا نظارہ غالبؔ کی درج ذیل غزل کے اشعار سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

بیا کہ قاعدہ آسماں بگردانیم
قضا بہ گردش رِطل گراں بگردانیم

اگر زشحنہ بود گیر و دارِ نندیشیم
وگر زشاہ رسد ارمغاں بگردانیم

اگر کلیم شود ہم زباں سخن نکنیم
وگر خلیل شود میہماں بگردانیم

بمن وصال تو باور نمی کند غالبؔ
بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم ۸۳؎

آسماں کی روش کو بدل ڈالنے، شب وروز کے چکر میں مقید ہونے کی بجائے اِسے توڑ پھینکنے، اپنے لئے نیا جہان اور نئی تکوین بنانے، آسمان کے بنائے ہوئے قاعدے توڑ کر نئے قانون اور تقاضے وضع کرنے کی خواہش اور مطالبے سے آدم کی بلند ہمتی کا اظہار ہوتا ہے۔

اقبالؔ کا انسانِ کامل بھی حیات وکائنات کے قوانین کا اسیر نہیں بلکہ حیات وکائنات کو اسیر کرنے والا ہے۔ وہ عناصر فطرت کو قبضے میں لے کر ان کو مرضی کے مطابق موڑتا ہے۔ وہ وقت کا شکار نہیں بلکہ وقت اُس کے قبضے میں ہوتا ہے۔ عرفانِ خودی کی بدولت اُسے وہ قوت عطا ہوتی ہے کہ حیات وکائنات کے اسرار اُس پر منکشف ہونے لگتے ہیں وہ اپنے عمل سے تجدیدِ حیات کرتا ہے بقول ڈاکٹر یوسف حسین خان

"اپنے نفس میں فطرت کی تمام قوتوں کو مرتکز کرنے سے مردِ مومن میں تسخیر عناصر کی غیر معمولی صلاحیتں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جن کے باعث وہ اپنے آپ کو نیابت الٰہی کا اہل ثابت کرتا ہے اور اُس کی نظر افراد کے افکار میں زلزلہ ڈال دیتی ہے اور اقوام کی تقدیر میں انقلاب پیدا کر دیتی ہے۔۔۔" ۸۴؎

درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجئے۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں ۸۵؎

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالبؔ و کار آفریں کار کُشا، کار ساز ۸۶؎

الغرض غالبؔ اور اقبالؔ دونوں انسان کی عظمت کو دل سے تسلیم کرتے ہیں اور شرف انسانیت کے قائل ہیں۔

حکمت لا اور اِلاَّ:

عربی زبان میں لا'' حرف نفی ہے اور'' اِلاَّ '' حرف استثنیٰ لا اور الا تصوف کی دو اہم اصطلاحات ہیں جہاں'' لا''
سے مراد ہے'' نفی ءغیر اللہ'' جبکہ اِلاَّ سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور ذات وصفات کا اثبات۔ اسلام کی بنیاد کلمہ
توحید ہے یعنی لا الہ الا اللہ۔۔۔ اِس کا پہلا جزو ہے جو اس بات کا اقرار ہے کہ'' کائنات میں کوئی بھی معبود برحق نہیں'
سوائے اللہ تعالیٰ۔

غالبؔ توحیدِ وجودی کی قائل تھے اِس لئے یہ موضوع ان کی شاعری کا جزوِ لاینفک بن گیا۔ غالبؔ کے تصوف
میں'' لا'' یعنی نفی کا پہلو مختلف صورتوں میں نمایاں نظر آتا ہے لیکن بقول شیخ محمد اکرام'' آخر میں عارفانہ توازن'' ۸۷؎ کا
سراغ بھی ملتا ہے۔

اسلام میں'' لا '' اور'' الاّ '' لازم وملزوم ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے واحد و لاشریک ہونے پر ایمان رکھنے کے ساتھ
ساتھ یہ بھی لازم ہے کہ اولاً ہم بہ صمیم قلب غیر اللہ کی نفی کریں اور پھر اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور اس کے معبود واحد
ہونے کا اثبات۔ کیونکہ ایمان کی تکمیل نفی واثبات دونوں پر منحصر ہے۔ ہر ایسی نفی جس کے بعد اثبات نہ ہو، محض کفر والحاد
ہے۔ علامہ اقبالؔ کے کلام میں نفی اور اثبات کا یہی قرآنی تصور کارفرما ہے۔ اُن کے نزدیک

لا و الاَّ ساز و برگ اُمتاں
نفی بے اثبات مرگ اُمتاں ۸۸؎

ڈاکٹر یوسف حسین خان اقبال کی حکمت لا اور الاّ کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

'' جب تک انسان اصولِ توحید سے واقف نہ ہو، اُس وقت تک وہ غیر اللہ کی زنجیروں کو نہیں توڑ سکتا۔ اسی لاَّ الہ
کو اقبالؔ نقطہ ادوارِ عالم اور نہتائے کار عالم قرار دیتا ہے کہ بغیر اِس کے زندگی سعادت اَزلی سے ہم آغوش نہیں ہوسکتی۔

تا نہ رمزِ لا الہ آید بدست
بند غیر اللہ را نتواں شکست'' ۸۹؎

ڈاکٹر شیخ محمد اکرام کے خیالات کی روشنی میں:

'' غالبؔ کے خیال میں نفی (لا) کا عنصر بڑا تھا۔ لیکن اِس کے برعکس اثبات کی خواہش بھی زبردست
تھی۔ اُن کے تخیل اور ماحول میں کشمکش جاری تھی، اس کے یہ دونوں پہلو تھے۔ اور اثبات کو زندگی

اُن کی ہمت سے ملتی:

ساقیِ ہمت کہ صلا مے دہد
بادہ زخمخانہ لا مے دہد
ہمت اگر بال کشائی کند
صعوہ تو اند کہ ہمائی کند
ہمتِ ما غیرتِ حق است و بس
کثرتِ ما وحدتِ حق است و بس

مرزا کے اثبات کا دوسرا ذریعہ نفی تھی۔ اُن کی طبع سلیم کو خالص منفیانہ نقطہ نظر یعنی نفی کی خاطر نفی ناپسند تھا۔

اے گرفتار خم پیچ و خیال
نفی بے اثبات نبود جز ضلال

وہ اُس ''آگاہی'' کو جس کا نتیجہ افسردگی کے سوا کچھ نہ ہو، پسند نہ کرتے تھے:

دریغ آگاہی گر افسردگی گرددسرو برگش
زمستی بہرہ جز غفلت نباشد ہوشیاراں را

مرزا اپنی نگہ خاراشگاف سے وہ ثبات وقرار ڈھونڈ لیتے جو ناکامی کی گہرائیوں میں پنہاں ہے:

ہم فروغ شمعِ ہستی تیرگی خواہدگزید
ہم بساطِ بزمِ مستی پُر شکن خواہد شدن

نفی واثبات کی کشمکش کا مستقل فلسفیانہ حل مرزا نے وحدت الوجود میں تلاش کیا یعنی لاموجود الا اللہ اور لاموثر فی الوجود غیر اللہ۔ جس اُردو قصیدہ میں مرزا غالبؔ نے نفی پر سب سے زیادہ زور دیا تھا۔ بعد میں اُنہوں نے اس میں ایک نیا مطلع اضافہ کیا اور شدتِ نفی کا تریاق پیش کیا:

دہر جز جلوہ یکتائیِ معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

جب لا کے ذکر میں مرزا حد سے گزرنے لگتے تو فوراً ''الاّ'' کی خواہش ابھر آتی اور وہ اپنے آپ کو روک دیتے

مد ہوش رہ و رسم فنا یم خبرم نیست
بیخویش قدح میزنم از حمکدہ لا
ایمان من ، اے لذتِ دیدار کجائی
در کام مذاقم بہ چکاں رشحۂ اِلّا ۹۰

غالبؔ نواب امین الدین کے نام ایک خط میں اپنے صوفیانہ عقائد کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''۔۔۔میں موحّد خالص اور مومن کامل ہوں۔زبان سے لا الٰہ اِلّا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجود اِلّا اللہ،لا موثر فی الوجود اِلّا اللہ سمجھا ہوا ہوں''۹۱

عمر کے آخری حصّہ میں یہی اقرار درج ذیل الفاظ میں کرتے ہیں۔

''میں موحّد ہوں،ہمیشہ تنہائی اور سکوت کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں۔لا الٰہ اِلّا اللہ،لا موجود اِلّا اللہ،لا موثر فی الوجود اِلّا اللہ''۔۹۲

حقیقت یہ ہے کہ صوفیاء کے عمومی تصورات کے زیر اثر مادے کی نفی اور زندگی کے بارے میں سلبی اور انفعالی نظریات رائج ہو گئے تھے۔جس کی بدولت نفس کشی،خواہشات کی نفی،بے عملی اور زندگی سے گریز نے فروغ پایا لیکن غالبؔ کے ذہن نے قدیم صوفیا کی تمام منفی کیفیات کو قبول نہیں کیا۔عالم کو ''حلقہ دامِ خیال'' اور ''فریبِ نظر'' قرار دینے کے باوجود اُن کے یہاں ذات کی نفی کا اظہار نہیں ملتا۔اُن کی انانیت اور خودداری عرفانِ ذات ہی کا نتیجہ ہے۔

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی ۹۳

اِس اعتبار سے غالبؔ کے صوفیانہ خیالات کو غالبؔ اور اقبالؔ کے درمیان کی ایک کڑی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اقبالؔ نے اپنی علمی تجلّیات کی روشنی میں صوفیانہ حقائق کو مستقل فلسفہ حیات کی صورت میں پیش کیا جسے فلسفہ خودی کہتے ہیں۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری اِس فلسفہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''اِس فلسفے میں خدا بینی و خود بینی لازم و ملزوم ہیں۔خود بینی' خدا بینی میں حارج نہیں بلکہ معاون ہے۔خودی کا احساس،ذات خداوندی کا ادراک؛اور ذات خداوندی کا ادراک خودی کے احساس کا اثبات و اقرار ہے۔خدا کو فاش تر دیکھنے کیلئے خود کو فاش تر دیکھنا از بس ضروری ہے:

اگر خواہی خدا را فاش دیدن

خودی را فاش تر دیدن بیا موز" ۹۴

اقبالؔ کے خیال میں لا الہ الا اللہ کا اصل راز خودی ہے، توحید، خودی کی تلوار کو آبدار بناتی ہے اور خودی توحید کی حفاظت کا فریضہ سرانجام دیتی ہے:

خودی کا سرّ نہاں لا الٰہ الاّ اللہ

خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الاّ اللہ ۹۵

ایک مسلمان کے ایمان کی تکمیل اِسی "نفی و اثبات" پر منحصر ہے زندگی صرف مقام "لا" پر ساکن و جامد ہو کر نہیں رہ جاتی بلکہ کائنات کی فطرت یہ ہے کہ وہ "الا" یعنی اثبات کی جانب تیزی سے گامزن ہے

درمقام لا نیا ساید حیات

سوئے اِلاّ می خرامد کائنات ۹۶

"ضرب کلیم" میں "لا اور اِلاّ" کے زیر عنوان نظم میں فرماتے ہیں

نہادِ زندگی میں ابتدا "لا" انتہا "اِلاّ"

پیام موت ہے جب لا ہوا اِلاّ سے بیگانہ

وہ ملت روح جس کی "لا" سے آگے بڑھ نہیں سکتی

یقین جانو ہوا لبریز اُس ملت کا پیمانہ ۹۷

اقبالؔ کے خیال میں ہر ایسی نفی جس کے بعد اثبات نہ ہو، محض کفر اور الحاد ہے اور ایمان و یقین کا اس میں کوئی شائبہ تک نہیں۔ اقبالؔ اپنی نظم "لا الٰہ الاّ اللہ" میں وضاحت کرتے ہیں کہ انسان پر کائنات کے اسرار و رموز صرف اُسی صورت میں فاش ہو سکتے ہیں جبکہ وہ بیک وقت "لا" اور "اِلا" کا قائل ہو کیونکہ "لا" قوموں کے لئے سراپا جلال ہے اور "الاّ" سراپا جمال:

نکتۂ می گویم از مردانِ حال

امتاں را "لا" جلال "اِلاّ" جمال

لا و الّا احتساب کائنات

لا و الّا فتح باب کائنات

تا نہ رمز لا الہ آید بدست

بندِ غیر اللہ را نتواں شکست ۹۸

الختصر اقبالؔ نے قرآن وسنت پر غور وتدبر کے بعد اسلامی تصوف کی جو بنا اُستوار کی وہ اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔

حوالہ جات

۱۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۷۵

۲۔ آل احمد سرور، دانشورِ اقبالؔ (لاہور: الوقار پبلی کیشنز ۲۰۰۳ء) صفحہ ۱۹۲

۳۔ عبدالرحمٰن بجنوری، مقدمہ دیوانِ غالبؔ جدید المعروف بہ نسخہ حمیدیہ۔ صفحہ ۳۳

۴۔ حالیؔ، یادگارِ غالبؔ، صفحہ ۶۵

۵۔ ایضاً، صفحہ ۷۲، ۷۳

۶۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۱۴۳

۷۔ ایضاً، صفحہ ۲۵۶

۸۔ ایضاً، صفحہ ۳۱۷

۹۔ ایضاً، صفحہ ۴۵

۱۰۔ نقوش، غالبؔ نمبر، شمارہ ۱۱۱ (لاہور: ادارۂ فروغِ اُردو فروری ۱۹۶۹ء) صفحہ ۵۷۹

۱۱۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۵۱

۱۲۔ ایضاً، صفحہ ۱۳۲

۱۳۔ ایضاً، صفحہ ۴۲

۱۴۔ ایضاً، صفحہ ۴۵

۱۵۔ ایضاً، صفحہ ۱۳۴

۱۶۔ نقوش، غالبؔ نمبر، فروری ۱۹۶۹ء، صفحہ ۵۸۸

۱۷۔ نیاز فتح پوری، ولی بادہ خوار از احوال ونقدِ غالبؔ مرتبہ محمد حیات خان سیال (لاہور: الائیڈ بک سینٹر، ۲۰۰۳ء) صفحہ ۴۳۵

۱۸۔ محمد اکرام، ڈاکٹر، شیخ، حکیمِ فرزانہ، صفحہ ۱۰۶

۱۹۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اقبالؔ سب کے لئے، صفحہ ۳۴

۲۰۔ اقبالؔ، بانگِ درا، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۹۶

۲۱۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۳۳۱

۲۲۔ ایضاً، صفحہ ۳۲۰

۲۳۔ جاوید اقبالؔ، ڈاکٹر، زندہ رود (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز ۱۹۸۳ء) صفحہ ۲۳۰

۲۴۔ اقبلا، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۵۲۰

۲۵۔ حالیؔ، یادگارِ غالبؔ، صفحہ ۸۰

۲۶۔ ایضاً، صفحہ ۸۱

۲۷۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۱۳۲

۲۸۔ ایضاً، صفحہ ۴۵

۲۹۔ ایضاً، صفحہ ۱۳۴

۳۰۔ ایضاً، صفحہ ۲۶۹

۳۱۔ ایضاً، صفحہ ۱۶۶

۳۲۔ ایضاً، صفحہ ۱۳۲

۳۳۔ ایضاً، صفحہ ۱۳۹

۳۴۔ ایضاً، صفحہ ۱۳۱

۳۵۔ ایضاً، صفحہ ۲۴۶

۳۶۔ ایضاً، صفحہ ۱۰۵

۳۷۔ ایضاً، صفحہ ۱۳۲

۳۸۔ اقبالؔ، بانگِ درا، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۸۵

۳۹۔ ایضاً، صفحہ ۱۳۷

۴۰۔ ایضاً، صفحہ ۱۳۸

۴۱۔ اقبالؔ، اسرارِ خودی اور تصوف، بشمولہ اخبار ''وکیل'' امرتسر ۱۵ جنوری ۱۹۱۴ء

۴۲۔ اقبالؔ، اسرارِ خودی، کلیاتِ اقبالؔ فارسی، صفحہ ۳۳

۴۳۔ اقبالؔ، باقیاتِ اقبالؔ، مرتبہ عبدالوحد معینی، سید (کراچی: مجلسِ اقبالؔ ۱۹۵۲ء) صفحہ ۱۸۷۔۱۸۸

۴۴۔ اقبالؔ، اقبالؔ نامہ، حصہ دوم (مجموعہ مکاتیبِ اقبالؔ) مرتبہ عطااللہ شیخ، صفحہ ۴۲

۴۵۔ اقبالؔ، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۴۹۶

۴۶۔ یوسف حسین، ڈاکٹر، خان، روحِ اقبالؔ، صفحہ ۳۴۷

۴۷۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۲۵۰

۴۸۔ ایضاً، صفحہ ۴۸

۴۹۔ اقبلا، پیامِ مشرق، کلیاتِ اقبالؔ فارسی، صفحہ ۲۸۹۔۲۹۰

۵۰۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۱۶۰

۵۱۔ اقبالؔ، بانگِ درا، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۹۸

۵۲۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۱۹۹

۵۳۔ ایضاً، صفحہ ۵۶

۵۴۔ ایضاً، صفحہ ۲۶۷

۵۵۔ اقبالؔ، بانگِ درا، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۲۸۰

۵۶۔ ایضاً، صفحہ ۱۰۲

۵۷۔ اقبالؔ، بالِ جبریل کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۲۰۶

۵۸۔ احتشام حسین، غالبؔ کی بت شکنی از احوال ونقدِ غالبؔ مرتبہ محمد حیات سیال، صفحہ ۵۶۳

۵۹۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۱۳۲

۶۰۔ اقبالؔ، اقبالؔ نامہ حصہ اول (مجموعہ مکاتیبِ اقبالؔ) مرتبہ عطااللہ شیخ، صفحہ ۴۵۸

۶۱۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۳۲۰

۶۲۔ ایضاً، صفحہ ۳۷۵

۶۳۔ اقبالؔ، اسرارِ خود، کلیاتِ اقبالؔ فارسی، صفحہ ۴۹۶

۶۴۔ اقبالؔ، اسرارِ خودی، کلیاتِ اقبالؔ فارسی، صفحہ ۱۷

۶۵۔ غالبؔ، دیوانِ غالب جدید، صفحہ ۶۳

۶۶۔ ایضاً، صفحہ ۱۸۹

۶۷۔ ایضاً، صفحہ ۲۷۴۔۲۷۵

۶۸۔ ایضاً، صفحہ ۲۰

۶۹۔ اقبالؔ، بانگِ درا کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۲۶۹

۷۰۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۱۳۲

۷۱۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۲۹۸

۷۲۔ غالبؔ، کلیاتِ غالبؔ فارسی، جلد سوم، صفحہ ۸۳

۷۳۔ اقبالؔ، بانگِ درا، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۹۸

۷۴۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۳۶۰

۷۵۔ اقبالؔ، بانگِ درا، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۲۷۴

۷۶۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۱۳۵

۷۷۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۳۶۸

۷۸۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۴

۷۹۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۴۲۵

۸۰۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۲۴۶

۸۱۔ ایضاً، صفحہ ۲۳۱

۸۲۔ غالبؔ، کلیاتِ غالبؔ فارسی، جلد سوم، صفحہ ۱۵۳

۸۳۔ ایضاً، صفحہ ۲۹۳۔۲۹۴

۸۴۔ یوسف حسین، ڈاکٹر، خان، روحِ اقبالؔ، صفحہ ۲۰۴

۸۵۔ اقبالؔ، بانگِ درا، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۲۷۱

۸۶۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۳۸۹

۸۷۔ محمد اکرام، ڈاکٹر، شیخ، حکیم فرزانہ، صفحہ ۱۰۸

۸۸۔ اقبالؔ، پس چہ باید کرد، کلیاتِ اقبالؔ فارسی

۸۹۔ ایضاً، صفحہ ۸۱۳

۹۰۔ محمد اکرام، ڈاکٹر، شیخ، حکیم فرزانہ، صفحہ ۱۰۹۔۱۱۰

۹۱۔ غالبؔ، خطوطِ غالبؔ، مرتبہ غلام رسول مہر، صفحہ ۶۹

۹۲۔ ایضاً، صفحہ ۴۴۷

۹۳۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۲۴۳

۹۴۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اقبالؔ سب کے لئے، صفحہ ۶۷

۹۵۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۴۷۷

۹۶۔ اقبالؔ، پس چہ باید کرد، کلیاتِ اقبالؔ فارسی، صفحہ ۸۱۵

۹۷۔ اقبالؔ، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۵۲۵

۹۸۔ اقبالؔ، پس چہ باید کرد، کلیاتِ اقبالؔ فارسی، صفحہ ۸۱۳

غالبؔ اور اقبالؔ کا تصورِ جنت

غالبؔ اور اقبالؔ کا تصورِ جنت

خیالات کی ندرت، مشاہدے کی وسعت، معنی آفرینی کی جستجو اور رسوم و قیود سے گلوخلاصی کی خواہش غالبؔ اور اقبالؔ دونوں کی شاعری کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ خصوصاً جنت، دوزخ اور گناہ و ثواب کے باب میں مروجہ اور روایتی خیالات سے انحراف کرتے ہوئے دونوں شعراء نے جو نادر زاویہ نگاہ اختیار کیا ہے اس میں گہری فکری ہم آہنگی ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ بقول ڈاکٹر یوسف حسین خان:

> ''جنت کے متعلق غالبؔ اور اقبالؔ کے خیالات میں حیرت انگیز مماثلت ملتی ہے۔ دونوں ایسی جنت کے خواہاں نہیں جہاں سکون و عافیت ہو، بیتابی اور اضطراب نہ ہو، یزداں ہو شیطان نہ ہو۔۔۔۔۔'' [۱]

خوش طبعی زندہ دلی اور شوخی و ظرافت غالبؔ کے مزاج کا سب سے نمایاں پہلو ہے جس کے بارے میں حالیؔ ''یادگارِ غالبؔ'' میں فرماتے ہیں:

> ''ظرافت مزاج میں اس قدر تھی کہ اگر ان کو بجائے حیوانِ ناطق کے حیوان ظریف کہا جائے تو بجا ہے۔ حسنِ بیان، حاضر جوابی اور بات میں سے بات پیدا کرنا اُن کی خصوصیات میں سے تھا۔'' [۲]

غالبؔ ایک مخصوص حسنِ مزاح کے مالک تھے اور جس شخص کے مزاج میں یہ خصوصیت ہو وہ ہر بات میں ہنسنے ہنسانے کا پہلو نکال سکتا ہے۔ روتے ہوؤں کو ہنسا سکتا ہے اور مردہ دلوں میں زندگی کی نئی لہر دوڑا سکتا ہے۔ غالبؔ نے اپنی حسِ مزاح ہی کی بدولت مسلمہ حقائق، روایات اور مذہبی عقائد کا جابجا خاکہ اڑایا ہے یہاں تک کہ وہ خود اپنے آپ کو بھی ہدف مزاح بنانے سے نہیں چوکتے۔ حاکمِ وقت کے پوچھنے پر کہ ''کیا تم مسلمان ہو؟'' جواب دیتے ہیں کہ ''ہاں صاحب آدھا مسلمان ہوں یعنی شراب تو پی لیتا ہوں لیکن سؤر نہیں کھاتا۔'' جنت اور دوزخ کے بارے میں غالبؔ کے ہاں ایسے بہت سے اشعار ملتے ہیں جنہیں خالص ادبی مزاح کا نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ جنت کے وجود کے متعلق طنزآمیز شک کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے [۳]

حاتم علی بیگ مہر کے نام خط میں اپنے تصورِ جنت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہوگئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور

ملی۔ اقامت جاودانی ہے اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے۔ اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ وہ حور اجیرن ہو جائے گی۔ طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی، وہی زمردیں کاخ، وہی طوبیٰ کی ایک شاخ، چشم بددور وہی ایک حور۔ بھائی ہوش میں آؤ۔ کہیں اور دل لگاؤ۔'' ؁۴

مذہبی روایات کے مطابق جنت وہ جگہ ہے جہاں انسان کی سب خواہشیں پوری ہو سکیں گی۔ دنیا کی زندگی کے برعکس وہاں انسان کو دائمی سکون و قرار نصیب ہوگا جہاں کوئی فکر و پریشانی لاحق نہ ہوگی۔ ہمہ وقت سکھ اور آرام کا دور دورہ ہوگا۔ لیکن غالبؔ ہوں یا اقبالؔ دونوں کو جنت کا عیش و آرام اور سکون و قرار عزیز نہیں کیونکہ دونوں شعراء کے نزدیک زندگی حرکت و عمل کا دوسرا نام ہے۔ سکون و قرار اور کسی ایک منزل پر پہنچ کر رک جانا ان کے فلسفۂ سخت کوشی اور جفا طلبی کی نفی کرتا ہے اس لئے غالبؔ اور اقبالؔ دونوں جنت کے عیش اور عافیت کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے غالبؔ کہتے ہیں:

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا

وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاقِ نسیاں کا ؁۵

یعنی غالبؔ کے نزدیک زاہد جس جنت کی تعریف و توصیف میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہا ہے ہمارے نزدیک وہ ایک ایسا گلدستہ ہے جسے ہم طاق پر رکھ کر بھول چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس چیز میں انسان کو دلچسپی نہ ہو یا ضرورت نہ ہو وہ اکثر یاد نہیں آتی لہذا ہم نے بھی جنت کو بھلا ڈالا ہے کیونکہ ہمارے نزدیک وہ اس قابل ہی نہیں کہ ہمہ وقت اسے یاد رکھا جائے۔

ڈاکٹر شیخ محمد اکرام غالبؔ اور اقبالؔ کے تصورِ بہشت کے بارے میں فرماتے ہیں:

''اقبالؔ اور غالبؔ کے طرزِ شاعری میں جو فرق ہے اس کی ایک دلچسپ مثال ان کے وہ اشعار ہیں جو انہوں نے بہشت کے متعلق لکھے ہیں۔ بہشت کے متعلق رسمی نقطۂ نظر تو یہ ہے کہ اسے تمام خوبیوں اور آسائشوں کا مخزن سمجھنا چاہیئے لیکن شوخ اور جدت پسند طبیعتیں اس میں بھی عیب نکال سکتی ہیں۔ غالبؔ اور اقبالؔ دونوں نے اس معاملہ میں رواجی نقطۂ نظر سے اختلاف کیا ہے اور بہشت کی نسبت اپنی مایوسی کا اظہار کیا ہے۔'' ؁۶

غالبؔ اور اقبالؔ دونوں کے نزدیک عبادات میں خلوص کو بنیادی اہمیت حاصل ہے وہ عبادت جو کسی صلے کی لالچ اور حصولِ ثواب کی خاطر کی جائے وہ خود غرضی اور ریاکاری پر مبنی ہوتی ہے۔ ایک شعر میں غالبؔ فرماتے ہیں کہ

جب تک بہشت قائم ہے لوگ عبادت صرف اس امید پر کرتے ہیں کہ وہاں شہد اور شرابِ طہور ملے گی۔ بہتر ہے کہ سب سے پہلے بہشت ہی کو دوزخ میں جھونک دیا جائے تا کہ لوگ خلوصِ نیت سے اللہ کی عبادت کرسکیں۔

طاعت میں تا رہے نہ مے وانگبیں کی لاگ

دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو [7]

اسی خیال کی ترجمانی علامہ اقبالؔ کچھ اس طور کرتے ہیں:

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے

اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے [8]

غالبؔ ایسے زُہد کو نہیں مانتے جو ریاکاری اور لالچ کے لئے ہو۔ کیونکہ زہد و تقویٰ بغیر جزا کے خیال کے ہونا چاہیے۔

کیا زُہد کو مانوں کہ، نہ ہو گرچہ ریائی

پاداشِ عمل کی طَمعِ خام بہت ہے [9]

علامہ اقبالؔ بے غرض عبادت کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں:

جس کا عمل ہے بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے

حُور و خیام سے گزر، بادہ و جام سے گزر [10]

حضرت رابعہ بصری سے یہ روایت منسوب ہے کہ جب وہ بصرہ کے بازار سے گزرتیں تو ایک ہاتھ میں آگ اور دوسرے میں پانی ہوتا۔ لوگ پوچھتے تھے کہ یہ کیوں لے کر جارہی ہو تو فرماتیں کہ آگ اس لئے ہے تا کہ جنت کو جلا دوں اور پانی اس لئے ہے تا کہ دوزخ کی آگ کو بجھا سکوں کیونکہ جب جنت جل جائے گی اور دوزخ کی آگ بجھ جائے گی تو لوگ طمع اور خوف سے آزاد ہو کر خدا کی عبادت کرسکیں گے۔

اسی خیال کے تحت غالبؔ یہ نکتہ پیش کرتے ہیں کہ اے خدا کیوں نہ دوزخ کو بھی جنت کے ساتھ ملا لیا جائے تا کہ سیر کے لئے مزید فضا میسر آسکے۔ وہ جنت اور دوزخ کے فرق کو مٹانا چاہتے ہیں تا کہ بے غرض ہو کر خدا کی عبادت کی جاسکے۔

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یا رب

سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی [11]

ڈاکٹر یوسف حسین خان کی رائے میں:

''جنت کی گھٹن دور کرنے کی غالبؔ نے یہ تدبیر بتلائی ہے کہ دوزخ کو اس میں ملا لیا جائے تو فضا کی وسعت کے باعث وہاں دل نہیں گھبرائے گا۔۔۔'' [۱۲]

غالبؔ نے ایک فارسی شعر میں یہ خیال پیش کیا ہے کہ جنت اور دوزخ میری اندرونی اور باطنی کیفیات ہیں۔ بہشت میرے خیال کے عیش کی علامت ہے اور دوزخ میرے جگر کے داغوں کی۔

از خُلد و سقر تا چہ دہد دوست کہ دارم

عیشے بخیال اندر و داغے بجگر بر [۱۳]

جنت، حوضِ کوثر، کعبہ اور زمزم سب میرے اندر موجود ہیں اس لئے انہیں باہر تلاش کرنا بے سود ہے۔

خلدرا نہا دم من لطف کوثر از من جوی

کعبہ را سوا دم من شور زمزم از من پرس [۱۴]

یعنی غالبؔ کے خیال میں گناہ اور ثواب ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔ اسی خیال کو اقبالؔ ''عمل'' کے حوالے سے یوں پیش کرتے ہیں۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے [۱۵]

غالبؔ کے نزدیک ارتکابِ گناہ کے معاملے میں انسان بے بس ہے خدا سے شکوہ کرتے ہیں کہ تو نے پھولوں کی بہارِ جانفزا سے لطف اندوز ہونے کے لئے گلشن پیدا کئے اور انسان کے دل میں پھول توڑنے یعنی ارتکابِ گناہ کی خواہش پیدا کر دی یہ سب کچھ تو تُو نے خود کیا لیکن گنہگار انسان ہی کو ٹھہرایا۔

تماشائے گلشن تمنائے چیدن

بہار آفرینا گناہگار ہیں ہم [۱۶]

ایک جگہ فرماتے ہیں کہ ہمارے دل کی افسردگی جنت میں بھی دور نہیں ہوگی۔ جنت کی تعمیر ہماری ویرانی کے مقابلے میں کم ہے۔

جنت نکند چارۂ افسردگیِ دل

تعمیر باندازۂ ویرانیِ ما نیست ۱۷

غالبؔ کے ہاں جنت کا جو تصور ملتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شیر و شہد اور شرابِ طہور والی جنت کے طالب نہیں بلکہ انہیں ایسی جنت کی آرزو ہے جس میں شراب و شاہد میسر ہو بس یہی دو نعمتیں انہیں سب سے زیادہ عزیز ہیں۔

وہ چیز جس کے لئے ہم کو ہو بہشت عزیز

سوائے بادۂ گلفام مشک بو کیا ہے ۱۸

ایک اور شعر میں غالبؔ فرماتے ہیں کہ بہشت کی جو تعریفیں سنتے آئے ہیں وہ بالکل بجا اور درست ہوں گی لیکن ہماری دعا یہ ہے کہ خدا کرے وہاں ہمیں تیرا دیدار نصیب ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ بہشت میں اگر جلوۂ محبوب میسر نہ ہو تو ایک عاشق ایسی جنت کو لے کر کیا کرے گا۔

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف ، سب درست

لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو ۱۹

اقبالؔ اس خیال کو غزل کے ایک شعر میں یوں ادا کرتے ہیں:

یہ جنت مبارک رہے زاہدوں کو

کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں ۲۰

جنت میں پہنچ کر بھی غالبؔ کو اپنے دنیاوی محبوب کی گلیوں کی یاد ستاتی ہے۔ وہ کوچۂ محبوب کا جنت سے مقابلہ نہیں کرتے بلکہ جنت کا مقابلہ کوچۂ محبوب سے کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ جلوہ آرائی، رونق اور چہل پہل کے لحاظ سے بہشت بھی کچھ کم نہیں لیکن جو رونق محبوب کے کوچے میں نظر آتی ہے جنت اس سے یکسر محروم ہے کوچۂ محبوب کے مقابلے میں یہاں ویرانی برستی ہے۔

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت

یہی نقشہ ہے، ولے اس قدر آباد نہیں ۲۱

غالبؔ کو دنیا اور اس کے سارے جھمیلوں سے گہرا لگاؤ تھا، اسی لئے وہ جنت کو دنیا کے مقابلے میں ہیچ سمجھتے تھے اور یہی غالبؔ اور اقبالؔ کے فکری ربط کی بنیاد ہے۔ بقول ڈاکٹر یوسف حسین خان:

''اقبال نے بھی جنت کے عیش وسکون کو قابل اعتنا نہیں سمجھا اس لئے کہ یہ اس کے دائمی کشاکش و اضطراب کے اصول کے منافی تھا۔ وہ ایسی بہشت کا قدرداں نہیں جہاں خلیل حریفِ آتش ہونے سے ہچکچاتے ہوں، یوسف دردِ زنداں کی کیفیت سے ناآشنا ہوں اور زلیخا دلِ نالاں سے محروم ہو۔ جہاں کی پُرسکون دنیا صرصر وطوفان کے تجربے سے ناواقف ہو۔ اقبال کے نزدیک ایسی جنت مورکھوں کے رہنے کی جگہ ہے جہاں خیر وشر کی کشمکش نہ ہو۔ یہ جگہ بدذوقوں کے لئے ہے جہاں یزداں ہو شیطان نہ ہو۔''[۲۲]

نظم ''بہشت'' کے درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجئے:

کجا ایں روزگارے شیشہ بازے
بہشت ایں گنبدِ گرداں ندارد
ندیدہ دردِ زندان یوسف او
زلیخایش دلِ نالاں ندارد
بہ صرصر در نیفتد زورق او
خطر از لطمۂ طوفاں ندارد
یقیں رادر کمیں بُوک و مگر نیست
وصال اندیشۂ ہجراں ندارد
مزی اندر جہانے کور ذوقے
کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد [۲۳]

ایک جگہ فرماتے ہیں کہ جب میں مرنے کے بعد جنت میں گیا تو اس وقت بھی میری آنکھوں میں دنیائے آب وگل کے نقشے سمائے ہوئے تھے یہاں تک کہ جنت کو دیکھ کر بھی یہی شک پیدا ہوا کہ یہ بھی دنیا ہی کی تصویر ہے۔

چو در جنت خرامیدم پس از مرگ
بہ چشمم ایں زمین و آسماں بود
شکے با جان حیرانم در آویخت
جہاں بود آں کہ تصویرِ جہاں بود [۲۴]

غالبؔ کے نزدیک انسان کو زندگی میں جو مشقتیں اور مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں جنت ان کی تلافی کا حق ادا نہیں کر سکتی۔ دنیاوی مصائب کے مقابلے میں یہ صلہ نا کافی ہے:

دیتے ہیں جنت، حیاتِ دہر کے بدلے
نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے ۲۵

غالبؔ کو جو مضمون پسند آ جاتا ہے اسے وہ بار بار مختلف صورتوں میں پیش کرتے ہیں اور ہر جگہ ایک نیا لطف، نئی لذت اور نئی جاذبیت پیدا کر دیتے ہیں۔ غزلیہ اشعار کے علاوہ غالبؔ کی مثنوی ''ابرِ گوہر بار'' کے اشعار میں ان کی لاجواب ظرافت کے نمونے زیادہ نکھر کر سامنے آ جاتے ہیں جہاں وہ جنت کے بارے میں مشہور تمام باتوں کو مضحکہ خیز افسانے سے زیادہ نہیں سمجھتے ان کے خیال میں انسان کی جنت خود اس کی ذات میں مضمر ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:

''محرومیاں اور نامرادیاں جب یاد آتی ہیں تو قسم ہے تیرے عزت و جلال کی جنت سے میرا دل اُچاٹ ہو جاتا ہے۔ جو دل باغ میں بھی نہ لگے اس کو دوزخ میں ڈالنا ایسا ہے جیسے کوئی جلتے ہوئے داغ کو آگ میں ڈالے۔ میرے مالک! جنت میں مجھ حسرت نصیب کا دل کیونکر لگے گا؟ وہاں نہ کوئی جامِ بلوریں ہوگا، نہ زہرۂ صبح کا نظارہ، نہ وہ مخمورانہ چالیں وہاں ہوں گی اور نہ وہ مستانے ہنگامے، اُس ''خاموش اور مقدس میخانے'' میں شراب خواروں کی ہنگامہ آرائیاں کہاں؟ اُس میں ابرِ باراں کُجا؟ جب وہاں خزاں ہی نہیں ہے تو بہار کا کیا لطف؟ وہاں کی حوروں میں نہ لذتِ ہجر ہے نہ ذوقِ وصال۔ ایسا معشوقِ بے منت اور وصالِ بے انتظار کس کام کا؟ ایسے معشوق وہاں کہاں جو بوسے کے وقت ناز سے بھاگ جاویں اور جب ان کو پکڑو تو قسمیں دینے لگیں۔۔۔''۲۶

مثنوی ''ابرِ گوہر بار'' کے اشعار حسبِ ذیل ہیں:

چو آن نامرادی بیاد آیدم
بفردوس ہم دل نیاسایدم
دلی را کہ کمتر شکیبد بباغ
در آتش چہ سوزی بسوزندہ داغ

صبوحی خورم، گر شرابِ طہور
کجا زہرۂ صبح و جامِ بلور
دمِ شبرویہای مستانہ کو
بہ ہنگامہ غوغای مستانہ کو
دراں پاک میخانہ بے خروش
چہ گنجائی شورشِ نائے و نوش
سیہ مستیِ ابر و باراں کجا
خزاں چوں نباشد، بہاراں کجا
اگر حور در دل خیالش کہ چہ
غمِ ہجر و ذوق وصالش کہ چہ
چہ منت نہد ناشناسا نگار
چہ لذت دہد وصل بے انتظار
گریزد دمِ بوسہ اینش کجا
فریبد بسو گند دینش کجا در
نظر بازی و ذوقِ دیدار کو
بفردوس، روزن بہ دیوار کو
نہ چشم آرزو مند دلالہ ای
نہ دل تشنۂ ماہ پرکالہ ای ۲۷

غالبؔ جنت کی پرسکون زندگی کو اپنے لئے سب سے بڑی آفت خیال کرتے ہیں۔ انہیں ایسی حکم کی تابع حوروں میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی جن کی باتوں میں تلخی نہ ہو، نہ فنِ فریب سے واقفیت ہو اور جو کہو وہ فوراً کرنے کو تیار ہو جائیں۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ بہشت میں کوئی روزنِ دیوار بھی نہیں جہاں سے نظر باز تاک جھانک کر سکیں۔ نہ آنکھیں دلالہ کی آرزومند اور نہ کسی ماہ پرکالہ کا دل دیوانہ۔ غالبؔ کہتے ہیں کہ یہ مقام میرے رہنے کے قابل نہیں

یہاں سے بھاگ جانا ہی بہتر ہے کیونکہ یہاں نہ آرزومندی ہے، نہ اُمید، نہ محبت، نہ نفرت ہر ایک پرسکون اور مطمئن ہے یہاں کا قیام اجیرن ہے۔

غالبؔ کا یہ تصورِ جنت اقبالؔ کے تصورِ جنت کے عین مطابق ہے۔ اقبالؔ نے ''پیامِ مشرق'' میں ''حور اور شاعر'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے جو دراصل المانوی شاعر گوئٹے کی اسی عنوان پر لکھی گئی ایک نظم کا جواب ہے۔ مضمون یہ باندھا ہے کہ:

''اتفاق سے کہیں کوئی شاعر بھولا بھٹکا جنت میں پہنچ گیا وہ اپنے خیالات میں ایسا محو تھا کہ جنت کی دلکشی کی طرف اس نے کوئی توجہ نہ کی۔ حُور اس سے کہتی ہے کہ تو عجیب و غریب مخلوق ہے کہ نہ تجھے شراب کا شوق ہے، نہ تو میری طرف نظر اُٹھا کر دیکھتا ہے۔ تو راہ ورسم آشنائی سے بالکل بیگانہ معلوم ہوتا ہے۔ بس تجھے یہ آتا ہے کہ اپنے سوزِ آرزو سے خیالی دنیا کا ایک طلسم پیدا کرے۔ اس پر شاعر کہتا ہے کہ میرا دل جنت میں نہیں لگتا۔ آرزو کی کسک مجھے کہیں چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ جب میں کسی حسین کو دیکھتا ہوں تو بجائے اس کے کہ اس کے حسن سے لذت اندوز ہوں میرے دل میں فوراً یہ خواہش پیدا ہو جاتی ہے کہ کاش! اس سے بھی زیادہ خوبرو کو دیکھا ہوتا۔ جنت تو بڑی بے لطف جگہ ہے یہاں نہ نوائے دردمند سنائی دیتی ہے نہ یہاں غم ہے اور نہ غمگسار۔ یہاں ہر کوئی مطمئن نظر آتا ہے۔ کسی کے دل میں داغِ تمنا نہیں۔ حُور شاعر کو اس طرح خطاب کرتی ہے۔ ۲۸

نہ بہ بادہ میل داری نہ بہ من نظر کشائی
عجب ایں کہ تو ندانی رہ و رسمِ آشنائی
ہمہ سازِ جستجوئے، ہمہ سوزِ آرزوئے
نفسے کہ می گدازی، غزلے کہ می سرائی
بنوائے آفریدی چہ جہان دلِ کشائے
کہ ارم بہ چشم آید چوں طلسمِ سیمیائی ۲۹

شاعر اس کا جواب اس طرح دیتا ہے۔

چہ کنم کہ فطرتِ من بہ مقامِ درنسازد
دلِ ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے

چو نظر قرار گیرد، بہ نگار خوب روئے

تپد آں زماں دلِ من پئے خوب تر نگارے

زشرر ستارہ جویم زستارہ آفتابے

سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے

چو زبادۂ بہارے، قدحے کشیدہ خیزم

غزلے دگر سرائم بہ ہوائے نو بہارے

طلبم نہایتِ آں کہ نہایتے ندارد

بہ نگاہے نا شکیبے بہ دلِ امیدوارے

دلِ عاشقاں بمیرد بہ بہشتِ جاودانے

نہ نوائے دردمندے نہ غمے نہ غمگسارے ۳۰

اقبال نے اپنے اور مُلا کے تصورِ جنت میں یہی فرق بتایا ہے کہ ملا کی جنت ایک پرسکون مقام ہوگی جہاں شرابِ طہور اور حُور وغلمان ہوں گے جب کہ ان کی جنت کا تصور سیرِ دوام ہے جس میں حرکت اور کشاکش ہوگی۔

جنت ملا، مے و حور و غلام

جنتِ آزادگاں سیرِ دوام ۳۱

اقبال نے اپنی نظم ''حرکت بجنت الفردوس'' میں جنت اور دوزخ کے حوالے سے مولانا رومی سے جو باتیں کہلوائی ۹ ہیں وہ دراصل خود ان کے خیالات ہیں۔ یہاں بھی اقبال غالب کی طرح جنت اور دوزخ کو انسانی نفس کی کیفیات سمجھتے ہیں۔ کوثر وغلمان اور حور عالمِ جذب وسرور کے جلوے ہیں:

گفت رومی ''اے گرفتار قیاس

درگزر از اعتبارات حواس

از تجلی کار ہائے خوب و زشت
می شود آں دوزخ ایں گردد بہشت

ایں کہ بینی قصر ہائے رنگ رنگ
اصلش از اعمال و نے از خشت و سنگ

آنچہ خوانی کوثر و غلمان و حور
جلوۂ ایں عالمِ جذب و سرور

زندگی ایں جاز دیدار است و بس
ذوق دیدار است و گفتار است و بس ۳۲

اقبالؔ ''بالِ جبریل'' کی ایک غزل میں یہ خیال پیش کرتے ہیں کہ اگر میری خاک پریشان ہو کر دل بن گئی تو بڑی مشکل پیش آئے گی کیونکہ دل جنت میں بھی عشق بازی سے باز نہیں آئے گا۔ وہاں کی حُوریں اسے غزل سرائی پر مجبور کر دیں گی اور اس پرسکون اور خاموش عالمِ بے رنگ و بو میں بھی ہنگامہ خیزی کے آثار ہویدا ہو جائیں گے۔

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے
جو مشکل اب ہے یا رب پھر وہی مشکل نہ بن جائے

نہ کر دیں مجھ کو مجبورِ نوا فردوس میں حُوریں
مرا سوزِ دروں پھر گرمیٔ محفل نہ بن جائے

کہیں اُس عالمِ بے رنگ و بُو میں بھی طلب میری
وہی افسانۂ دنبالۂ محمل نہ بن جائے ۳۳

اقبالؔ کے خیال میں ان کی دنیا عالمِ قدس کی جنت سے بدر جہا بہتر ہے کیونکہ اس دنیا میں ذوق وشوق اور سوز و ساز کی گنجائش ہے جو جنت میں میسر نہیں۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان غالبؔ اور اقبالؔ کے تصورِ جنت کا تقابلی جائزہ لیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''غالبؔ کی طرح اقبالؔ کو بھی جنت کی پُرسکون فضا راس نہیں۔ دونوں کے تخیل کے سفر کی کوئی منزل نہیں۔ روحانی ماورائیت کا قائل ہونے کے باوجود اقبالؔ، غالبؔ کی طرح ارضیت کا قدردان تھا۔ غالبؔ کا مجاز اور اقبالؔ کی مقصدیت اس دنیا کی چیزیں ہیں۔ اقبالؔ نے دنیا کے ہنگاموں ہی میں روحانیت کو تلاش کیا اور پایا ہے۔۔۔'' ۳۴

ڈاکٹر یوسف حسین خان کے خیال میں غالبؔ اور اقبالؔ سے پیشتر بیدلؔ بھی جنت کی پُرسکون زندگی اور راحتِ جاوید پر طنز فرما چکے تھے۔ بیدلؔ کا شعر کچھ یوں ہے۔

گویند بہشت است و ہمہ راحتِ جاوید

جائے کہ بداغ نہ تپد دل چہ مقام است ۳۵

بیدلؔ کے اس خیال پر تفصیلی طبع آزمائی پہلے غالبؔ اور پھر اقبالؔ نے فرمائی لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ فکر کی مشرقیت کو کہیں بھی مجروح نہیں ہونے دیا۔ اقبالؔ نے خود اپنی ڈائری میں اعتراف کیا ہے کہ:

''۔۔۔بیدلؔ اور غالبؔ نے مجھے یہ سکھایا کہ مغربی شاعری کی اقدار اپنے اندر سمونے کے باوجود اپنے باطنی محسوسات اور اظہارِ خیال میں مشرقیت کو کیسے برقرار رکھوں۔'' ۳۶

الغرض غالبؔ اور اقبالؔ دونوں جنت کی پرسکون فضا کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں کیونکہ یہ جنت زندگی کی ہنگامہ خیزی، سوز اور تڑپ سے یکسر خالی ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان کی رائے کے مطابق غالبؔ اور اقبالؔ نے اس تصورِ جنت کے باب میں بیدلؔ سے استفادہ کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''میرا خیال ہے کہ غالبؔ نے جنت کا تصور پیش کرنے میں بیدلؔ سے استفادہ کیا ہے جس نے پہلی مرتبہ جنت کی پرسکون زندگی اور راحتِ جاوید پر طنز کیا تھا۔ بعد میں اقبالؔ نے بھی اس مضمون کو اپنایا۔ چونکہ بیدلؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کے زیرِ مطالعہ تھا اس لئے ممکن ہے انہوں نے براہِ راست یہ مضمون اس سے لیا ہو۔ اس کا بھی امکان ہے کہ غالبؔ نے یہ مضمون بیدلؔ سے اور پھر اقبالؔ نے غالبؔ سے لیا ہو''۔ ۳۷

غالبؔ اور اقبالؔ کا اعجازِ سخن یہ ہے کہ ان کے ہاں تقلید میں بھی اجتہاد کا رنگ جھلکتا ہے۔ غالبؔ کی مثنوی ''ابرِ گوہر بار'' کے اشعار ہوں یا اقبالؔ کی نظم میں ''حور اور شاعر'' کی گفتگو، دونوں سے اس امر کا اظہار ہوتا ہے کہ دونوں شعراء کے ہاں تصورِ جنت کے سلسلے میں حیرت انگیز فکری ہم آہنگی اور ذہنی ربط موجود ہے۔

حوالہ جات

۱۔ یوسف حسین، ڈاکٹر، خان ، متحرک جمالیات ، صفحہ ۷۳
۲۔ حالی، یادگار غالب، صفحہ ۷۳
۳۔ غالب، دیوانِ غالب جدید، صفحہ ۲۶۳
۴۔ غالب، خطوطِ غالب، مرتبہ غلام رسول مہر، صفحہ ۱۹۷
۵۔ غالب، دیوان، غالب جدید، صفحہ ۴۲
۶۔ محمد اکرام، ڈاکٹر، شیخ، حکیم فرزانہ، صفحہ ۱۷۲۔۱۷۳
۷۔ غالب، دیوانِ غالب جدید، صفحہ ۱۴۷
۸۔ اقبال، بانگِ درا، کلیات اقبال اُردو، صفحہ ۱۰۸
۹۔ غالب، دیوانِ غالب جدید، صفحہ ۲۸۳
۱۰۔ اقبال، بالِ جبریل، کلیات اقبال اُردو، صفحہ ۳۲۱
۱۱۔ غالب، دیوانِ غالب جدید، صفحہ ۲۸۸
۱۲۔ یوسف حسین ، ڈاکٹر، خان، متحرک جمالیات، صفحہ ۱۴۷
۱۳۔ غالب، کلیات غالب فارسی جلد سوم، صفحہ ۲۱۶
۱۴۔ ایضاً ، صفحہ ۲۲۷
۱۵۔ اقبال، بانگِ درا، کلیات اقبال اُردو، صفحہ ۲۷۴
۱۶۔ غالب، دیوانِ غالب جدید، صفحہ ۱۰۶
۱۷۔ غالب، کلیات غالب فارسی، جلد سوم صفحہ، ۵۸
۱۸۔ غالب، دیوانِ غالب جدید، صفحہ ۲۶۰
۱۹۔ ایضاً ، صفحہ ۱۵۲
۲۰۔ اقبال، بانگِ درا، کلیات اقبال اُردو، صفحہ ۱۰۵
۲۱۔ غالب، دیوانِ غالب جدید، صفحہ ۱۳۵

۲۲۔ یوسف حسین، ڈاکٹر،خان، متحرک جمالیات،صفحہ۱۵۴

۲۳۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیات اقبالؔ فارسی، صفحہ۳۰۲

۲۴۔ اقبالؔ، پیام مشرق، کلیات اقبالؔ فارسی، صفحہ۲۲۸

۲۵۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ۱۷۲

۲۶۔ عبداللہ فاروقی، غالبؔ کے مذہبی وفکری میلانات بشمولہ نقوش (غالبؔ نمبر) شمارہ ۱۱۱، فروری ۱۹۶۹، صفحہ ۲۷۸

۲۷۔ غالبؔ ، کلیات غالبؔ،فارسی جلداول ، صفحہ۳۴۶۔۳۴۷

۲۸۔ یوسف حسین، ڈاکٹر،خان،روح اقبالؔ، صفحہ۹۸

۲۹۔ اقبالؔ، پیام مشرق، کلیاتِ اقبالؔ فارسی، صفحہ۲۹۷

۳۰۔ ایضاً ، ۲۹۸

۳۱۔ اقبالؔ، جاویدنامہ، کلیاتِ اقبالؔ فارسی، صفحہ۷۰۸

۳۲۔ ایضاً ، صفحہ۷۴۳

۳۳۔ اقبالؔ، بال جبریل، کلیات اقبالؔ اُردو، صفحہ۳۰۲

۳۴۔ یوسف حسین ، ڈاکٹر،خان، متحرک جمالیات ، صفحہ۱۵۹

۳۵۔ ایضاً ، صفحہ۱۵۲

۳۶۔ اقبالؔ، شذرات فکرِ اقبالؔ ، صفحہ۱۰۵

۳۷۔ یوسف حسین، ڈاکٹر،خان، متحرک جمالیات ، صفحہ۱۵۱

غالبؔ اور اقبالؔ کا تصورِ رجائیت

غالب اور اقبال کا تصورِ رجائیت

ادب کو زندگی کا آئینہ کہا گیا ہے کیونکہ ادب نہ صرف زندگی سے پیدا ہوتا ہے بلکہ زندگی کی حقیقتوں کی سچی اور صاف تصویر ہمارے سامنے کھینچ کر رکھ دیتا ہے۔ایک شاعر اور ادیب زندگی میں جن تلخیوں اور شیرینیوں سے لذت یاب ہوتا ہے۔یہی تلخ وشیریں تجربات اس کی تخلیق کے آئینے میں منعکس ہوتے ہیں۔کچھ شگفتہ مزاج غم واندوہ کے طوفان کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں۔دکھوں اور مصیبتوں میں بھی مسکرانے کا حوصلہ رکھتے ہیں جب کہ کچھ افسردہ طبع لوگ زندگی کی تلخیوں سے فرار چاہتے ہیں۔یعنی زندگی کے دو پہلو ہوتے ہیں ایک ''رجائیت'' اور دوسرا ''یاسیت اور قنوطیت'' ایک مرنے کو جینا سمجھتے ہیں اور دوسرے جینے کو موت قرار دیتے ہیں۔ڈاکٹر سلیم اختر قنوطیت اور رجائیت کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''کسی نے طبائع میں قنوطیت اور رجائیت کا اندازہ کرنے کے لئے آدھی بھری بوتل میز پر رکھ کر جب اُس کے بارے میں استفسار کیا تو کسی کو آدھی بوتل بھری نظر آئی جب کہ کسی نے آدھی خالی بوتل دیکھی بس قنوطیت اور رجائیت میں بھی یہی بنیادی فرق ہے کہ ایک کو ''ناموجود'' دکھائی نہیں دیتا جب کہ دوسرے کو ''موجود'' دکھائی دیتا ہے۔بالفاظِ دیگر قنوطی نفی کی موجودگی کے اقرار سے اس کا اثبات کرتا ہے جب کہ رجائی اثبات کا اثبات کرتا ہے۔۔۔''[1]

آسان لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ فطری طور پر خوش مزاج رہنے، زندگی کے بارے میں مثبت اور پُر امید نقطۂ نظر رکھنے، اشیاء اور واقعات کے روشن پہلوؤں کو اختیار کرنے، مصائب اور آلام پر قابو پا کر کامیاب زندگی گزارنے کا نام رجائیت ہے۔

رجائیت کی ضد یاسیت یا قنوطیت ہے جسے ناامیدی کی آخری منزل قرار دیا جا سکتا ہے۔جہاں افسردگی اور غم ناکی اعصاب پر اس حد تک سوار ہو جاتی ہے کہ انسان جیتے جی اپنے آپ کو مردہ تصور کرنے لگتا ہے۔قنوطی طبائع ہمیشہ عمل سے گریز اور حرکت واختیار سے پناہ مانگتی ہیں۔بے یقینی، بداعتادی اور تشکک ان کا شعار اور انفعالی اور سلبی قوتیں ان کا وطیرہ ہوتی ہیں۔

ان دونوں نظریہ ہائے حیات کے مختصر تعارف کی روشنی میں غالب اور اقبال کے کلام میں رجائی عناصر کی تلاش بآسانی ممکن ہے۔دونوں شعراء ایک پر آشوب دور سے تعلق رکھتے ہیں جب حالات سنگین تھے اور زندگی گونا گوں

خطرات اور مشکلات میں گھر کر رہ گئی تھی، دونوں شعراء نے فارسی اور اردو کی شعری روایات سے استفادہ کیا۔ جہاں تک فارسی شاعری کی روایات کا تعلق ہے اس میں رودکیؔ سے لے کر پروینؔ اعتصامی تک رجاء وقنوط آپس میں گلے ملتے نظر آتے ہیں جب کہ اردو شاعری پر ابتداء ہی سے قنوطیت کا غلبہ نظر آتا ہے۔ کیونکہ جس فضا میں اردو شاعری پروان چڑھی وہ سلطنتوں کے انقلاب کا زمانہ تھا۔ معاشرتی قدریں پائمال ہو رہی تھیں جس کی وجہ سے عوام میں بے چینی، ہلاکت و فلاکت، بداعتمادی اور مایوسی کے جذبات پروان چڑھ رہے تھے اور خود اعتمادی، جوشِ عمل اور علو ہمتی کے جذبات دم توڑ رہے تھے۔ ہندوستان کے مخصوص سیاسی اور سماجی تموج کے زیرِ اثر اردو شاعری کے لب و لہجے میں ایک نسوانیت، پژمردگی اور مسکینی سی پیدا ہوگئی تھی۔ انہی حالات وواقعات کی نمائندگی کرتے ہوئے میرؔ ایک غمزدہ اور قنوطی فلسفے کے مبلغ بن کر سامنے آتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے میرؔ کے شاعرانہ لب و لہجے کا تجزیہ ان الفاظ میں کیا ہے۔

''میرؔ نے مجھے رُلایا بھی ہے اور میرے آنسو بھی پونچھے ہیں مگر یہ ضرور ہے کہ چوبیس گھنٹے کی رفاقت سے ایک خاص قسم کی ''ذہنی بے چارگی کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے۔'' [۲]

میرؔ مضامینِ غم کے اظہار کے لئے جن تشبیہوں اور علامتوں کا انتخاب کرتے ہیں ان میں ویرانوں، اجڑی بستیوں، بربادنگروں، خرابوں، مزاروں، گورِ غریباں، بے ثباتیِ دنیا، فنا، مرگ، عدم، موت، سراب، غبار اور آگ و خون کے حوالے کثرت سے مل جاتے ہیں۔ دلی سے تعلق رکھنے والے شعراء میں غالبؔ ہی وہ پہلے شاعر ہیں جن کے کلام میں رجائیت کی واضح چھاپ نظر آتی ہے۔ گو کہ ان کے ''دیوان'' میں حسرت والم، بے بسی اور بے چارگی کا تذکرہ عام مل جاتا ہے لیکن انہیں رنج اُٹھا اُٹھا کر جینے کا سلیقہ آ گیا تھا وہ ہر دکھ اور مصیبت کو ہنسی میں اُڑا دینے کے قائل تھے۔ خود فرماتے ہیں۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں [۳]

غالبؔ غم کو زندگی کی ایک بہت بڑی حقیقت تصور کرتے ہیں لیکن ان کے یہاں غم منفی یا سلبی شکل اختیار نہیں کرتا۔ وہ جانتے ہیں کہ غم ایک جانکسل شے ہے لیکن انہیں اس حقیقت کا بھی علم ہے کہ غم زندگی کا لازمہ ہے جس سے بچ نکلنا ناممکن ہے۔

غم اگرچہ جانگسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق اگر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا [۴]

یہی وجہ ہے کہ غالبؔ کی آواز میں بے بسی اور بے کسی کی بجائے قوت، جوش، بلند آہنگی، تندی و تیزی اور قوت و توانائی ہے جس کا عکس بعد ازاں علامہ اقبالؔ کے کلام میں بھی نمایاں طور محسوس کیا جا سکتا ہے۔ کلامِ اقبالؔ کا جلال و جمال، دلبری و قاہری، پختگی اور اُستواری غالبؔ کے جوشِ بیان اور نوائے گرم سے قریب تر ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کی رائے کے مطابق:

''غالبؔ کی آواز میں لہجہ وصوت کی حد تک اقبالؔ کی آواز کا سارعب وطنطنہ پایا جاتا ہے اردو شاعری کے لہجے میں مدتوں سے بعض سماجی تاثرات کے ماتحت نسوانیت سی پیدا ہوگئی تھی اس کو غالبؔ نے بڑی حد تک دور کر کے ایک توانا لہجہ بخشا۔ غالبؔ کے ہاں اظہار کے یہ پُر جلال پیرائے جن کے آہنگ میں ولولۂ نشاط بھی ہے، اقبالؔ کے ہنگامہ خیز اسالیب کے نقوش اولین معلوم ہوتے ہیں۔'' [۵]

غالبؔ اور اقبالؔ دونوں فطرتاً رجائی تھے یہی وجہ ہے کہ دونوں نے جہاں بھی غم کا ذکر کیا ہے اس سے مثبت اور تعمیری نتائج ہی اخذ کرنے کی کوشش کی ہے ورنہ دونوں ہستیاں جس پُر آشوب اور ناساز گار ماحول کی پروردہ تھیں وہاں قنوطیت کا پیدا ہو جانا امرِ محال نہیں تھا۔ غالبؔ کی زندگی اول تا آخر ایک ایسے مظلوم اور بے کس شخص کی داستان ہے جس کا قدرت نے ہر طرح سے امتحان لیا۔ پیدا ہوتے ہی یتیم ہو گئے اور چچا نے پرورش کی، چچا کی وفات کے بعد ننھیال میں بے یار و مددگار پلے بڑھے۔ جلد ہی انہیں ازدواجی زندگی کی سنہری زنجیروں میں جکڑ دیا گیا۔ آمدنی کا فقدان، مصارف کی زیادتی، محبوبہ کی موت، بھائی کا جنون، عزیز واقربا کی بے مہری، کسی اولاد کا زندہ نہ رہنا، اسیری کی ذلت، جاگیروں کی ضبطی، قدر ناشناسی، بہادر شاہ ظفر کے دربار میں ذوقؔ کی فوقیت، پھر ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی صورت میں مصیبتوں اور تکلیفوں کا آسمان ٹوٹ پڑا۔ شہر خالی، دوستوں کی محفلیں برہم، عارف کی موت، پنشن کی بندش، قویٰ کا اضمحلال، سامعہ، باصرہ، حافظہ سب جواب دے گئے۔ اپنی حالتِ زار کا نقشہ یوسف میرزا کے نام ایک خط میں یوں کھینچتے ہیں۔

''میرا حال سوائے میرے خدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا۔ آدمی کثرتِ غم سے سودائی ہو جاتے ہیں۔ عقل جاتی رہتی ہے اگر اس ہجومِ غم میں میری قوتِ متفکرہ میں فرق آ گیا تو کیا عجب ہے بلکہ اس

کو باور نہ کرنا غضب ہے، پوچھو کہ کیا غم ہے؟ غمِ مرگ، غمِ فراق، غمِ عزت، غمِ رزق۔۔۔۔ان اموات کے غم اور زندوں کے غم میں عالم میری نظر میں تیرہ و تار ہے۔۔۔''[6]

مذکورہ تلخ تر حقائق کے باوجود غالبؔ کے یہاں زندگی سے بھرپور لگاؤ کا اظہار ملتا ہے وہ دنیا سے متنفر نہیں ہوتے بلکہ دنیا کو ایک حسین اور دلکش جگہ تصور کرتے ہیں۔ جہاں زندگی کے سب مزے موجود ہیں۔ غالبؔ کی رجائیت کے بارے میں ڈاکٹر احمد بختیار اشرف کی رائے ہے کہ:

''غالبؔ کے لئے سازِ زندگی کے سارے نغمے فردوسِ گوش ہیں یہاں تک کہ وہ تو نغمہ ہائے غم کو بھی غنیمت تصور کرتے ہیں اس لئے کہ ایک نہ ایک دن سازِ ہستی کو بے صدا ہو جانا ہے چنانچہ اس ساز سے جتنے نغمے پھوٹیں خواہ وہ خوشی کے ہوں یا غم کے ان سے لطف اندوز ہونا زندگی کی بیش بہا نعمت ہے۔۔۔''[7]

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن [8]

غالبؔ اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ جیتے جی غم سے نجات ممکن نہیں۔ زندہ دلی کا تقاضا یہی ہے کہ تمام تر مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کیا جائے:

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟ [9]

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک [10]

تاب لائے ہی بنے گی غالبؔ
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز [11]

اُن کے گھر کی رونق کا دارومدار ایک ہنگامے پر موقوف ہے یعنی:

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی [۱۲]

غالبؔ کے حالات و واقعات اور افکار و خیالات کے مقابل جب ہم اقبالؔ کے سیاسی و سماجی حالات پر نگاہ ڈالتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اقبالؔ نے جس زمانے میں ہوش سنبھالا وہ عالمِ اسلام کے لئے انتہائی کشمکش، اضطراب اور بے چینی کا دور تھا۔ اکثر مسلم ممالک مغربی سامراج کے غلام تھے۔ اگر ایک طرف عرب ہاشمی دینِ مصطفیؐ کے ناموس کا سودا کر رہا تھا تو دوسری طرف مظلوم ترکوں کا خونِ بے گناہ بہایا جا رہا تھا۔ سامراج کی چیرہ دستیاں اور طرابلس کے خونیں ہنگامے ایک ہی سلسلے کی کڑیاں تھیں۔ سیاسی حالات سے قطع نظر مذہبی افق پر بھی تاریکی کے گھرے بادل منڈلا رہے تھے۔ عجمی تصوف خوب پنپ رہا تھا جس کی آڑ میں فکر و عمل سے فرار، حقیقت سے گریز، تقدیر پرستی اور توکل کے غلط تصور کو اپنا کر لوگ حزن و ملال، بے یقینی اور بد اعتقادی کے بھنور میں گھر چکے تھے۔ شعراء حضرات گل و بلبل، کاکل و رخسار، ہجر و وصال اور یاسیت اور قنوطیت کی دلدل میں پھنسے ہوئے تھے۔ لیکن اقبالؔ کی رجائی فطرت ان حالات میں بھی جوش و ولولہ، فکر و عمل، امید و رجاء، شادکامی اور بامراد زندگی کا درس دیتی نظر آتی ہے۔ ۱۹۰۸ء میں جب دورۂ یورپ سے واپس تشریف لائے تو بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ان حالات کا ذکر کرتے ہوئے عطیہ فیضی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میرا سینہ یاس انگیز اور غم انگیز خیالات کا خزینہ ہے۔ یہ خیالات میری روح کی تاریک بانبیوں سے سانپ کی طرح نکلے چلے آتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ایک سپیرا بن جاؤں گا۔ گلیوں میں پھروں گا اور تماش بین لڑکوں کی ایک بھیڑ میرے پیچھے پیچھے ہوگی۔

یہ خیال نہ فرمایئے کہ میں مبتلائے یاس ہو چکا ہوں۔ یقین مانیے میری تیرہ بختی میرے لئے ایک لطف و لذت کی سرمایہ دار ہے اور میں اُن لوگوں پر ہنستا ہوں جو اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتے ہیں۔'' [۱۳]

اقبالؔ نے بھی غالبؔ کی طرح غم کی فلسفیانہ توجیہہ اس انداز سے کی کہ مثبت اور تعمیری نتائج ہی سامنے آئے۔ انہیں کلفت میں لذت اسی لئے ملتی ہے کہ جہاں وہ غم یا کلفت کا ذکر کرتے ہیں وہاں غم کو تکمیلِ حیات کے لئے لازمی خیال کرتے ہیں اور مصائب کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ قیامِ انگلستان کے دوران ہی ۱۹۰۷ء کی ایک مشہور نظم میں اپنے ہمدمِ دیرینہ شیخ عبدالقادر کے نام جو پیغام بھیجا اس کے ایک ایک لفظ سے ان کی رجائیت اور زندہ دلی

کا اظہار ہوتا ہے۔

اُٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افقِ خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں
شمع کی طرح جئیں بزم گہہ عالم میں
خود جلیں، دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں ۱۴؎

ڈاکٹر سید عبداللہ غالبؔ اور اقبالؔ کی آرزومندی اور رجائیت کا تقابلی جائزہ لیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''غالبؔ اور اقبالؔ دونوں کے یہاں پُر جوش آرزومندی پائی جاتی ہے مگر اقبالؔ نے اپنی آرزومندی کو انسان کی اجتماعی آرزوؤں اور امنگوں کی صورت دے دی ہے کیونکہ اقبالؔ کا غم انسانیت کی تکمیل کے لئے ہے یہ غم کسی سے ملنے اور اس میں ڈوب کر محو ہو جانے اور خود کو فراموش کر دینے کی آرزو نہیں بلکہ تسخیر و توسیع اور چھا جانے کی وہ آرزو ہے جس کا تعلق پوری نوعِ انسانی سے ہے۔ غالبؔ کی آرزومندی بھی شدید ہے مگر اس کی نوعیت خالصتاً انفرادی، شخصی اور ذاتی ہے۔۔۔۔۔۔'' ۱۵؎

غالبؔ زندگی کی حکمت کے رازداں تھے وہ جانتے تھے کہ یہاں نہ کسی کو دائمی مسرت نصیب ہے اور نہ کوئی دائمی طور پر رنج میں مبتلا ہے۔ زمانہ ہر قسم کے زخموں کو مندمل کر دیتا ہے لہذا خوشی اور غم کی کیفیات بھی دائمی نہیں ہیں۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان غالبؔ کی زندہ دلی کے باب میں رقمطراز ہیں:

''غالبؔ کی شاعری میں غم تخلیقی محرک ہے۔ غموں کا مقابلہ کرنے میں بھی زندگی سے ان کی توقعات کبھی کم نہ ہوئیں اور نہ اپنی ذات پر اعتماد میں کمی آئی وہ اپنی شاعری کو بھی ''انتعاشِ غم'' ہی کی دین بتلاتے ہیں۔

مجھے انتعاشِ غم نے پے عرضِ حال بخشی
ہوسِ غزل سرائی، تپشِ فسانہ خوانی'' ۱۶؎

علامہ اقبالؔ بھی غالبؔ ہی کی طرح مفکرانہ ذہن کے مالک تھے اور ایک حکیمِ حیات اس حقیقت کو بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ زندگی کی تکمیل غم کے بغیر ممکن ہی نہیں چنانچہ علامہ اقبالؔ کے ہاں بھی غم ایک زبردست تخلیقی محرک اور تعمیری قوت کا حامل نظر آتا ہے۔ غم کی بھٹی میں تپ کر ہی انسانی فطرت کے جوہر منکشف ہوتے اور جلا پاتے ہیں۔ ان کے نزدیک

ایک بھی پتی اگر کم ہو تو وہ گل ہی نہیں
جو خزاں نادیدہ ہو بُلبُل وہ بُلبُل ہی نہیں

حادثاتِ غم سے ہے انساں کی فطرت کو کمال
غازہ ہے آئینۂ دل کے لئے گردِ ملال

غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطفِ خواب سے
ساز یہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے ۱۷

اقبالؔ سرمایۂ غم کو اللہ تعالیٰ کی دین قرار دیتے ہیں وہ جسے چاہے اس دولتِ نایاب سے نواز دے۔

خرید سکتے ہیں دنیا میں عشرتِ پرویز
خدا کی دین ہے سرمایۂ غمِ فرہاد ۱۸

اقبالؔ اس ''متاعِ بے بہا'' کا سودا کسی قیمت پر کرنے کو تیار نہیں۔

متاعِ بے بہا ہے درد وسوزِ آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی ۱۹

یا

میری نوائے غم آلود ہے متاعِ عزیز
جہاں میں عام نہیں دولتِ دلِ ناشاد ۲۰

علامہ اقبالؔ تخلیقِ فن کے باب میں بھی قنوطیت کی مخالفت اور رجائیت کی حمایت کرتے ہیں۔ ضربِ کلیم میں اپنی نظم ''شعرِ عجم'' میں یہ خیال پیش کرتے ہیں۔

ہے شعرِ عجم گرچہ طرب ناک و دلآویز
اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیرِ خودی تیز

افسردہ اگر اس کی نوا سے ہو گلستاں

بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغِ سحر خیز ۲۱

اقبالؔ اپنی نظم ''فنونِ لطیفہ'' میں قنوطیت، افسردگی اور انفعالیت کی مذمت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو

جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا ۲۲

اقبالؔ کے نزدیک وہ فنی تخلیق جو زندگی بخش نہ ہو''سرودِحرام'' کا درجہ رکھتی ہے۔

اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام

حرام میری نگاہوں میں نائے و چنگ و رباب ۲۳

اور''سرودِحلال'' وہ ہے جس کی تاثیر سے غم اور خوف سے آزادی مل سکے۔ وہ زندگی و پایندگی کو مقصدِ فن قرار دیتے ہیں۔

کھل تو جاتا ہے مغنی کے بم و زیر سے دل

نہ رہا زندہ و پایندہ تو کیا دل کی کشود ۲۴

اُن کے نزدیک فن وہ ہے:

جس کی تاثیر سے آدم ہو غم و خوف سے پاک

اور پیدا ہو ایازی سے مقام محمود ۲۵

مقامِ گفتگو کیا ہے اگر میں کیمیا گر ہوں

یہی سوزِ نفس ہے اور میری کیمیا کیا ہے ۲۶

اقبالؔ سے پیشتر اُردو شاعری کی روایت میں غالبؔ ہی ایسے شاعر ہیں جو ناسازگاریٔ حالات کے باوجود زندگی سے مایوس نہیں ہوتے بلکہ ایک چٹان کی طرح ڈٹے رہتے ہیں جس سے طوفان ٹکرا ٹکرا کر گزر جاتے ہیں۔ غالبؔ اپنے اشعار کے آئینے میں ایسے آزاد منش اور قلندر شخص کی صورت نظر آتے ہیں جو کسی بات پر غمزدہ بھی ہوتا ہے تو لمحہ بھر کے لئے۔ مصائب کی جو بجلیاں اُن پر گرتی ہیں انہیں کو وہ اپنے ماتم خانے کی شمع بنا لیتے ہیں۔

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن، شمعِ ماتم خانہ ہم ۲۷

زندگی کے مصائب و آرام کے بارے میں ان کے رجائی نقطۂ نظر کا اندازہ ان کے خطوط سے بھی لگایا جا سکتا ہے اپنے دوست میر زا تفتہ کو مشورہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کیوں ترکِ لباس کرتے ہو، پہننے کو تمہارے پاس ہے کیا جس کو اتار پھینکو گے؟ ترکِ لباس سے قیدِ ہستی مٹ نہ جائے گی۔ بغیر کھائے پئے گزارا نہ ہوگا۔ سختی و سستی، رنج و آرام کو ہموار کرو۔ جس طرح ہو اس صورت سے بہر صورت گزارے جاؤ۔۔۔۔'' ۲۸

غم کے بارے میں غالب کا یہ قلندرانہ انداز اقبال کے قلندرانہ مزاج کے عین مطابق نظر آتا ہے۔ وہ احساسِ غم کے ساتھ ساتھ تابِ غم بھی رکھتے ہیں۔ رونا دھونا اور نالہ و فریاد کرنا ان کی شانِ درویشی کے خلاف ہے یعنی:

نگاہِ گرم کہ شیروں کے جس سے ہوش اُڑ جائیں
نہ آہِ سرد کہ ہے گو سفندی و میشی ۲۹

یہ نکتہ پیرِ دانا نے مجھے خلوت میں سمجھایا
کہ ہے ضبطِ فغاں شیری، فغاں رو باہی و میشی ۳۰

''بالِ جبریل'' میں ایک جگہ فرماتے ہیں:

ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش
میں بندۂ مومن ہوں نہیں دانۂ اسپند
ہر حال میں میرا دل بے قید ہے خرم
کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوقِ شکر خند ۳۱

ایک زندہ دل اور رجائی احساس رکھنے والا کبھی اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتا۔ اقبال اپنی شاعری کے ذریعے قوم کو آگاہ کرتے ہیں کہ مایوسی کفر کے مترادف ہے۔

نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے
اُمیدِ مردِ مومن ہے خدا کے راز دانوں میں ۳۲

قنوطیت اور مردہ دلی افراد اور اقوام کے لئے نہایت مہلک ثابت ہوتی ہے۔ اسی لئے تلقین فرماتے ہیں کہ:

دل مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ ۳۳

اقبالؔ اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ یاسیت اور قنوطیت ایک ایسی لعنت ہے جس میں مبتلا ہو کر افراد اور اقوام ''یقین'' جیسی دولت سے محروم ہو جاتی ہیں:

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے ۳۴

اقبالؔ کے نزدیک خطرات و حوادث میں گھر کر ہی زندگی گزارنے کا مزہ ہے اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ:

رفیقش گفت اے یارِ خرد مند
اگر خواہی حیات اندر خطر زی ۳۵

یا

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی ۳۶

اقبالؔ کی طرح غالبؔ بھی غموں کو گوارا بنانے اور زندگی سے لطف اندوز ہونے کا بھرپور سلیقہ رکھتے ہیں۔ وہ ''رنجِ نومیدیٔ جاوید'' کو بھی گوارا بنا لیتے ہیں تا کہ ان کا نالہ ''زبونیٔ کشِ تاثیر'' نہ ہو۔ ان کے نزدیک سکون سے زیادہ بے قراری، امید سے زیادہ نا اُمیدی اور پانے سے زیادہ پانے کی خواہش اہم ہے۔ جو لوگ زندگی کی الفت سے دور بھاگتے ہیں غالبؔ ان کو رد کرتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک:

الفتِ گُل سے غلط ہے دعویٔ وارستگی
سرو ہے با وصفِ آزادی، گرفتارِ چمن ۳۷

رنگِ طرب ہو یا غمِ محرومی دونوں کو برداشت کرنا ہی زندگی ہے ان کے نزدیک طوفانِ حوادث تو اہلِ بینش کے لئے مکتب کا درجہ رکھتے ہیں:

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیِ اُستاد نہیں [۳۸]

غالبؔ کی رجائیت انہیں آنسو بہانے سے روکے رکھتی ہے۔ ہر طرف مایوسی کے کالے بادل چھائے ہوں، غموں کا لشکر اُمڈتا چلا آ رہا ہو پھر بھی مسکراہٹ دائم ان کے لبوں پر کھیلتی نظر آتی ہے اور وہ ہنستے کھیلتے موجِ حوادث سے ٹکراتے آگے نکل جاتے ہیں مثلاً میر مہدی مجروحؔ کے نام ایک خط میں مزاح کے انداز میں لکھتے ہیں:

''میرا حال سنو کہ بے رزق جینے کا ڈھب مجھ کو آ گیا ہے۔ رمضان کا مہینہ روزہ کھا کھا کر کاٹا، آیندہ خدا رزاق ہے کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے۔ بس صاحب! جب ایک چیز کھانے کو ہوئی اگر چہ غم ہی ہو تو پھر کیا غم ہے۔'' [۳۹]

رجائیت اور امید پروری ہی کی بدولت غالبؔ کی نظر زندگی کی روشن پہلوؤں کی طرف رہتی ہے۔ غالبؔ اپنی شگفتہ مزاجی اور عالی حوصلگی کی بدولت غم کی تلخیوں کی بآسانی گوارا بنا لیتے ہیں۔ درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجئے۔

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو [۴۰]

طبع ہے مشتاقِ لذت ہائے حسرت کیا کہوں
آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے [۴۱]

زمانہ سخت کم آزار ہے بہ جانِ اسدؔ
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں [۴۲]

ڈاکٹر سید عبداللہ غالبؔ کی اُمید آفرینی اور رجائیت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''غالبؔ کو اپنے غم سے لذت حاصل ہوتی ہے یہ وہ غم نہیں جس سے دل بیٹھ جاتا ہے بلکہ وہ لذت اور طلب اور بے تابی ہے جس سے لذتِ آرزو نکلتی ہے۔۔۔۔۔۔'' [۴۳]

بہ فیضِ بے دلی نومیدیِ جاوید آساں ہے
کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا ۴۴؎

ہے موجزن اک قلزم خوں کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے ۴۵؎

نہ لائے شوخیِ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی
کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے ۴۶؎

ڈاکٹر یوسف حسین خان کہتے ہیں کہ:

''ہمارے بیشتر شاعروں کے لہجے میں معمولاً دھیما پن پایا جاتا ہے اور اگر غم کا مضمون بیان کرنا ہو تو وہ ایسے نڈھال ہو جاتے ہیں کہ یہ دھیما پن مایوسی کی لے بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس غالبؔ کے یہاں غم کے بیان میں بھی لہجے کا تیکھا پن اور توانائی برقرار ہے۔'' ۴۷؎

مذکورہ خیال کی تائید کرتے ہوئے شیخ محمد اکرام اپنی کتاب ''حکیمِ فرزانہ'' میں رقم طراز ہیں کہ:

''زندگی کی مشکلات اور مصیبتوں کی نسبت مرزا کا نقطۂ نظر بھی کسی کم ہمتی یا فرومائیگی پر مبنی نہیں۔ ان کا شروع سے ہی خیال تھا کہ مشکلات سے انسان کو سبق سیکھنا چاہیئے اور ان سے اپنی اصلاح میں مدد لینی چاہیئے۔ انہوں نے مشکلات کا مردانہ وار اور بڑی ہمت سے مقابلہ کیا اور اپنی زندگی کی کشمکش کے متعلق بجا طور پر کہا:

می ستیزم با قضا از دیر باز
خویش را بر تیغِ عریاں میزنم

لعب بہ شمشیر و خنجر مے کنم
بوسہ بر ساطور و پیکاں میزنم'' ۴۸؎

لیکن تجربے نے انہیں سکھا دیا تھا کہ سب مشکلات انسان کے بس کی نہیں ہوتیں اور زندگی میں کئی ایسے مرحلے آ جاتے ہیں جہاں قضا و قدر کے سامنے سر جھکانا پڑتا ہے۔ مصائب کے آگے ہتھیار ڈال دینا، رونا پیٹنا غالبؔ کا شیوہ نہیں تھا۔ وہ دولتِ درد کو اہلِ دنیا سے چھپا کر سینے میں مستور رکھنا جانتے تھے۔ خود فرماتے ہیں:

سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ ہاں

دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے ۴۹

ہاں کبھی کبھی لبِ خنداں سے آہ و فریاد بھی نکل ہی جاتی ہے جو فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہے۔ نفسیاتِ انسانی کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل

انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں ۵۰

یا

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں

روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں؟ ۵۱

اسی خیال کو ایک جگہ فکر و فلسفہ کی آمیزش کے ساتھ یوں پیش کرتے ہیں:

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اُٹھتی ہے صدا

ہر کوئی در ماندگی میں نالے سے ناچار ہے ۵۲

یا

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے

آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا ۵۳

علامہ اقبالؔ کے ہاں تعقل و حکمت غالبؔ سے کہیں زیادہ بڑھ کر تھا اسی لئے انہوں نے غم کی فلسفیانہ توجیح کی ہے "زبورِ عجم" کی نظم "بندگی نامہ" میں کہتے ہیں:

غم دو قسم است اے برادر گوش کن

شعلۂ ما را چراغِ ہوش کن

یک غم است آں کہ آدم را خورد
آں غمِ دیگر کہ ہر غم را خورد

آں غمِ دیگر کہ مارا ہمدم است
جان ما از صحبتِ او بے غم است ۵۴؎

یعنی اے برادرِ محترم! توجہ سے سن کہ غم دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ غم ہے جو خود انسان کو کھا جاتا ہے مگر اس کے مقابلے میں جو دوسرا غم ہے وہ ہر غم کو مٹانے والا ہے۔ یہی دوسرا غم ہمارا ہمدم و دمساز ہے اور ہماری جان اس کی ہم نشینی سے فلاح وسکون میں رہتی ہے کیونکہ اس دوسرے غم میں مشرق و مغرب کے ہنگامے اور ولولے مخفی ہیں۔ علامہ اقبالؔ کا غم یہی دوسری نوعیت کا غم یعنی ''غمِ دیگر'' ہے یعنی انہیں اپنا نہیں دوسروں کا غم ہے وہ اپنے غم کے طفیل دوسروں کو زندہ و بیدار کرنے کے متمنی ہیں وہ کہتے ہیں:

جس طرح رفعتِ شبنم ہے مذاقِ رم سے
میری فطرت کی بلندی ہے نوائے غم سے ۵۵؎

غم کی یہی فلسفیانہ تفسیر ان کی نظم ''فلسفۂ غم'' میں بھی دیکھی جا سکتی ہے جہاں وہ غم کو مصائب و آلام سے نبرد آزما ہونے کی مشق کا نام دیتے ہیں:

گو سراپا کیفِ عشرت ہے شرابِ زندگی
اشک بھی رکھتا ہے دامن میں سحابِ زندگی
موجِ غم پہ رقص کرتا ہے حبابِ زندگی
ہے الم کا سورہ بھی جزوِ کتابِ زندگی ۵۶؎

اقبالؔ سے قبل اسلامی تصوف میں غیر اسلامی تصورات شامل ہو گئے تھے سستی کو توکّل اور کاہلی کو قناعت کا نام دے کر مسلمان ''ہاتھ پر ہاتھ پہ ہاتھ دھرے محوِ غمِ دوش'' بیٹھے تھے ایسے میں اقبالؔ نے اپنے رجائی خیالات سے اُمتِ مسلمہ کی فعال قوتوں کو جگایا اور انہیں خود اعتمادی، روشن ضمیری، عزمِ مسلسل اور کاوشِ پیہم کا سبق سکھایا۔ ان کے نزدیک زندگی تسخیرِ حیات، تڑپنے، پھڑکنے اور لذتِ پرواز کا دوسرا نام ہے۔

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ

جاوداں، پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی ۵۷

اقبال کے کلام میں رجائیت اور اُمید آفرینی اول تا آخر برقرار رہی۔ انہیں یقینِ کامل تھا کہ زندگی کی شامِ غم ایک نہ ایک دن ضرور صبحِ اُمید کی صورت میں نمودار ہوگی۔ ملت کے درخشاں مستقبل پر اقبال کا ایمان ہمیشہ غیر متزلزل رہا۔

کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے

ہے بھروسا اپنی ملت کے مقدر پر مجھے ۵۸

نظم ''شمع وشاعر'' میں مسلمانوں کو رجائیت اور زندہ دلی کی تعلیم دیتے ہوئے کہتے ہیں:

بے خبر تُو جوہرِ آئینۂ ایام ہے

تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تُو

دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے ۵۹

نظم کا اختتام بھی امید اور خوشی کے اس احساس کے ساتھ ہوتا ہے۔

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش

اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے

یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے ۶۰

اقبال نے اپنی قوم کو کہیں بھی مایوسی کا درس نہیں دیا اور نہ خود ہی اپنی قوم سے مایوس ہوئے:

نو مید نہ ہو ان سے اے رہبرِ فرزانہ

کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی ۶۱

نہیں ہے نا اُمید اقبالؔ اپنی کشتِ ویراں سے

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی ۶۲

اقبالؔ مایوس کن حالات میں بھی کبھی مایوس نہیں ہوئے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یاس اور قنوطیت ان کے نصب العین کی راہ میں سمِ قاتل ثابت ہوگی۔ وہ مسلمانوں کے زوال کو ان کے عروج کا پیش خیمہ سمجھتے ہیں۔ ان کی رجائیت اور زندہ دلی انہیں ہمیشہ زندگی کا مثبت رخ دکھاتی ہے۔ انہیں امید ہے کہ جس طرح کعبے کو صنم خانے سے پاسباں مل گئے اسی طرح ترکوں کے مصائب ان کی کامیابی پر منتج ہوں گے۔

اگر عثمانیوں پہ کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے

کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا ۶۳

اقبالؔ کا تمام تر پیغام رجائیت، امید اور قوت پر مبنی ہے نظم ''طلوعِ اسلام'' کے ولولہ انگیز اشعار میں اقبالؔ قوم کو رجائیت کا پیغام کچھ یوں دے رہے ہیں:

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے

یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

مکاں فانی مکیں آنی ازل تیرا ابد تیرا

خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے

تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی

جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا

لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا ۶۴

الغرض اقبالؔ نے ہر صنفِ سخن میں رجائیت سے بھرپور خیالات پیش کئے ان کا کلام یاس و قنوط سے منزہ اور اُمید و رجاء کا ترجمان ہے۔ غالبؔ اور اقبالؔ کے کلام میں شگفتگی اور زندہ دلی کا جائزہ لیتے ہوئے شیخ محمد اکرام ''حکیمِ فرزانہ'' میں لکھتے ہیں:

''اقبالؔ کی نسبت یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی روزمرہ کی زندگی میں شگفتگی اور زندہ دلی کا عنصر مرزا

غالبؔ سے زیادہ تھا لیکن یہ صحیح ہے کہ وہ اپنے اشعار میں زندگی کی تلخ حقیقتوں سے واقف ہوتے ہوئے بھی قصداً ان کی شکایت نہیں کرتے۔۔۔۔'' ۶۵

شیخ محمد اکرام کی رائے میں تلخ حقائق سے قصداً گریز کرنا کلامِ اقبالؔ کی خوبی بھی ہے اور خامی بھی۔ کیونکہ اقبالؔ کے بعض مداحوں نے ان کے اشعار سے جو رجائیت اخذ کی ہے وہ کھوکھلی اور نقصان دہ ہے نیز بادیٔ النظر میں یہ گمان گزرتا ہے کہ زندگی میں تلخ حقیقتوں کی تعداد ہی تھوڑی ہے۔ اقبالؔ کے بعض اشعار ایسے بھی ہیں جن سے یہ غلط خیال جنم لیتا ہے کہ انسانی ارتقاء کی انتہائی منزلیں طے کرنا کوئی مشکل کام نہیں جب کہ مرزا غالبؔ کا کلام اس نقص سے بری ہے۔ غالبؔ نے زندگی کی زیادہ مکمل اور زیادہ صحیح تصویر پیش کی ہے اور انسانی زندگی کی مشکلات اور تلخیوں کا بھی پورے طور پر ذکر کیا ہے اس لئے جب وہ اپنے بلند ارادوں کا ذکر کرتے ہیں تب بھی وہ جوش میں آپے سے باہر نہیں ہوتے۔

جیسا کہ اقبالؔ کہتے ہیں کہ:

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بہ کمند آور اے ہمتِ مردانہ! ۶۶

غالبؔ نے بھی ایک شعر میں قریب قریب یہی خیال پیش کیا ہے لیکن حقیقت پسندی اقبالؔ کے شعر سے کہیں زیادہ ہے

گفتمش ذرہ بہ خورشید رسد؟ گفت ''محال''
گفتمش کوششِ من طلبش؟ گفت ''رواست'' ۶۷

جہاں تک عملی بلند ہمتی، جرات اور جدوجہد کا تعلق ہے مرزا غالبؔ، اقبالؔ سے پیچھے نہ تھے۔ اردو شاعری کی روایت میں غالبؔ وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے ''تنگنائے غزل'' کو غمِ جاناں کی محدود وادی سے نکال کر ''غمِ دوراں'' اور غمِ روزگار'' کے لئے بھی جگہ بنائی اور آنے والے شعراء یعنی حالیؔ اور اقبالؔ کے لئے نئی راہوں کا تعین کیا۔ جاں سپاری، جگرداری، حوصلہ مندی اور رجائیت غالبؔ کی شاعری کا سب سے نمایاں وصف ہے جس کی ہمہ گیر اور بھرپور شکل کلامِ اقبالؔ میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، شعور اور لاشعور کا شاعر ۔۔۔ غالب (لاہور: فیروز سنز ۔۔س ۔ن) صفحہ ۱۰۲

۲۔ عبداللہ، ڈاکٹر، سیّد، نقدِ میر، (لاہور: مکتبۂ خیابان ادب ۔ اشاعت سوم ۱۹۶۸ء) صفحہ ۳۱۲، ۳۱۳

۳۔ غالب، دیوانِ غالب جدید، صفحہ ۱۳۹

۴۔ ایضاً ، صفحہ ۴۵

۵۔ عبداللہ، ڈاکٹر، سید، مسائل اقبال، صفحہ ۱۱۶

۶۔ غالب، خطوطِ غالب، مرتبہ غلام رسول مہر، صفحہ ۳۴۲

۷۔ اے۔ بی اشرف، ڈاکٹر، میر ، غالب اور اقبال، صفحہ ۳۹

۸۔ غالب، دیوان، غالب جدید، صفحہ ۱۱۲

۹۔ ایضاً ، صفحہ ۱۴۱

۱۰۔ ایضاً، صفحہ ۹۷

۱۱۔ ایضاً، صفحہ ۸۴

۱۲۔ ایضاً ، صفحہ ۱۷۶

۱۳۔ اقبال، اقبال نامہ، حصہ دوم (مکاتیب اقبال) مرتبہ عطا اللہ، شیخ، صفحہ ۱۳۱

۱۴۔ اقبال بانگ درا، کلیات اقبال اُردو ، صفحہ ۱۳۲

۱۵۔ عبداللہ، ڈاکٹر، سید، مسائل اقبال ، صفحہ ۱۲۲

۱۶۔ یوسف حسین، ڈاکٹر ، خان، متحرک جمالیات، صفحہ ۱۳۰

۱۷۔ اقبال، بانگ درا، کلیات اقبال اُردو، صفحہ ۱۵۵

۱۸۔ اقبال، بال جبریل، کلیاتِ اقبال اُردو، صفحہ ۳۶۲

۱۹۔ ایضاً ، صفحہ ۳۰۶

۲۰۔ اقبال ، ضرب کلیم، کلیات اقبال اُردو، صفحہ ۶۸۸

۲۱۔ ایضاً ، صفحہ ۵۹۰

۲۲۔ ایضاً ، صفحہ۵۸۱

۲۳۔ ایضاً ، صفحہ۵۸۸

۲۴۔ ایضاً ، صفحہ۵۸۷

۲۵۔ ایضاً ، صفحہ۵۸۷

۲۶۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیات اقبالؔ اُردو، صفحہ۳۴۷

۲۷۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ۱۰۴

۲۸۔ غالبؔ، خطوطِ غالبؔ، مرتبہ غلام رسول مہر، صفحہ۱۷۷

۲۹۔ اقبالؔ، بال جبریل، کلیات اقبالؔ اُردو، صفحہ۳۲۲

۳۰۔ اقبالؔ۔ ضرب کلیم، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ۵۹۶

۳۱۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ۳۱۳

۳۲۔ ایضاً ، صفحہ۴۱۲

۳۳۔ اقبالؔ، ضرب کلیم، کلیات اقبالؔ اُردو، صفحہ۴۹۸

۳۴۔ اقبالؔ، بانگِ درا، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۲۷۳

۳۵۔ اقبالؔ، پیامِ مشرق، کلیاتِ اقبالؔ فارسی، صفحہ۲۹۳

۳۶۔ اقبالؔ، بانگِ درا، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ۲۵۸

۳۷۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ۱۱۹

۳۸۔ ایضاً، صفحہ۱۳۵

۳۹۔ غالبؔ، خطوطِ غالبؔ، مرتبہ غلام رسول مہر، صفحہ۲۲۹

۴۰۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ۱۵۳

۴۱۔ ایضاً، صفحہ۱۹۵

۴۲۔ ایضاً، صفحہ۱۲۰

۴۳۔ عبداللہ، ڈاکٹر، سید، مسائلِ اقبالؔ، صفحہ۱۲۲

۴۴۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ۲

۴۵۔ ایضاً، صفحہ۲۷۶

۴۶۔ ایضاً، صفحہ۱۸۹

۴۷۔ یوسف حسین ، ڈاکٹر، خان، متحرک جمالیات، صفحہ۱۹۲

۴۸۔ محمد اکرام، ڈاکٹر، شیخ، حکیمِ فرزانہ، صفحہ۱۷۵

۴۹۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ۱۹۷

۵۰۔ ایضاً، صفحہ۱۳۷

۵۱۔ ایضاً، صفحہ۱۴۱

۵۲۔ ایضاً، صفحہ۱۸۷

۵۳۔ ایضاً، صفحہ۲۵

۵۴۔ اقبالؔ، زبورِ عجم، کلیاتِ اقبالؔ فارسی، صفحہ۵۷۶

۵۵۔ اقبالؔ، بانگِ درا، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ۱۲۵

۵۶۔ ایضاً، صفحہ۱۵۵

۵۷۔ ایضاً، صفحہ۲۵۹

۵۸۔ ایضاً، صفحہ۱۹۶

۵۹۔ ایضاً، صفحہ۱۹۲۔۱۹۳

۶۰۔ ایضاً، صفحہ۱۹۵

۶۱۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ۳۴۸

۶۲۔ ایضاً، صفحہ۳۰۳

۶۳۔ اقبالؔ، بانگِ درا، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ۲۶۸

۶۴۔ ایضاً، صفحہ۲۶۹۔۲۷۰

۶۵۔ محمد اکرام، ڈاکٹر، شیخ، حکیمِ فرزانہ، صفحہ۱۷۶۔۱۷۷

۶۶۔ اقبالؔ، پیامِ مشرق، کلیاتِ اقبالؔ فارسی، صفحہ ۳۳۶

۶۷۔ غالبؔ، کلیاتِ غالبؔ فارسی، جلد دوم، صفحہ ۲۰۰

غالبؔ اور اقبالؔ کی نکتہ آفرینی

غالبؔ اور اقبالؔ کی نکتہ آفرینی

نکتہ ایسی باریک، معنی خیز اور لطیف بات کو کہتے ہیں جو ہر کس و ناکس کو نہیں سوجھ سکتی۔ کیونکہ ایک نکتہ داں اور نکتہ آفرین عام و عامی سے زیادہ زیرک، زیادہ ذکی اور تیز فہم کا مالک ہوتا ہے۔ اس کی نگاہِ باریک بیں اشیا کی تہہ تک پہنچتی ہے اور اسے نت نئی اور تہہ دار باتیں کہنے پر اُکساتی ہے۔ صرف وہی ہستیاں نکتہ آفرینی پر قادر ہوسکتی ہیں جو تقلید کی بجائے اجتہاد کی قائل ہوں اور پامال راہوں پر چلنے کی بجائے اپنے لئے نئی راہوں کا خود تعین کرسکیں۔
اُردو شاعری کی روایت میں غالبؔ اور علامہ اقبالؔ، ایسی عظیم ہستیاں ہیں جن کی شاعری جدتِ تخیل اور ندرت مضامین کا نادر مرقع ہے لہٰذا معنی آفرینی اور نکتہ سنجی کو غالبؔ اور اقبالؔ کی فکر کا ایک مشترک پہلو قرار دیا جاسکتا ہے۔ گو کہ نکتہ آفرینی کا رشتہ اکثر اسلوب سے جوڑا جاتا ہے لیکن درحقیقت اِس کے پسِ پردہ بھی فکر و خیال ہی کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

معنی آفرینی اور لطافتِ خیال بڑا نازک فن ہے۔ اردو شاعری کی روایت شاہد ہے کہ اکثر و بیشتر شعراء نکتہ آفرینی کے شوق میں اشکال و ابہام کی سرحدوں تک جا پہنچے لیکن غالبؔ اور اقبالؔ کی نکتہ آفرینی کا معاملہ اس سے جُدا ہے۔ دونوں شعراء کو قدرت کی طرف سے نادرہ کار تخیل عطا ہوا تھا۔ دونوں کی شاعری میں بڑا تنوع اور رنگارنگی ہے اور دونوں کی نکتہ آفرینیاں جدتِ تخیل اور طرزِ ادا کی جدت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ شاعری کے بارے میں غالبؔ کی جو رائے تھی اس کا اظہار کرتے ہوئے منشی ہرگوپال تفتہ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

''بھائی! شاعری معنی آفرینی ہے، قافیہ پیمائی نہیں ہے''۔[1]

خود اپنی شاعری کے باب میں اُن کا دعویٰ یہ ہے کہ

فکر میری گہر اندوزِ اشارات کثیر
کلک میری رقم آموزِ عباراتِ قلیل
میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح
میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل[2]

جب کہ علامہ اقبالؔ اپنی فکرِ بلند کی بابت فرماتے ہیں

صفتِ برق چمکتا ہے مرا فکر بلند

کہ بھٹکتے نہ پھریں ظلمتِ شب میں راہی ۳؎

ایک جگہ شعر کی حقیقت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

میں شعر کے اسرار سے محرم نہیں لیکن

یہ نکتہ ہے تاریخِ امم جس کی ہے تفصیل

وہ شعر کہ پیغامِ حیات ابدی ہے

یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگِ سرافیل ۴؎

علامہ اقبالؔ سراپا نکتہ آفرین اور نکتہ شناس شاعر تھے۔ایک مفکر شاعر ہونے کے ناتے ان کی نکتہ آفرینی کا مقام و مرتبہ بہت بلند ہے۔اسی لئے ان کی سی نکتہ آفرینی کسی اور کے بس کی بات نہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ نکتہ آفرینی کی ابتداء بھی اقبالؔ سے پہلے غالبؔ کے یہاں ہو چکی تھی۔خود علامہ اقبالؔ کو غالبؔ کی شاعری کے اس رخ نے بے حد متاثر کیا تھا۔مرزا غالبؔ کی شان میں لکھی جانے والی نظم میں فرماتے ہیں:

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا

ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا

لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں

ہو تخیل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں

تیرے فردوسِ تخیل سے ہے قدرت کی بہار

تیری کشتِ فکر سے اُگتے ہیں عالم سبزہ وار ۵؎

غالبؔ کی نکتہ آفرینی:

غالبؔ سے پیشتر اردو غزل اپنی معنوی لطافت سے محروم ہو چکی تھی۔لفظی تراش خراش، نازک تشبیہوں اور استعاروں پر تمام تر زور صرف کر دیا جاتا تھا۔شعر کے ظاہری حسن کو نکھار بخشنا ہی مقصود بالذات ہو کر رہ گیا تھا۔ایسے میں غالبؔ اس صورتحال کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں
پابستگی رسم و رہِ عام بہت ہے [6]

غالبؔ کی جدت پسند طبیعت اور نکتہ رَس فطرت نے پامال راستوں پر چلنا اپنی شان کے خلاف سمجھا اور اپنے ''قصرِ شاعری'' کی بنیاد جدت طرازی پر استوار کی بقول آل احمد سرور:

''اس جدت طرازی میں جدتِ تخیل، جدتِ طرز ادا اور جدتِ استعارات وتشبیہات، جدتِ محاکات اور جدتِ الفاظ سب محاسنِ شعری جاتے ہیں''۔ [7]

غالبؔ کی جدت پسندی انہیں ہر وقت نیا انداز اور نئی بات پیدا کرنے پر اکساتی رہتی تھی وہ نکتہ آفرینی کے اس حد تک دلدادہ تھے کہ نئی اختراعات ہی کو کمالِ شاعری سمجھتے تھے۔ غالبؔ کو اپنی نکتہ آفرین طبیعت کا خود بھی احساس تھا۔ عبدالرزاق شاکر کے نام ایک خط میں اِس شعر کو کہ:

شوق ہر رنگ رقیبِ سرو ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

اپنی نکتہ آفرینی کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

''۔۔۔۔ یہ ایک بات میں نے اپنی طبیعت سے نئی نکالی ہے جیسا کہ اس شعر میں:

نہیں ذریعۂ راحت جراحت پیکاں
وہ تیغِ زخم ہے جس کو کہ دلکشا کہیئے'' [8]

علامہ نیاز فتح پوری کے خیال میں اگر غالبؔ کی دیگر تمام خصوصیات کو نظر انداز کر کے صرف اسی ایک خصوصیت کو سامنے رکھا جائے تو بھی ان کے باکمال غزل گو ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا وہ فرماتے ہیں:

''محض معنی آفرینی یقیناً کوئی وزن نہیں رکھتی، اگر وہ کسی ذہین مطالعہ کا نتیجہ نہیں ہے، لیکن ایک باکمال شاعر کی معنی آفرینی باوجود نزاکتِ تخیل کے نہ فطری حدود سے آگے بڑھتی ہے اور نہ زبان و بیان کے لحاظ سے بارِ سماعت ہوتی ہے بلکہ وہ فلسفہ ایسے خشک مباحث میں بھی رنگینی پیدا کر کے غزل کی حدود میں لے آتی ہے۔۔۔۔۔

غالبؔ کی نکتہ آفرینیاں زیادہ تر جدتِ ادا، حسنِ تعبیر، ابداعِ بیان، جوش و سرمستی کی صورت میں نظر

آتی ہیں اور ایسے حسن کے ساتھ کہ حد سے زیادہ مبالغہ کی حالت میں بھی وجدان اس سے پورا لطف اُٹھاتا ہے۔''۹

نکتہ آفرینی کی بھی دو اقسام ہیں یعنی لفظی اور معنوی نکتہ آفرینی۔ لفظی نکتہ آفرینی کا مقصد اپنی زباندانی کا اظہار اور سطحی قسم کی ذہنی برتری اور سبقت کا احساس ہوتا ہے جب کہ معنوی نکتہ آفرینی کے ذریعے شاعر اپنے تجربے اور احساس کی باریکیوں کو شعر میں سمو کر قاری کے ذہن پر دستک دیتا ہے۔ غالبؔ اور اقبالؔ دونوں کے یہاں لفظی نکتہ آفرینی سے زیادہ معنوی نکتہ آفرینی پر زور دیا گیا ہے۔ وہ شعر میں ''ورائے شاعری چیزے دگر'' کے قائل تھے۔ تکلف و تصنّع اور لفظی شعبدگری انہیں مطلوب نہ تھی۔

غالبؔ کے اردو دیوان میں شاید ہی کوئی ایسا خیال مل سکے جو بالکل نیا اور اچھوتا نہ ہو۔ انہیں بات بات میں نکتے پیدا کرنے میں کمال حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں معانی کی مختلف سطحیں ملتی ہیں۔ سرسری نظر میں شعر کا مفہوم کچھ ہوتا ہے اور غور کرنے پر نئے نئے معانی نکلتے چلے آتے ہیں۔ خود انہیں بھی اپنے کلام کی اس خوبی کا احساس تھا تبھی فرماتے ہیں کہ:

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے ۱۰

مولانا حالیؔ نے کلامِ غالبؔ کی اس خوبی کو ''پہلوداری'' سے تعبیر کیا ہے۔ ان کی رائے کے مطابق:

''ان کے اکثر اشعار کا بیان ایسا پہلو دار واقع ہوا ہے کہ بادیٔ النظر میں اس سے کچھ اور معنی مفہوم ہوتے ہیں، مگر غور کرنے کے بعد اس میں ایک دوسرے معنی نہایت لطیف پیدا ہوتے ہیں، جن سے وہ لوگ جو ظاہری معنوں پر قناعت کر لیتے ہیں، لطف نہیں اُٹھا سکتے۔''۱۱

غالبؔ کی شاعری میں اکثر معانی کی مختلف سطحیں نظر آتی ہیں جن کی وضاحت شیکسپیئر کی عظیم ڈرامائی شاعری کی طرح مختلف سطحوں پر کی جا سکتی ہے نہ صرف ان کا اندازِ بیان اچھوتا ہے بلکہ مضامین میں بھی حیرت انگیز نزاکتیں موجود ہیں۔ صرف چند اشعار پیشِ خدمت ہیں۔

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا ۱۲

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا ۱۳

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے ۱۴

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا ۱۵

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو ۱۶

ملنا اگر ترا نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں ۱۷

کیونکر اُس بت سے رکھوں جان عزیز
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز ۱۸

غالبؔ کی یہ نکتہ آفرینیاں زیادہ تر جدّت ادا کی عکاسی کرتی ہیں۔ غالبؔ کی اسی انفرادیت اور جدت پسندی کو ڈاکٹر سلیم اختر ''نرگسیت'' اور ''الفتِ ذات'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ ۱۹ نثر ہو یا شاعری غالبؔ ہر جگہ اپنی انفرادیت کے اظہار کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ وہ اپنے خیالات کے اظہار میں اپنی ''میں'' کا جوش کہیں نہیں دبا پاتے وہ دنیائے عشق کی نامور ہستیوں سے نہ صرف اپنا موازنہ کرتے ہیں بلکہ ان پر طنز کرتے ہوئے اپنی برتری کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ حقائق کی جستجو میں انہوں نے جابجا ''بت شکنی'' کی ہے بقول پروفیسر احتشام حسین:

''رسم پرستی اور تقلید کے خلاف حساس انسان ہمیشہ آواز اُٹھاتے رہے ہیں لیکن جس شاعر کی آواز میں بت شکنوں کے نعرے کی گونج پیدا ہوئی وہ غالبؔ ہی ہیں'' ۔[۲۰]

پروفیسر احتشام حسین کی رائے کے مطابق زندگی کو نئے تحریوں کی راہ پر ڈالنا، بندھے ٹکے اصولوں سے انحراف کر کے زندگی میں نئی قدروں کی جستجو کرنا بت شکنی ہے اور غالبؔ کی تمام شاعری میں یہ عمل جاری و ساری نظر آتا ہے۔ جس شخص کو اپنی نگاہ اور اپنی فکر پر اعتماد ہو وہ سنی سنائی باتوں پر یقین رکھنا گوارا نہیں کرتا وہ مسلمات اور معتقدات جنہیں لوگ آنکھیں بند کر کے تسلیم کرتے چلے آ رہے ہیں۔ غالبؔ ان سے انحراف کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ اپنے ایک فارسی شعر میں اعتراض کرنے والوں سے کہتے ہیں کہ مجھ سے مت الجھو بلکہ حضرت ابراہیمؑ کو دیکھو جب کوئی صاحب نظر ہو جاتا ہے تو اپنے بزرگوں کی راہ سے ہٹ کر نئی راہ بناتا ہے۔[۲۱] یعنی

بامن میاویز اے پدر فرزند آزر رانگر!

ہر کس کہ شد صاحب نظر، دینِ بزرگاں خوش نکرد[۲۲]

غالبؔ نے قدیم تلمیحی روایتوں سے انحراف کرتے ہوئے جس نکتہ آفرینی، شوخی وظرافت اور بذلہ سنجی سے کام لیا ہے اس کی مثال ہمیں ڈھونڈے سے نہیں ملتی مثلاً شیریں فرہاد کی عشقیہ داستان پر انہوں نے کڑی تنقید کی ہے۔ فرہاد ان کے نزدیک ایک اناڑی قسم کا عاشق تھا جو رسوم و قیود کا پابند رہا۔ بھلا سر پھوڑ کر بھی کبھی محبوب کا وصل نصیب ہو سکتا ہے۔ درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجئے۔

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ

سر گشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا[۲۳]

کوہکن نقاشِ یک تمثال شیریں تھا اسدؔ

سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا[۲۴]

عشق و مزدورِیِ عشرت گہہِ خسرو، کیا خوب

ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں[۲۵]

غالبؔ فرہاد پر اپنی برتری کا سکہ جماتے ہوئے کہتے ہیں کہ فرہاد کے برعکس غالبؔ تو ایک ایسا عاشق ہے جو تیشے بغیر بھی عشق میں جان دے سکتا ہے۔

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا ۲۶؎

غالبؔ ''اعجازِ مسیحا'' اور ''دمِ عیسیٰ'' کو بھی محض ایک سنی سنائی بات سے زیادہ اہمیت دینے کو تیار نہیں۔

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں، مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے ۲۷؎

ایک جگہ یہ خیال پیش کیا ہے کہ لبِ لعل کے کشتوں کو لبِ عیسیٰ کی جنبش قیامت میں بھی زندہ نہیں کر سکتی۔ جب کہ لبِ عیسیٰ کی جنبش سے روزِ قیامت مردے زندہ ہو کر قبروں سے اٹھیں گے لیکن لبِ محبوب کے مارے ہوؤں کی نیند اس قیامت کی ہے کہ حضرت عیسیٰ کے لب ہلنے سے پنگوڑا ہلنے لگتا ہے جس سے جھولے میں سونے والے کی نیند مزید گہری ہو جاتی ہے۔

لبِ عیسیٰ کی جُنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی
قیامت کُشتۂ لعلِ بتاں کا خواب سنگیں ہے ۲۸؎

''کوہِ طور'' کی بابت یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ پہاڑ ایک تنگ ظرف میخوار ثابت ہوا جو برقِ تجلی کے نشہ کو نہ سہہ سکا اور جل کر راکھ ہو گیا۔ برقِ تجلی طور پر گرنے کی بجائے ہم پر گرنی چاہیئے تھی کیونکہ پہاڑ کے مقابلے میں ہم حضرتِ انسان ہیں اور صرف ہمارا ظرف ہی اس تجلی کا متحمل ہو سکتا تھا الغرض شراب نوش کو شراب اس کے ظرف اور حوصلے کے مطابق ملنی چاہیئے۔

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی نہ طُور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر ۲۹؎

ایک جگہ شوخیِ طبع سے کام لیتے ہوئے یہ اچھوتا خیال پیش کیا ہے کہ آؤ کوہِ طور پر جا کر ہم بھی قسمت آزمائی کر لیں۔ لازم تو نہیں کہ حضرت موسیٰ دیدارِ الٰہی سے محروم رہے اور انہیں صاف جواب دے دیا گیا کہ ''تو نہیں دیکھ سکتا۔''

ممکن ہے ہماری درخواست بارگاہِ الٰہی میں قبولیت پا سکے۔

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی ۳۰؎

غالبؔ کو حضرت خضرؑ کی رہنمائی بھی منظور نہیں۔ اوّل تو اُن کی رہنمائی پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ انہوں نے جو کچھ سکندر کے ساتھ کیا وہ سب پر ظاہر ہے۔

لازم نہیں کہ خضرؑ کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے ۳۱؎

کیا کیا خضرؑ نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی ۳۲؎

ایک جگہ خضر کی بیاباں نوردی کو مذاق کا نشانہ بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ کیا کہ چوروں کی طرح چھپے پھرتے ہو۔ زندہ تو ہم ہیں کہ ہمیں ایک زمانہ جانتا ہے۔ مزا تو جب ہے کہ ہماری طرح مخلوق کے سامنے آؤ اور پھر اپنی انا کا اظہار کرو۔

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے ۳۳؎

ایک جگہ یہ خیال پیش کیا ہے۔

حریفِ مطلب مشکل نہیں فسونِ نیاز
دعا قبول ہو یا رب کہ عمرِ خضر دراز ۳۴؎

ایک جگہ حضرت ابراہیم سے اپنا مقابلہ کرتے ہیں۔ ان کا معجزہ تھا کہ وہ آگ میں نہیں جلے تھے لیکن میرا معجزہ یہ ہے کہ میں شعلہ و شرر کے بغیر بھی جل رہا ہوں یہ بات غیر مذکور رکھی ہے کہ حضرت ابراہیم کا آگ میں نہ جلنا بڑا معجزہ ہے یا میرا بغیر آگ کے جلنا:

شنیدہ ای کہ بآتش نسوخت ابراہیمؑ

بہ بیں کہ بے شرر و شعلہ می توانم سوخت ۳۵؎

غالبؔ اس شعر میں دیدہ وشنیدہ کا فرق بتاتے ہوئے اپنی برتری واضح کر رہے ہیں۔

جنت کی حقیقت کے بارے میں بھی غالبؔ کی رائے عام لوگوں سے ہٹ کر ہے۔ اسی لئے انہیں ایسی عبادت بھی منظور نہیں جس کا صلہ جنت ہو۔

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ

دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے

ٹیڑھا لگا ہے قط قلمِ سر نوشت کو ۳۶؎

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا

وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاقِ نسیاں کا ۳۷؎

منصور حلاج کا اظہارِ حقیقت کی پاداش میں دار پر چڑھ جانا غالبؔ کے نزدیک کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ وسیع النظری کا تقاضا ہے کہ احساس وسعت سے مغلوب نہ ہوا جائے اور اس سلسلے میں لب کشائی سے گریز کیا جائے۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن

ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں ۳۸؎

جامِ جمشید کا کوئی بدل دنیا میں موجود نہیں اس کے باوجود غالبؔ اپنے مٹی کے پیالے کو جامِ جمشید پر ترجیح دیتے ہیں کیونکہ مٹی کا پیالہ ٹوٹ جائے تو بازار سے دوسرا خریدا جا سکتا ہے بقول حالیؔ:

''یہ بالکل نیا خیال ہے جو پہلے کہیں نظر سے نہیں گزرا'' ۳۹؎

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا

ساغرِ جم سے میرا جام سفال اچھا ہے ۴۰؎

ایک جگہ یہ بلیغ مضمون تمثیل کے پیرائے میں پیش کیا ہے کہ اگر دنیا میں اہلِ ہمت کا وجود ہوتا تو وہ اسے ناچیز سمجھتے اور اس کی طرف نظرِ التفات نہ کرتے اور دنیا ویران ہو جاتی۔ دنیا اسی لئے آباد ہے کہ یہاں اہلِ ہمت مفقود ہیں۔ جس طرح میخانے میں کوئی مے خوار نہیں ہے۔ اسی طرح عالم کا معمور اور آباد ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں اہلِ ہمت موجود نہیں۔

رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے

بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے [۴۱]

غزل کا مرکزی موضوع حسن و عشق ہے لہذا غالبؔ کی غزل میں بھی مضامین حسن و عشق کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ یہ مضامین غالبؔ کی ندرتِ فکر کا شاہکار قرار دیئے جاسکتے ہیں بقول پروفیسر حمید احمد خان:

''غالبؔ کے اردو اور فارسی کلام میں حسن و عشق کو ایک نمایاں جگہ حاصل ہے۔ ان اشعار میں وہی تنوع، جدت طرازی اور نکتہ آفرینی نظر آتی ہے جو دیوان اور کلیات کے دوسرے مضامین کا امتیاز خاص ہے اگر مرزا غالبؔ اپنے کلام کا صرف یہی حصہ چھوڑ جاتے تو بھی ان کا شمار دنیا کے بڑے بڑے شاعروں میں ہوتا۔'' [۴۲]

غالبؔ نے حسن و عشق کے حوالے سے نئے نئے مضامین اختراع کئے ہیں اردو غزل کی روایت میں شاید غالبؔ ہی ایسے شاعر ہیں جو حُسنِ محبوب پر بھی چوٹ کرنے سے نہیں چوکتے۔

پوچھ مت رسوائی اندازِ استغنائے حسن

دست مرہونِ حنا، رخسار رہنِ غازہ تھا [۴۳]

اُن کو اس دن کا انتظار ہے جب محبوب خود ان کے ناز اُٹھائے۔

وہ بھی دن ہو کہ اس ستمگر سے

ناز کھینچوں بجائے حسرت ِ ناز [۴۴]

غالبؔ نے مضامینِ حسن و عشق کے ذیل میں نکتہ آفرینیوں کی جو بہار دکھائی ہے اُسے درج ذیل شعری حوالوں میں بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
دکھتے ہیں آج اُس بتِ نازک بدن کے پانو ۴۵؎

دیکھو تو دلفریبی اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی ۴۶؎

ان پری زادوں سے لیں گے خُلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں ۴۷؎

ہوا ہوں عشق کی غارتگری سے شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں ۴۸؎

ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے
یار کا دروازہ پائیں گر کھلا ۴۹؎

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا ۵۰؎

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہئے غیر سے تہی
سن کر ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں ۵۱؎

غالبؔ کا ذہن متجسس، نگاہ تیز اور شخصیت تہہ دار تھی۔ شوخی وظرافت ان کی فطرت میں کچھ اس طرح آمیز کی گئی تھی جیسے ساز میں سُر چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ اپنی اِسی فطری شوخی سے کام لے کر اکثر وہ اپنے اشعار کے مفہوم کو بے حد

پُر لطف بنا دیتے ہیں شاید اسی لئے حاؔلی نے ان کے لئے ''حیوان ظریف'' کا لقب پسند فرمایا اُن کی رائے کے مطابق:

''مرزا اپنی خوش طبعی کے ہاتھوں اس قدر مجبور تھے کہ کسی موقعے پر شوخی اور خوش طبعی کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔''[۵۲]

غالبؔ نے اپنی اس فطری بذلہ سنجی سے کام لیتے ہوئے بھی مضامین کو جدت بخشی ہے اور نئے نئے نکتے پیدا کئے ہیں۔ڈاکٹر عبادت بریلوی اُن کی غزل میں شوخی کے پہلو کا جائزہ لیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''غالبؔ ایک بڑی ہی رنگین، ایک بڑی ہی پرکار اور پہلو دار شخصیت رکھتے تھے اور اس رنگینی، پرکاری اور پہلو داری کی جھلک ان کی ایک ایک بات میں نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ روتوں کو بھی ہنسا سکتے ہیں، مردوں میں بھی جولانی کی لہر دوڑا سکتے ہیں۔ان کے پاس ایک ایسا جادو ہے کہ جس طرف بھی وہ جا نکلتے ہیں۔ ہر چیز سے زندگی اُبلنے لگتی ہے۔سوتے ہوؤں کو جگانا، جاگتے ہوؤں کو ہنسانا، ہنستے ہوؤں کو بلندیوں پر پہنچانا اُن کے لئے جیسے کوئی بات ہی نہیں۔''[۵۳]

درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجئے جن میں غالبؔ اپنی شوخیِ فکر سے کام لے کر نئے نئے مضامین سانچے میں ڈھالتے نظر آتے ہیں۔

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا [۵۴]

کہتے ہو نہ دیں گے ہم، دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجئے، ہم نے مدعا پایا [۵۵]

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسدؔ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے [۵۶]

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصہ میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا [۵۷]

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری خوشامد سے

اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے ۵۸؎

بات بات میں باریکیاں اور نزاکتیں پیدا کرنے کا فن غالبؔ کو خوب آتا تھا وہ اپنی طبیعی ذہانت اور فطری شوخی سے کوئی نہ کوئی ایسا موقعہ ضرور تلاش کر لیتے تھے جہاں وہ خود بھی مسکراتے اور پڑھنے والے کو بھی مسکرانے کی دعوت دیتے۔ ان کی ہنسی اکثر بڑی پُر اثر اور معنی خیز ہوتی ہے جسے گرانقدر ادبی سرمایہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ علامہ اقبالؔ نے غالبؔ کی شوخیِ تحریر کو سراہتے ہوئے خوب کہا ہے کہ

زندگی مضمر ہے تیری شوخیِ تحریر میں

تابِ گویائی سے جنبش ہے لبِ تصویر میں ۵۹؎

خود غالبؔ کا یہ شعر ان کی نکتہ آفرینی کا اعتراف ہے۔

ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے ۶۰؎

علامہ اقبالؔ کی نکتہ آفرینی:

علامہ اقبالؔ کو سراپا نکتہ آفریں اور نکتہ شناس شاعر ہونے کا شرف حاصل ہے لیکن ان کی نکتہ آفرینی کا معاملہ غالبؔ سے جدا ہے کیونکہ غالبؔ کا دائرہ خیال ایک فرد کی ذات، اس کے تجربات اور محسوسات کے گرد گھومتا ہے جب کہ علامہ اقبالؔ نے اپنی شاعری کو ذات کے دائرے سے نکال کر آفاقیت اور ہمہ گیری عطا کی۔ اُن کے نزدیک:

دلوں میں ولولے آفاق گیری کے نہیں اُٹھتے

نگاہوں میں اگر پیدا نہ ہو اندازِ آفاقی ۶۱؎

غالبؔ غزل کے شاعر تھے لہٰذا ان کی نکتہ آفرینیاں جستہ جستہ غزل کے اشعار میں جلوہ ساماں ہیں۔ جب کہ اقبالؔ نے اپنے پیغام اور اس کے موثر ابلاغ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے نظم کو منتخب فرمایا اور اُردو نظم کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ ڈاکٹر اسلم انصاری کی رائے کے مطابق:

''جس طرح مرزا غالبؔ نے اردو غزل کو آفاقی شاعری کا لب ولہجہ عطا کیا تھا اسی طرح اقبالؔ نے بھی بیک جست اردو نظم کو دنیا کی بلند پایہ شاعری کا ہم عنان و ہم زباں بنا دیا۔ اردو نظم جو ابھی تک

یک رخی، سادہ اور نقشِ مثّری تھی اقبال کے ہاتھوں پہلودار، پیچیدہ اور رنگین بن گئی۔''۶۲

نکتہ آفرینی اور خیال افروزی آسانی سے ہاتھ آجانے والا فن نہیں ہے اس کے لئے سلیقہ اور شعور چاہیئے کیونکہ خیال افروزی اور نکتہ آفرینی کے ذریعے شاعر قاری تک وہ معانی بھی پہنچا دیتا ہے جو بظاہر مذکور نہیں ہوتے۔ تہہ دار الفاظ: خیالات اور افکار کے ایک سلسلے کو جگا دیتے ہیں اگر شاعر اس فن کو برتنے کے سلیقہ سے ناواقف ہو تو مقاصد کا حصول مشکل ہے اور سلیقہ مسلسل مشق اور ریاض ہی سے حاصل ہو سکتا ہے اسی لئے اپنی نظم ''ایجادِ معانی'' میں اقبال فرماتے ہیں:

ہر چند کہ ایجادِ معانی ہے خداداد
کوشش سے کہاں مردِ ہنر مند ہے آزاد
خونِ رگِ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر
مے خانۂ حافظ ہو کہ بت خانۂ بہزاد
بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد ۶۳

سید عابد علی عابد کی رائے کے مطابق:

''ہر بڑا فنکار خیال افروزی کے رموز واسرار سے واقف ہوتا ہے۔ کبھی تلمیحات سے، کبھی استعارے اور کنائے سے، کبھی الفاظ کی رمزی اور ایمائی دلالتوں سے اور کبھی الفاظ کے صوتی اور معنوی تلازموں سے کام لے کر اور فائدہ اُٹھا کر معانی کی مختلف سطحوں اور تہوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ خیال افروزی انداز کی وہ صفتِ خاص ہے جو معانی کی مختلف سطحوں اور تہوں کی جھلک دکھاتی ہے اور کبھی ان معانیٔ تازہ کا بھی سراغ دیتی ہے جو شاعر کے علم میں بھی نہ تھے۔''۶۴

اقبال کے یہاں یہ فن اپنی نکھری ہوئی اور ترقی یافتہ صورت میں کھل کر سامنے آتا ہے۔ ان کی نکتہ آفرینیوں کو نہ صرف مختلف اشعار کی صورت میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے بلکہ پوری کی پوری منظومات بھی ندرتِ خیال اور جدتِ فکر کی آئینہ دار ہیں بقول ڈاکٹر محمد ریاض

''اقبال کی شاعری اوّل سے آخر تک مشاہداتی نکتوں سے بھرپور نظر آتی ہے۔''۶۵

اگر صرف ''بانگ درا'' کا حصہ اول (۱۹۰۵ تک کا کلام) ہی اُٹھا کر دیکھیں تو اس میں پھول، ابر کہسار،

شمع و پروانہ، آفتاب صبح، گل پژمردہ، ماہ نو، جگنو اور ستارہ صبح کے بارے میں شاعر کے مشاہدات نہایت لطیف اور گہرے ہیں۔ چند نمونے ملاحظہ کیجئے۔

اے ہمالہ! داستاں اُس وقت کی کوئی سنا
مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اُس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا
داغ جس پر غازۂ رنگِ تکلف کا نہ تھا
ہاں دکھا دے اے تصوّر پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو ۶۶

(ہمالہ)

گرنا ترے حضور میں اس کے نماز ہے
ننّھے سے دل میں لذتِ سوز و گداز ہے
کچھ اس میں جوش عاشق حسن قدیم ہے
چھوٹا سا طور تُو، یہ ذرا سا کلیم ہے ۶۷

"شمع و پروانہ"

تجھ پہ برساتا ہے شبنم دیدہ گریاں مرا
ہے نہاں تیری اُداسی میں دل ویراں مرا
میری بربادی کی ہے چھوٹی سی اک تصویر تو
خواب میری زندگی تھی جس کی ہے تعبیر تو
ہمچو نے از نیستانِ خود حکایت می کنم
بشنو اے گل! از جدائیہا شکایت می کنم ۶۸

"گلِ پژمردہ"

چرخ نے بالی چرالی ہے عروسِ شام کی
نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیمِ خام کی ۶۹

"ماہ نو"

میری قدرت میں جو ہوتا، تو نہ اختر بنتا
قعرِ دریا میں چمکتا ہوا گوہر بنتا
واں بھی موجوں کی کشاکش سے جو دل گھبراتا
چھوڑ کر بحر کہیں زیبِ گلو ہو جاتا
زندگی وہ ہے کہ جو ہو نہ شناسائے اجل
کیا وہ جینا ہے کہ ہو جس میں تقاضائے اجل
ہے یہ انجام اگر زینتِ عالم ہو کر
کیوں نہ گر جاؤں کسی پھول پر شبنم ہو کر ؎۲۰

''صبح کا ستارہ''

''گورستان شاہی'' حصہ سوم کی ایک ایسی نظم ہے جو سوز واثر سے معمور ہونے کے ساتھ ساتھ شاعرانہ مصوری کی ایسی حسین مثال ہے کہ پڑھنے والے پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے:

باغ میں خاموش جلسے گلستاں زادوں کے ہیں
وادی کہسار میں نعرے شباں زادوں کے ہیں
زندگی سے یہ پرانا خاکداں معمور ہے
موت میں بھی زندگانی کی تڑپ مستور ہے
پتیاں پھولوں کی گرتی ہیں خزاں میں اِس طرح
دستِ طفلِ خفتہ سے رنگیں کھلونے جس طرح
اِس نشاط آباد میں گو عیش بے اندازہ ہے
ایک غم یعنی غمِ ملت ہمیشہ تازہ ہے ؎۲۱

''گورستانِ شاہی''

''نظم شکوہ'' اور ''جواب شکوہ'' موضوع اور خیالات کی طرفگی، تمثیل نگاری اور خیال آفرینی کی خوبصورت مثال ہے۔ تمہید سے لے کر خاتمہ تک نظم کا ہر بند قاری کو اپنے سحر میں گرفتار کیے رکھتا ہے۔ اِس نظم کے توسط سے اقبال نے بندوں کو خدا سے ''ہم سخن'' کرنے کا فریضہ سر انجام دیا ہے۔ اور بقول ڈاکٹر عبدالمغنی:

''تاریخ، فلسفہ اور سیاست کے پُر خیال نکتوں کے درمیان اور ان کی فنکارانہ پیشکش کے لئے اعلیٰ، نفیس، دبیز اور لطیف شاعری کی جھلکیاں نظم کے دونوں حصّوں میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں''۲ے

بادہ کش غیر ہیں گلشن میں لبِ جو بیٹھے
سنتے ہیں جام بکف نغمۂ کو کو بیٹھے
دور ہنگامہ گلزار سے یک سو بیٹھے
تیرے دیوانے بھی ہیں منتظر ھو بیٹھے

اپنے پروانوں کو پھر ذوق خود افروزی دے
برقِ دیرینہ کو فرمانِ جگر سوزی دے ۳ے

''شکوہ''

مثل بو قید ہے غنچے میں پریشاں ہو جا
رخت بردوش ہوائے چمنستاں ہو جا
ہے تنک مایہ تُو، ذرے سے بیاباں ہو جا
نغمۂ موج سے ہنگامہ طوفاں ہو جا

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجا لا کر دے ۴ے

''جواب شکوہ''

ڈاکٹر یوسف حسین خان اقبالؔ کے شاعرانہ مسلک پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں

''اقبالؔ کی شاعری کا کمال اِس کی رمزیت اور کنائے میں مضمر ہے لیکن وہ مغربی رمزیت کی طرح قدیم ادبی روایات کو کلیتہً ترک نہیں کرتا اور نہ اپنے کلام کو چیستان بناتا ہے۔۔۔یہی وجہ ہے کہ اُس کی پیامی اور معلّمانہ شاعری میں بھی خشکی اور بے لطفی نہیں پیدا ہوئی۔''۵ے

نظم ''شمع و شاعر'' میں اقبالؔ نے رمزیت ایمائیت کا کمال دکھایا ہے یہ نظم اقبالؔ کے کلام میں نکتہ آفرینی کی بہترین مثال تصور کی جاسکتی ہے نیز مکالماتی انداز نے موضوع کو چار چاند لگا دیے ہیں۔

تھا جنہیں ذوقِ تماشا وہ تو رخصت ہو چکے
لے کے اب تو وعدۂ دیدارِ عام آیا تو کیا
انجمن سے وہ پرانے شعلہ آشام اُٹھ گئے
ساقیا محفل میں تو آتش بجام آیا تو کیا
آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبحِ دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا
پھول بے پروا ہیں تو گرمِ نوا ہو یا نہ ہو
کارواں بے حس ہے آوازِ درا ہو یا نہ ہو ۷۶

یہی مکالماتی انداز نظم ''خضر راہ'' میں بھی برقرار رہتا ہے۔ شاعر دل میں ایک جہانِ اضطراب سمیٹے ''شہید جستجو'' نظر آتا ہے اور خضرؑ کی رہنمائی میں اپنی الجھنیں سلجھانا چاہتا ہے۔ یہاں استفہامیہ انداز بھی ہے۔ معاشی، معاشرتی اور سیاسی مسائل کی طرف لطیف اشارے بھی اور تلمیحات کی معنی خیز وضاحت بھی۔

اے تری چشمِ جہاں بیں پر وہ طوفاں آشکار
جن کے ہنگامے ابھی دریا میں سوتے ہیں خموش
''کشتیِ مسکیں'' و ''جانِ پاک'' و ''دیوارِ یتیم''
علمِ موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش
زندگی کا راز کیا ہے سلطنت کیا چیز ہے؟
اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش؟
ہو رہا ہے ایشیا کا خرقۂ دیرینہ چاک
نوجواں اقوامِ نو دولت کے ہیں پیرایہ پوش
بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفیٰ
خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش
آگ ہے، اولادِ ابراہیم ہے، نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحان مقصود ہے ۷۷

ڈاکٹر عبدالمغنی کی رائے میں ''خضرِ راہ'' کے آخری حصے کو ''طلوعِ اسلام'' کی تمہید کہہ سکتے ہیں۔ خضرِ راہ کے مضامین اور انداز کی جھلک کو ''مسجد قرطبہ'' ''ساقی نامہ'' ''ذوق و شوق'' اور ''ضرب کلیم'' کی ''شعاعِ اُمید'' میں بھی محسوس کیا جاسکتا ہے مثلاً نظم ''طلوعِ اسلام'' میں کہتے ہیں۔

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں

ادھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے ۷۸

نظم ''مسجد قرطبہ'' اقبالؔ کی فنی بالیدگی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ نظم کا ایک ایک شعر زندگی کے حقائق پر سے پردہ اُٹھا رہا ہے۔ مناظرِ فطرت کے مشاہدے میں گم ایک شاعر آبِ روانِ کبیر کے کنارے بیٹھا آنے والے زمانے کا خواب دیکھ رہا ہے جو ابھی دنیا کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے اُسے آنے والے انقلاب کے قدموں کی چاپ صاف سنائی دے رہی ہے کیونکہ:

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی

روحِ اِمم کی حیات کش مکش انقلاب ۷۹

اقبالؔ اِس نظم کے توسط سے یہ پیغام دیتے ہیں کہ وہ نقش اور وہ نغمہ ہمیشہ باقی رہتا ہے جس کی پرورش میں خونِ جگر کی آمیزش ہو اور جیسے کسی مردِ خدا نے تعمیر کیا ہو۔

اول و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا

نقشِ کہن ہو کہ نو، منزلِ آخر فنا

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام

جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر

نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر ۸۰

''بالِ جبریل'' کی منظومات جن میں مسجد قرطبہ، ذوق و شوق، ساقی نامہ، پیر و مرید، لینن خدا کے حضور میں، فرشتوں کا گیت، روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے، جبریل و ابلیس اور لالۂ صحرا وغیرہ اقبالؔ کی فنی بصیرت کا شاہکار ہیں۔ یہاں ہر نظم کے پس پردہ مقدس آدرش کے ساتھ ساتھ ایک اچھوتا خیال، نادر تجربہ اور لطیف نکتہ کارفرما نظر آتا

ہے۔ انہی خصوصیات سے اُن کی غزلیں بھی متصف ہیں۔ اقبال نے شاعری کے آغاز ہی سے اپنی نکتہ آفرینی کا لوہا منوا لیا تھا جب اُنہیں اپنے اس شعر پر بے تحاشا داد وصول ہوئی تھی۔

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے ۸۱

اقبال کی غزلیات جداگانہ خصوصیات کی حامل ہیں۔ یہاں زلف ورخسار کا فرسودہ افسانہ نہیں دہرایا گیا بلکہ یہاں حفظِ خودی اور تعمیرِ حیات کا درس دیا گیا ہے یہاں تصوف کے رموز بھی ہیں اور عشق کے نکات بھی اور تسخیر کائنات کا پیام بھی۔ یہاں اقبال کی حکمیانہ فطرت شاعرانہ فطرت سے پوری طرح ہم آہنگ نظر آتی ہے یہاں اشعار میں ندرت بھی ہے اور لطافت بھی اور کہیں کہیں شوخی کا پہلو بھی نمایاں ہے درج ذیل امثال ملاحظہ کیجئے۔

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہوگا
حجاب تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا ۸۲

آیا ہے تو جہاں میں مثالِ شرار دیکھ
دم دے نہ جائے ہستی نائیدار دیکھ ۸۳

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو
یدِ بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں ۸۴

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں ۸۵

تو خاک کی مٹھی ہے، اجزاء کی حرارت سے
برہم ہو، پریشاں ہو، وسعت میں بیاباں ہو ۸۶

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی ۸۷

دگرگوں ہے جہاں تاروں کی گردش تیز ہے ساقی
دل ہر ذرہ میں غوغائے رستا خیز ہے ساقی ۸۸

وہ حرفِ راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں
خدا مجھے نفسِ جبرئیل دے تو کہوں ۸۹

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا ۹۰

دلِ بیدار فاروقی، دلِ بیدار کراری
مسِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری ۹۱

یہ پیام دے گئی ہے مجھے آہِ صبحگاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی ۹۲

غافل نہ ہو خودی سے کر اپنی پاسبانی
شاید کسی حرم کا تو بھی ہے آستانہ ۹۳

نہ تخت و تاج میں ، نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے ۹۴

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں ۹۵

اقبالؔ کی غزل میں ایک جہانِ معنی آباد نظر آتا ہے اُن کے تغزل میں رمز و کنایہ کے بہترین نمونے موجود ہیں۔ وہ نہ صرف نئے نئے مضامین اختراع کرتے ہیں بلکہ پرانے الفاظ سے نئے معنی پیدا کرنے میں بھی انہیں کمال حاصل ہے۔ الفاظ و معنی کی موزونیت کے ساتھ ساتھ طرزِ ادا کی ندرت اور شگفتگی نے سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔ درج ذیل غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر
عشق بھی ہو حجاب میں، حسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر
میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو
میں ہوں خذف تو تو مجھے گوہرِ شاہوار کر
باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر
روزِ حساب جب میرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر ۹۶

اقبالؔ نے اپنے کلام کو پُر خیال اور نکتہ آفرین بنانے کے لئے نت نئی تشبیہیں اور ترکیبیں وضع کیں جو اُن کی وسعت فکر اور حکیمانہ نظر کی غماز ہیں۔ ہمارا ادبی سرمایہ اقبالؔ سے پیشتر ان نادر تراکیب سے تہی تھا۔ مثلاً شراب زندگی،

حبابِ زندگی، مذاقِ رَم، کوشش ناتمام، ذوقِ آگہی، لذتِ امروز، طائرِ لاہوتی، لذتِ یکتائی، اشہبِ دوراں، تب وتاب جاودانہ، فروغِ دیدہ امکاں، لذت ایجاد وغیرہ، یہاں صرف چند امثال پر اکتفا کیا گیا ہے۔ اقبالؔ کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنی غزلوں میں ایک مربوط فلسفۂ حیات پیش کر کے اپنے مخصوص مقاصد اور مخصوص پیغام کا داعی اور ترجمان بنایا۔ بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی

''اقبالؔ نے اپنی غزلوں میں ہمیں یہ محسوس کرایا کہ عشق و محبت دل ہی کا ماجرا نہیں، ذہن کا بھی ہے۔ نئی غزل گوئی کا یہی سنگ بنیاد ہے۔ غالبؔ کے ہاں بھی دل و ذہن کا ماجرا ملتا ہے لیکن غالبؔ کو یہ سہولت حاصل تھی کہ انہوں نے اپنے آپ کو کسی مخصوص مقصد یا نقطہ نظر کا پابند نہیں رکھا تھا وہ جو چاہتے تھے کہہ سکتے تھے۔ اقبالؔ اپنے سامنے ایک مقصد رکھتے تھے جس سے وہ ہم کو آشنا کرانا چاہتے تھے'' ۹۷

غالبؔ اور اقبالؔ دونوں ہی نے ادراک وتخیل کے امتزاج سے حسن آفرینی اور نکتہ آفرینی کی نئی روایت کو جنم دیا ہے۔ اقبالؔ بھی تقلید سے نفور اور اجتہاد کے قائل تھے انہوں نے بھی مروجہ تلمیحات اور روایات میں نئے باب اور نئے نکات ایزاد کئے۔ لیکن غالبؔ کی طرح اپنی فوقیت کا اظہار نہیں کیا بلکہ اُسے عام انسانی عظمت سے وابستہ کر دیا ہے مثلاً ''فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں'' تو وہ خود انسانی عظمت کے ترانے گاتے ہوئے کہتے ہیں۔

عطا ہوئی ہے تجھے روز و شب کی بے تابی
خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ سیمابی
سنا ہے خاک سے تیری نمود ہے، لیکن
تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی!
تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر
کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی ۹۸

اقبالؔ کے یہاں انسانی عظمت کی انتہا تو یہ ہے کہ وہ اپنی ہمتِ مردانہ سے کام لے کر اپنی کمند میں یزداں کو بھی شکار کر سکتا ہے۔

در دشت جنونِ من جبرئیل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ ۹۹

اقبالؔ کے افکار و خیالات اور اسالیبِ بیان دونوں زندگی کے بدلتے ہوئے تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ اور اختراعات کا درجہ رکھتے ہیں۔ اقبالؔ کو اِس بات کو بخوبی احساس تھا کہ اُن کے کلام میں ایک نہ ایک نیا نکتہ اور نیا معنی پوشیدہ ہے کیونکہ انہوں نے اپنی نواؤں کی پرورش ''خونِ دل وجگر'' سے کی ہے۔ گرامی کو ایک خط میں تخلیق شعر کی بابت لکھتے ہیں۔

''شاعری کی جگر کاوی کا اندازہ عام لوگ نہیں لگا سکتے۔۔۔وہ اُس روحانی اور لطیف کرب سے آشنا نہیں ہوسکتے جس نے الفاظ کی ترتیب پیدا کی۔ جہاں اچھا شعر دیکھو، سمجھ لو کہ کوئی نہ کوئی مسیح مصلوب ہوا ہے۔ اچھے خیال کا پیدا کرنا اوروں کے لئے کفارہ ہوتا ہے'' ۱۰۰؎

علامہ اقبالؔ کے کلام میں چند ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جنہیں خود اُنہوں نے نکتہ قرار دیا ہے مثلاً مثنوی ''اسرارِ خودی'' میں غلام اور آزاد کا فرق بیان کرتے ہوئے نکتہ آفرینی سے کام لیا ہے فرماتے ہیں کہ غلام بے مقصد زندگی گزارتا ہے وہ لکیر کا فقیر اور مقلد ہے اور ہر وقت تقدیر کا شکوہ کرتا ہے جبکہ آزاد جدت واختراع کا دلدادہ ہوتا ہے وہ اپنی تقدیر کا خالق خود ہی ہوتا ہے۔ اشعار ملاحظہ کیجئے۔

نکتۂ می گویمت روشن چو دُر
تا شناسی امتیازِ عبد و حُر
عبد چوں طائر بدام صبح و شام
لذت پرواز بر جانش حرام
سینۂ آزادہ ء چابک نفس
طائر ایام را گردد قفس
عبد را تحصیلِ حاصل فطرت است
وارداتِ جانِ او بے ندرت است
دم بدم نو آفرینی کارِ حُر
نغمہ پیہم تازہ ریزد تارِ حُر
عبد را ایّام زنجیر است و بس

برلبِ او حرفِ تقدیر است و بس

ہمت حُر با قضا گردد مشیر

حادثات از دست او صورت پذیر ۱۰۱؎

الغرض اقبالؔ کی شاعری اول سے آخر تک نکتہ آفرینی اور باریک بینی کی روشن مثال ہے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری کی رائے میں

''اقبالؔ دنیا کے وہ منفرد شاعر ہیں جو فی الحقیقت ایک مفکر بھی ہیں اُنہوں نے فلسفے کو جس طرح شاعری کے تخیلِ رنگیں اور جذبہ گرم کے ساتھ پیوند کیا ہے اس کی صورت عالمی ادب میں صرف جرمن شاعر گوئٹے یا اقبالؔ کی عظیم پیشرو غالبؔ کے یہاں نظر آتی ہے'' ۱۰۲؎

درحقیقت غالبؔ اور اقبالؔ کی معنی آفرینی کے پس پردہ اُن کی ہمہ گیر شخصیت کارفرما ہے یہاں ڈاکٹر یوسف حسین خان کی یہ رائے قابل غور ہے کہ:

''غالبؔ اور اقبالؔ دونوں اُستاد اپنے پیرایہ بیان کی ندرت اور تازگی میں بے مثل ہیں۔ الفاظ اُن کے خیالات کو متعین نہیں کرتے بلکہ ان کی شخصیت کی تہوں سے اُن کے خیالات اُبھرتے ہیں جو الفاظ اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ شاعری لفظوں سے ہوتی ہے لیکن اگر کسی شاعر کی گرفت جلوہ معنی پر مضبوط نہ ہو تو وہ نیرنگ صورت سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ غالبؔ نے اِسے بھی تخلیقی فن میں شامل کیا ہے لیکن اُن کا حقیقی فن تو معنی آفرینی ہی کا جویا رہا۔ بلند معانی خود اپنے لئے لفظوں کا جامہ تلاش کر لیتے ہیں۔

نہیں گر سر و برگ ادراکِ معنی

تماشائے نیرنگ صورت سلامت

معنی آفرینی اور جلوہ صورت دونوں میں شاعر کا اُسلوب نمایاں رہتا ہے جو اُس کی شخصیت کا عکس ہوتا ہے۔۔۔ غالبؔ اور اقبالؔ دونوں میں یہ اندرونی توانائی نکھری ہوئی شکل میں نظر آتی ہے'' ۱۰۳؎

حوالہ جات

۱۔ غالبؔ، خطوطِ غالبؔ، مرتبہ غلام رسول مہر، صفحہ ۱۶۳

۲۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۳۲۲۔۳۲۳

۳۔ اقبالؔ، بالِ جبریل ، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۳۶۸

۴۔ اقبالؔ، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۵۹۵

۵۔ اقبالؔ، بانگِ درا، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۲۴

۶۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۲۸۳

۷۔ آل احمد سرور، ضالب کی عظمت از احوال ونقدِ غالبؔ، مرتبہ محمد حیات خان سیال، صفحہ ۱۱۶

۸۔ غالبؔ، خطوطِ غالبؔ مرتبہ غلام رسول مہر، صفحہ ۴۵۶

۹۔ نیاز فتح پوری، علامہ، غالبؔ۔۔۔فن اور شخصیت (کراچی: اُردو اکیڈمی ،اشاعت اوّل، ۱۹۸۷ء) صفحہ ۲۸۔۲۹

۱۰۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۲۶۲

۱۱۔ حالیؔ، یادگارِ غالبؔ، صفحہ ۱۳۵

۱۲۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۱۶

۱۳۔ ایضاً، صفحہ ۲۴

۱۴۔ ایضاً، صفحہ ۲۰۷

۱۵۔ ایضاً، صفحہ ۴۵

۱۶۔ ایضاً، صفحہ ۱۴۹

۱۷۔ ایضاً، صفحہ ۱۳۹

۱۸۔ ایضاً، صفحہ ۸۴

۱۹۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، غالبؔ۔شعور اور لاشعور کا شاعر (لاہور: فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ، س۔ن) صفحہ ۴۶

۲۰۔ احتشام حسین، پروفیسر، غالبؔ کی بت شکنی۔احوال ونقدِ غالبؔ مرتبہ محمد حیات خان سیال، صفحہ ۵۶۵

۲۱۔ ایضاً، صفحہ ۵۶۸

۲۲۔ غالبؔ، کلیاتِ غالبؔ فارسی، جلد سوم، صفحہ ۱۹۰

۲۳۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۳

۲۴۔ ایضاً، صفحہ ۱۹

۲۵۔ ایضاً، صفحہ ۱۳۵

۲۶۔ ایضاً، صفحہ ۷

۲۷۔ ایضاً، صفحہ ۴۷

۲۸۔ ایضاً، صفحہ ۲۰۲

۲۹۔ ایضاً، صفحہ ۷۶

۳۰۔ ایضاً، صفحہ ۲۸۲

۳۱۔ ایضاً، صفحہ ۲۴۹

۳۲۔ ایضاً، صفحہ ۲۷۹

۳۳۔ ایضاً، صفحہ ۲۸۶

۳۴۔ ایضاً، صفحہ ۸۰

۳۵۔ غالبؔ۔ کلیاتِ غالبؔ فارسی جلد سوم، صفحہ ۸۶

۳۶۔ غالبؔ۔ دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۱۴۷

۳۷۔ ایضاً، صفحہ ۴۲

۳۸۔ ایضاً، صفحہ ۱۳۴

۳۹۔ حالیؔ۔ یادگارِ غالبؔ، صفحہ ۱۳۱

۴۰۔ غالبؔ۔ دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۲۶۲

۴۱۔ ایضاً، صفحہ ۱۷۸

۴۲۔ حمید احمد خان، پروفیسر، غالبؔ کی شاعری میں حسن و عشق۔ احوال و نقدِ غالبؔ مرتبہ محمد حیال خان سیال، صفحہ ۵۸۱

۴۳۔ غالبؔ۔دیوانِ غالبؔ جدید،صفحہ ۱۳

۴۴۔ ایضاً،صفحہ ۸۱

۴۵۔ ایضاً،صفحہ ۱۵۰

۴۶۔ ایضاً،صفحہ ۲۴۷

۴۷۔ ایضاً،صفحہ ۱۳۸

۴۸۔ ایضاً،صفحہ ۱۴۰

۴۹۔ ایضاً،صفحہ ۳۱۷

۵۰۔ ایضاً،صفحہ ۱۶۱

۵۱۔ ایضاً،صفحہ ۱۱۰

۵۲۔ حالیؔ۔یادگارِ غالبؔ،صفحہ ۱۰۴

۵۳۔ عبادت بریلوی،ڈاکٹر،غالبؔ کے تغزل میں شوخی کا پہلو' از احوال ونقدِ غالبؔ،مرتبہ محمد حیات خان سیال، صفحہ ۳۱۰

۵۴۔ غالبؔ،دیوانِ غالبؔ جدید،صفحہ ۴۹

۵۵۔ ایضاً،صفحہ ۴

۵۶۔ ایضاً،صفحہ ۲۶۶

۵۷۔ ایضاً،صفحہ ۴۳

۵۸۔ ایضاً،صفحہ ۲۸۷

۵۹۔ اقبالؔ،بانگِ درا،کلیاتِ اقبالؔ اُردو،صفحہ ۲۴

۶۰۔ غالبؔ،دیوانِ غالبؔ جدید،صفحہ ۲۸۸

۶۱۔ اقبالؔ،بالِ جبریل،کلیاتِ اقبالؔ اُردو،صفحہ ۳۵۰

۶۲۔ اسلم انصاری،ڈاکٹر''اقبالؔ عہد آفرین'' اقبالیات کے سو سال مرتبہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی (اسلام آباد: اکادمی ادبیاتِ پاکستان ۲۰۰۲ء)صفحہ ۳۳۷

۶۳۔ اقبالؔ، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۵۹۳

۶۴۔ عابد علی عابد، سید، شعرِ اقبالؔ (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء) صفحہ ۲۹۲

۶۵۔ محمد ریاض، ڈاکٹر، برکاتِ اقبالؔ (لاہور: مقبول اکیڈمی ۱۹۸۸ء) صفحہ ۲۸۶

۶۶۔ اقبالؔ، بانگِ درا، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۲۳

۶۷۔ ایضاً، صفحہ ۴۱

۶۸۔ ایضاً، صفحہ ۵۱

۶۹۔ ایضاً، صفحہ ۵۳

۷۰۔ ایضاً، صفحہ ۸۶

۷۱۔ ایضاً، صفحہ ۱۵۲

۷۲۔ عبدالمغنی، ڈاکٹر، اقبالؔ کا نظامِ فن (لاہور: اقبالؔ اکیڈمی پاکستان، اشاعت دوم ۱۹۹۰ء) صفحہ ۲۳۷

۷۳۔ اقبالؔ، بانگِ درا، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۱۶۹

۷۴۔ ایضاً، صفحہ ۲۰۶۔۲۰۷

۷۵۔ یوسف حسین، ڈاکٹر، خان، روحِ اقبالؔ، صفحہ ۷۰

۷۶۔ اقبالؔ، بانگِ درا، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۱۸۶۔۱۸۷

۷۷۔ ایضاً، صفحہ ۲۵۶۔۲۵۷

۷۸۔ ایضاً، صفحہ ۲۷۳

۷۹۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۳۹۲

۸۰۔ ایضاً، صفحہ ۳۸۶

۸۱۔ نیرنگِ خیال، ۱۹۳۲ء، اقبالؔ نمبر (اضافہ کے ساتھ ادارۂ نقوش نے پیش کیا) شمارہ ستمبر ۱۹۷۷ء (لاہور: ادارۂ فروغِ اُردو) صفحہ ۲۰

۸۲۔ اقبالؔ، بانگِ درا، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۱۴۰

۸۳۔ ایضاً، صفحہ ۹۸

۸۴۔ ایضاً،صفحہ۱۰۴

۸۵۔ ایضاً،صفحہ۲۸۱

۸۶۔ ایضاً،صفحہ۲۸۱

۸۷۔ اقبالؔ،بالِ جبریل کلیاتِ اقبالؔ اُردو،صفحہ۳۰۶

۸۸۔ ایضاً،صفحہ۳۰۳

۸۹۔ ایضاً،صفحہ۳۱۹

۹۰۔ ایضاً،صفحہ۲۹۸

۹۱۔ ایضاً،صفحہ۳۲۹

۹۲۔ ایضاً،صفحہ۳۳۷

۹۳۔ ایضاً،صفحہ۳۴۶

۹۴۔ ایضاً،صفحہ۳۶۰

۹۵۔ ایضاً،صفحہ۳۵۳

۹۶۔ ایضاً،صفحہ۲۹۹

۹۷۔ رشید احمد صدیقی، پروفیسر، اقبالؔ شخصیت اور شاعری (لاہور: اقبالؔ اکیڈمی پاکستان، اشاعت اول ۱۹۷۶ء) صفحہ۱۱۶

۹۸۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ۴۲۳

۹۹۔ اقبالؔ، پیامِ مشرق، کلیاتِ اقبالؔ فارسی، صفحہ۳۳۶

۱۰۰۔ رسالہ ماہِ نو، اقبالؔ نمبر، شمارہ ستمبر ۱۹۷۷ء، صفحہ۲۷۲

۱۰۱۔ اقبالؔ، اسرارِ خودی، کلیاتِ اقبالؔ فارسی، صفحہ۷۳۔۷۲

۱۰۲۔ اسلم انصاری، ڈاکٹر، اقبالؔ عہد آفریں از اقبالیات کے سوسال، مرتبہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، اکادمی ادبیات پاکستان ۲۰۰۲ء، صفحہ۳۳۷

۱۰۳۔ یوسف حسین، ڈاکٹر، خان، متحرک جمالیات، صفحہ۶۹۔۶۸

باب چہارم

غالبؔ اور اقبالؔ کے فکری اختلافات

غالبؔ اور اقبالؔ کے فکری اختلافات

غالبؔ اور اقبالؔ اپنے شعور وفکر کے اعتبار سے اُردو ادب کی منفرد اور ممتاز شخصیات ہیں۔ دونوں شعراء کے افکار میں ندرت، خیالات میں تنوّع اور اندازِ بیان میں جدّت پائی جاتی ہے۔ غالبؔ اور اقبالؔ کی ذہنی اور فکری مشابہتوں کے بہت سے پہلو باہم یکساں دکھائی دیتے ہیں۔ اقبالؔ غالبؔ سے گہری عقیدت رکھتے تھے ان کا غالبؔ سے جو ذہنی تعلق اور فکری رشتہ استوار ہوا وہ ان کی شاعری کے اولین دور سے شروع ہوتا ہوا پایانِ عمر تک برقرار رہا۔ شاید اسی تعلقِ خاطر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اقبالؔ کے ہمدمِ دیرینہ سر شیخ عبدالقادر نے ''بانگِ درا'' کے دیباچہ میں یہ تاریخی رائے دی کہ:

''غالبؔ اور اقبالؔ میں بہت سی باتیں مشترک ہیں اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسد اللہ خان غالبؔ کو اردو اور فارسی کی شاعری سے جو عشق تھا، اس نے ان کی روح کو عدم میں جا کر بھی چین نہ لینے دیا اور مجبور کیا کہ وہ پھر کسی جسدِ خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے اور اس نے پنجاب کے ایک گوشے میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبالؔ نام پایا۔۔۔''[1]

سر شیخ عبدالقادر کی مذکورہ رائے سے مکمل اتفاق ممکن نہیں کیونکہ دونوں عظیم شعراء کے مابین تصورات وخیالات کی یکجائی کے باوجود نمایاں تفاوت بھی دیکھنے کو ملتا ہے اور کہیں کہیں یہ فاصلے اس قدر بڑھ جاتے ہیں کہ دونوں شعراء کو ایک دوسرے کے روبرو لاکر موازنہ کرنا ممکن نظر نہیں آتا۔ اس لئے یہ خیال کہ ''اقبالؔ کی شاعری میں صرف غالبؔ ہی کی روح کارفرما ہے'' درست نظر نہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس التباس کو رفع کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ سمجھنا کہ اقبالؔ کی شاعری میں غالبؔ کی روح کام کر رہی ہے یا یہ کہ اقبالؔ کی صورت میں غالبؔ نے دوبارہ جنم لیا ہے کسی طور بھی درست نہیں۔ اقبالؔ کو غالبؔ کی ارتقائی روح سمجھنا غالبؔ سے خوش عقیدتی کی بنا پر ہو تو ہو، واقعات سے ایسا ثابت کرنا مشکل ہے۔۔۔۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جس طرح اقبالؔ نے دوسرے حکماء سے استفادہ کیا ہے وہاں خود اُردو کے ایک شاعر سے بھی بہت کچھ لیا ہے۔''[2]

بلاشبہ غالبؔ اور اقبالؔ کے بعض تصورات میں یکسانیت کا رنگ نمایاں ہے لیکن اس اشتراک کے باوجود دونوں کی تخلیقی فعالیت اور شخصی کوائف میں قابلِ ذکر بُعد بھی دکھائی دیتا ہے کیونکہ دونوں شعراء کی شخصیات اور ماحول میں بڑا اختلاف ہے اور یہی اختلاف دونوں کے طرزِ فکر میں فرق کی وجہ بھی ہے۔

عصری رجحانات شعر و ادب کی دنیا پر گہرے تاثرات مرتب کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ مختلف زمانوں میں شاعری کے موضوعات بھی مختلف رہے ہیں۔ کبھی محض حسن و عشق کی محفل جمتی ہے تو کبھی تصوف اپنا رنگ جماتا ہے کبھی فلسفہ و نفسیات کو اہمیت دی جانے لگتی ہے تو کبھی سیاسی اور سماجی موضوعات کو پذیرائی ملتی ہے۔ غالبؔ اور اقبالؔ دونوں مختلف زمانوں اور مختلف ادبی و شعری روایات کے پروردہ ہیں۔ غالبؔ انیسویں صدی کے شاعر ہیں اور اقبالؔ بیسویں صدی کے۔ غالبؔ کے زمانے میں سیاسی شعور نے عملی طور پر ذہنوں میں جگہ نہیں بنائی تھی جب کہ اقبالؔ کا زمانہ اجتماعی شعور، قومی بیداری اور سیاسی آزادی کا زمانہ تھا اسی لئے دونوں شعراء کے شعری رویے اور تخلیقی اہداف جُدا جدا نظر آتے ہیں۔ اقبالؔ بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں جب کہ غالبؔ کی طبیعت کا جوہر ان کی غزلوں میں کھلتا ہے شیخ محمد اکرام غالبؔ اور اقبالؔ کے فنی و فکری سفر کے فرق کا احاطہ کرتے ہوئے ''حکیمِ فرزانہ'' میں رقم طراز ہیں:

> ''غالبؔ اور اقبالؔ دونوں مختلف ادبی فضاؤں میں پلے اور دونوں نے مختلف ادبی روایات کا تتبع کیا۔ غالبؔ کے پیشِ نظر شاعرانہ اظہار کے ذرائع بہت محدود اور ناقص تھے یعنی غزل اور قصیدہ یا زیادہ سے زیادہ مثنوی اور رباعی۔ شاعرانہ مضامین کا میدان اس سے بھی تنگ تھا۔ قدیم زمانے سے شعراء ایک تنگ دائرے میں شعر گوئی کرتے آئے تھے، جس سے باہر نکلنا گویا کفر تھا۔ اگر کوئی جدت پسند عام روش سے ہٹنا چاہتا تو نہ اس کے سامنے کوئی صحیح نمونہ تھا نہ شاعرانہ خوبیاں پرکھنے کے لئے کوئی صحیح معیار۔ نتیجہ یہ کہ مروجہ اسلوبِ شاعری ترک کرنے سے بجائے فائدے کے نقصان ہوتا۔۔۔۔'' [۳]

اس ادبی فضا میں رہتے ہوئے غالبؔ نے زیادہ تر غزلیں اور قصائد لکھے۔ غالبؔ کے مقابلے میں اقبالؔ کو مشرق و مغرب کی بہترین درسگاہوں میں حصولِ علم کے مواقع میسر آئے السنہ شرقیہ کے علاوہ مغربی ادب بالخصوص انگریزی اور جرمن زبان کے شعراء کے بہترین کلام سے فیض یاب ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ نئے خیالات اور نئے اصنافِ شاعری پر طبع آزمائی کے بہتر مواقع حاصل ہوئے یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں مشرق و مغرب کی بہترین خصوصیات یکجا دکھائی دیتی ہیں۔ مضامین اور خیالات میں بے حد تنوع ہے۔

غالبؔ اور اقبالؔ کے طرزِ فکر میں جو بنیادی فرق ہے اس کی وجوہات دونوں شعراء کے ابتدائی حالات اور تعلیم و تربیت کے تقابلی جائزے سے بخوبی سمجھی جاسکتی ہیں۔

اقبالؔ اس اعتبار سے بڑے خوش قسمت تھے کہ اوائل عمری ہی سے انہیں علمی، ادبی اور مذہبی ماحول میسر آیا اور ان کی تعلیم وتربیت ایسے والدین کی زیرِ نگرانی ہوئی جو نیک طینت اور پاکیزہ فطرت کے مالک تھے۔ ان کے والد شیخ نور محمد ایک سچے عاشقِ رسول، پرہیز گار اور متقی انسان تھے جب کہ والدہ محترمہ بھی شب بیدار اور عبادت گزار خاتون تھیں۔ اقبالؔ کی تربیت انہی خدارسیدہ والدین کے زیرِ سایہ ہوئی جس کی بدولت اقبالؔ کے اندر بھی ایک عاشقِ رسولؐ اور مردِ مومن کی اعلیٰ صفات خود بخود پیدا ہوتی چلی گئیں۔ اقبالؔ والد کی صحبت سے فیض یاب ہونا خود بھی باعثِ افتخار سمجھتے تھے چنانچہ اکبرالہٰ آبادی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''واقعی آپ نے سچ فرمایا کہ ہزار کتب خانہ ایک طرف اور باپ کی نگاہِ شفقت ایک طرف۔ اسی واسطے تو جب کبھی موقع ملتا ہے، ان کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں اور پہاڑ پر جانے کی بجائے ان کی گرمیِ محبت سے مستفید ہوتا ہوں'' ۔[۴]

اقبالؔ اپنی تعلیم وتربیت میں والدہ محترمہ کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے نظم ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' یہ فرماتے ہیں۔

تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا
دفترِ ہستی میں تھی زرّیں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات [۵]

آپ کی اقبال مندی یہ تھی کہ تعلیمی سفر کی ہر منزل پر آپ کو ایسے اساتذہ بھی میسر آئے جنہوں نے آپ کی فطری صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ ابتدائی تعلیم کا آغاز ہوتے ہی آپ کو سید میر حسن جیسا استاد میسر آ گیا جنہوں نے آپ کو اسلامی علوم اور تصوف وعرفان کے علاوہ علومِ قدیمہ وجدیدہ سے بہرہ ور کیا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مولوی میر حسن نے اقبالؔ کو صحیح معنوں میں اقبالؔ بنایا۔ اپنے استادِ محترم کے علمی فیضان کا خود اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

وہ شمع بار گہہ خاندانِ مرتضوی
رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجکو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجکو [۶]

اقبالؔ لاہور آئے تو ان کو پروفیسر آرنلڈ جیسا محقق استاد ملا جنھوں نے اقبالؔ کی ذہنی وفکری تربیت میں اہم کردار ادا کیا۔ پروفیسر آرنلڈ ہی نے اقبالؔ کے ذوقِ سلیم اور فکر وفلسفہ کے رجحان کو جلا بخشی، پروفیسر آرنلڈ اقبالؔ جیسے ذہین شاگرد کا استاد ہونے میں خود بھی فخر محسوس کرتے تھے اور اقبالؔ کو اپنے استاد سے جو محبت اور عقیدت تھی اس کا اندازہ پروفیسر آرنلڈ کے وطن واپس چلے جانے پر لکھی جانے والی نظم ''نالۂ فراق'' کے ایک ایک حرف سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

اب کہاں وہ شوقِ رہ پیمائیِ صحرائے علم؟
تیرے دم سے تھا ہمارے سر میں بھی سودائے علم ؎

انگلستان میں براؤن اور نکلسن کی رفاقت نصیب ہوئی نیز میک ٹیگرٹ کے لیکچروں سے انہیں فلسفیانہ خیالات کو سائنسی انداز میں پرکھنے کا سلیقہ پیدا ہوا۔ اور براؤن اور نکلسن کی دوستی سے فارسی زبان وادب کے علم میں پختگی پیدا ہوئی۔ جرمنی گئے تو وہاں دو جرمن پروفیسروں ایما ویگے ناسٹ اور سینیے شال سے جرمن زبان وادب کے رموز سیکھے۔ بیرسٹری کا امتحان پاس کرنا ''فلسفۂ عجم'' میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرنا اس بات کا ثبوت ہیں کہ انہیں ابتداء ہی سے ایک آسودہ ماحول ملا جس کی بدولت اعلیٰ تعلیم کی بلند ترین منزلوں تک پہنچنا ان کے لئے مشکل نہ رہا۔ مذہبی گھر کے مذہبی ماحول کے طفیل ان کے اندر مذہب سے وابستگی اور دینی مسائل سے دلچسپی اس حد تک پروان چڑھی کہ وہ ایک عظیم اسلامی مفکرّ اور فقہ واجتہادی مسائل کے ماہر بن کر ابھرے ان کی شاعری بھی قرآنی تعلیمات، سنتِ نبویؐ اور ان کے صوفیانہ اور قلندرانہ عقائد کے مطابق سانچے میں ڈھلتی نظر آتی ہے۔

اب ذرا غالبؔ کی ابتدائی زندگی اور تعلیم وتربیت کی داستان سنیے جو اقبالؔ کے حالاتِ زندگی کے برعکس مجبوری ولاچاری، بے بسی وبے چارگی کا ایک دلگداز مُرقع ہے۔ آغاز ہی سے غالبؔ کو اقبالؔ جیسا آسودہ گھریلو ماحول اور خوشگوار وخوش حال زندگی نصیب نہ ہوسکی جس میں والدین کی شفقت اور پیار شاملِ حال ہوتا یا کسی کو ان کی تعلیم وتربیت کی فکر دامنگیر ہوتی۔ بمشکل پانچ سال کے تھے کہ سایۂ پدری سر سے اُٹھ گیا۔ باپ کی وفات کے بعد چچا نے پرورش کی ذمہ داری اُٹھائی لیکن نو برس کی عمر تھی کہ یہ سہارا بھی ہمیشہ کے لئے چھوٹ گیا۔ پھر نانا کی آغوشِ امارت میں پناہ ڈھونڈی جہاں غالبؔ کا بچپن لااُبالی انداز میں بسر ہوا شطرنج اور چوسر کی بازیاں، پتنگ بازی کا شغل، بےفکرے دوستوں کی صحبت میں شراب نوشی کی ایسی لت پڑی جس نے مرتے دم تک پیچھا نہ چھوڑا۔ تربیت سے محرومی ہی کا نتیجہ تھا کہ غالبؔ

''مسجد کے زیرِ سایہ'' رہنے اور ''ثواب طاعت وزہد'' جاننے کے باوجود نماز روزے کی طرف راغب نہ ہو سکے۔

خاندانی ماحول اور تربیت سے محرومی سے صرفِ نظر کیجیے تو اقبالؔ کے برعکس غالبؔ کی رسمی تعلیم کا بھی کوئی اہتمام نہ ہو سکا۔ اقبالؔ کو قدم قدم پر اچھے اساتذہ میسر آئے تھے لیکن غالبؔ کو تمام زندگی کسی ایک استاد کی صحبت بھی نصیب نہ ہو سکی جو ان کی خفتہ صلاحیتوں کو بیدار کر سکتا یا مس خام کو کیمیا بنا ڈالتا۔ اس سلسلہ میں مولانا حالیؔ ''یادگارِ غالبؔ'' میں رقم طراز ہیں:

''۔۔۔۔۔ مرزا کی زبان سے یہ بھی سنا گیا کہ مجھ کو مبداء فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں۔ عبدالصمد محض ایک فرضی نام ہے کیونکہ لوگ مجھے بے استاد کہتے تھے ان کا منہ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی استاد گھڑ لیا ہے۔''[۸]

غالبؔ کی تمام زندگی غمِ دوراں و غمِ جاناں اور مسلسل کشمکش کی ایک طویل داستان ہے جس پر قدرت نے اپنا ہر ستم خوب خوب آزمایا۔ تیرہ برس کی عمر ہی میں ازدواجی زندگی کی ذمہ داریوں میں جکڑ دیے گئے ان کی تمام جوانی فکرِ معاش، آمدنی کا فقدان، مصارف کی زیادتی، خانگی مسائل، اولاد زندہ نہ رہنے کا غم، محبوبہ کی موت، بھائی کی دیوانگی اور قتل، زمانے کی قدر ناشناسی، برہان قاطع کے ادبی معرکہ میں بے عزتی کا جان لیوا احساس، قمار بازی کے مقدمے میں سزا، جواں سال عارف کی مرگ، پنشن کی بندش، در در کی ٹھوکریں ان کا مقدر بنی رہیں۔ اور پھر ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی صورت میں مصائب کا ایک اور آسمان ان کے سر پر ٹوٹ پڑا۔ غالبؔ کے اعزہ واقربا اور دیگر احباب پر مقدمات کا طویل سلسلہ، سزائیں، پھانسیاں، جائیداد کی ضبطی، قرض خواہوں کے تقاضے وغیرہ یہ سب وہ حالات و واقعات ہیں جن میں گھر کر غالبؔ کی شخصیت کی تشکیل ہوئی۔

بچپن کی محرومی اور جوانی کی سوگواری کے بعد بڑھاپا بیماریوں اور تکلیفوں کا ایک ایسا انبوہ سمیٹ کر لایا جس نے غالبؔ کو وقت سے پہلے ہی زندہ درگور کر دیا حالات کی ناسازگاریوں ہی کا نتیجہ ہے کہ ان کی شاعری کا محور خود ان کی اپنی ذات ہی بنی رہی اور انہیں ''فکرِ دنیا میں سر کھپانے'' کی فرصت ہی نہ ملی زندگی کے نشیب و فراز ہی کی بدولت غالبؔ کے ہاں اقبالؔ کی طرح کوئی واضح اور مربوط فکری ارتقاء کے نشانات دکھائی نہیں دیتے بلکہ حالات کی سنگینی نے ان کی شخصیت کو پہلو دار بلکہ مجموعۂ اضداد بنا ڈالا۔ ڈاکٹر وزیر آغا غالبؔ کی شخصیت کے اس رخ کا جائزہ لیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''غالبؔ کی شخصیت ایک مجموعۂ اضداد ہے یہ شخصیت ضبط اور برہمی، غم اور مسرت، لگاؤ اور بے

نیازی، محبت اور نفرت، خوشامد اور خودداری۔۔۔ان سب کیفیات اور رجحانات کی آئینہ دار ہے اس میں کونپل کی سی لچک، چٹان کی سی سختی اور پارے کی سی بے قراری ہے اور یہ تمام باتیں مختلف بلکہ متضاد کیفیات کی غماز ہیں۔۔۔۔غالبؔ ایک محشرِ خیال، ایک مجموعہ اضداد ہے اس کے لبوں پر ہنسی لیکن دل میں طوفانِ غم ہے اس کی زبان پر خوشامد ہے لیکن اس کا تصور عرش پر ہے۔ اسے مظاہر سے ایک شدید لگاؤ ہے لیکن بے نیازی اس کا مسلک ہے وہ زندگی کو ایک متاعِ گراں بہا سمجھتا ہے لیکن موت اس کی عزیز ترین منزل ہے''۔ 9

ناسازگاریٔ حالات کے باعث غالبؔ کی شخصیت میں جو خلا رہ گیا اس کا احساس خود ان کو بھی تھا ایک خط میں لکھتے ہیں۔

''قلندری، آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیے تھے بقدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے۔'' 10

بااین ہمہ غالبؔ کی شاعری اردو ادب کی تاریخ میں ایک چونکا دینے والی آواز ہے۔ وہ ایک ذہین اور رنگارنگ شخصیت کے مالک تھے اور مزاج حکیمانہ تھا اسی لئے ان کی شاعری بھی بہت وسیع، گہرے، متضاد اور متنوع تجربات کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس پر ان کی اپنی شخصیت کی ناقابلِ تردید چھاپ ہے۔ باوجود فارسی شعراء کی بصیرت سے استفادہ کرنے کے انہوں نے کسی کو بھی اپنے اوپر غالبؔ نہیں ہونے دیا۔ ان کے کلام کی بوقلمونی اور پہلوداری ہر کسی کا دامنِ دل اپنی طرف کھینچتی ہے اور ان کی یہ پیشن گوئی کہ:

کوکبم را، در عدم اوجِ قبولی بودہ است
شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن 11

حرف بحرف درست ثابت ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبالؔ نے بھی اردو ادبیات کی روایت سے فیض یاب ہونے کے لئے غالبؔ ہی کا انتخاب کیا کیونکہ اقبالؔ نے اپنی غیر معمولی ذہانت اور صحت مند تنقیدی شعور کی بنا پر غالبؔ کے کلام کی فکری بنیادوں کو سمجھ لیا تھا۔ بقول خلیل الرحمٰن اعظمی:

''اقبالؔ جو بات کہنی چاہتے تھے وہ ولیؔ، قائمؔ، میرؔ، مومنؔ یا خود ان کے استاد داغؔ کی زبان میں ادا نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے لامحالہ غالبؔ کے طرزِ گفتار سے انہوں نے فائدہ اٹھایا لیکن ان کی شخصیت اور ان کا

وجدان غالبؔ سے بالکل منفرد ہے اس لئے موضوعات کے سلسلے میں انہوں نے ایک نئی سمت میں سفر کیا۔"۱۲

غالبؔ اور اقبالؔ کے مابین اختلافِ طبائع اور اختلافِ مقاصد کے علاوہ مخصوص تصورات کے حوالے سے بھی نمایاں تضادات اور اختلافات ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں۔ ان تصورات کا مختصر جائزہ درج ذیل ہے۔

شاعر فلسفی اور فلسفی شاعر:

غالبؔ اور اقبالؔ دونوں نے اپنی شعری کائنات کی بنیاد فکر و فلسفہ پر رکھی لیکن غالبؔ کے تفکر اور اقبالؔ کی فکر میں نمایاں تفاوت موجود ہے۔

اقبالؔ کے برعکس غالبؔ کی شاعری کا موضوع ان کے شدید قسم کے ذاتی تاثرات ہیں لیکن ان کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ جذبات کی بوقلمونی، بیان کی ندرت اور تجربات کی پیچیدگی اور تنوع میں بھی تعقل کا عنصر دیگر تمام عناصر پر حاوی نظر آتا ہے۔ غالبؔ کا اندازِ نظر آفاقی ہے وہ اپنے گردوپیش کو اپنی ذات میں جذب کر کے جب حالات کا معروضی جائزہ لیتے ہیں تو صیغہ واحد متکلم کے باوجود ان کی آواز ایک پورے دور کی آواز بن جاتی ہے۔ درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجئے۔

یا رب! زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں ۱۳

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے ۱۴

خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو ۱۵

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا [16]

ہیں زوال آمادہ اجزاء آفرینش کے تمام
مہر گردوں ہے چراغِ راہگزر بادِ یاں [17]

میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا، ہے خونِ گرم دہقاں کا [18]

پروفیسر اسلوب احمد انصاری غالبؔ اور اقبالؔ کی شاعری کے فکری اختلاف پر رائے زنی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''اقبالؔ اور غالبؔ میں ایک اساسی فرق ہے۔ اقبالؔ نے اپنی شعری کائنات کو اس مرکزی اور مربوط نظامِ فکر سے سجایا ہے جسے انہوں نے مختلف سرچشموں سے فیضان حاصل کر کے مرتب کیا ہے وہ سر چشمے یہ ہیں۔ قرآن کریم، فارسی شعراء، اسلامی اور مغربی مفکرین، جدید علوم اور سائنس جب کہ غالبؔ کے لئے کوئی نظامِ فکر یا زندگی کی کوئی تفسیر مکمل اور بصیرت افروز تجربہ نہیں بن سکی۔ اس لئے ان کی شاعری ان مجردات کا قطعی بیان ہے جو انہوں نے اپنے تجربے سے اخذ کئے ہیں۔'' [19]

پروفیسر اسلوب احمد انصاری کے خیال میں ہم غالبؔ کو فلسفیانہ یا مابعد الطبیعاتی شاعر ان معنوں میں تو ہرگز نہیں کہہ سکتے جن معنوں میں یہ اصطلاح ہم دانتے اور اقبالؔ کے لئے استعمال کر سکتے ہیں کیونکہ غالبؔ نے کسی منظّم یا منضبط فلسفیانہ نظام کو ہمارے سامنے پیش نہیں کیا تاہم ان کا ذہن متجسس اور خلاّق تھا جو ہمہ وقت کائنات اور انسانی زندگی کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔ لہٰذا غالبؔ کے یہاں فلسفیانہ نظام نہیں بلکہ فلسفیانہ طریقِ فکر اور اندازِ بیان ملتا ہے۔ ان کے اکثر اشعار کی معنویت اور فنی لطافت ذہنِ انسانی کو دعوتِ فکر دیتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ غالبؔ کے یہاں فلسفیانہ خیالات کی بہت سی تہیں ملتی ہیں جو انہوں نے طوسی، بوعلی سینا، غزالی، عراقی، جامی اور رومی وغیرہ سے حاصل کئے تھے۔ شاید اسی لئے وہ اقبالؔ سے بہت پہلے جامہ حرف کی تنگی کا گلہ کرتے نظر آتے ہیں ان کی شاعری میں ایک ذہنی بیداری اور چوکنا پن محسوس ہوتا ہے۔ اردو ادبیات کی تاریخ میں انہوں نے اوّل اوّل شاعری کی فکری سطح کو

بلند اور نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔[20]

درج ذیل اشعار غالبؔ کے حکیمانہ مزاج کی ترجمانی بخوبی کرتے ہیں:

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں [21]

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا [22]

فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر [23]

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالبؔ
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا [24]

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز [25]

غالبؔ کے برعکس اقبالؔ مصلح ہیں اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ وہ فلسفی ہیں۔ انہوں نے اپنے مخاطب یا قاری کو زندگی کا ایک مربوط، منظّم اور عملی فلسفہ دیا۔ ان کے فلسفۂ حیات کی بنیاد خودی کا تصور بنا۔ اقبالؔ نے اپنی فکر کو شعر کے سانچے میں ڈھال کر پیش کیا اسی وصفِ خاص کی بنا پر ان کی شاعری فلسفیانہ اور حکیمانہ ہے۔ انہوں نے شاعری کو حکمت کا درجہ دیا کیونکہ وہ ایک دانشور تھے اور دانشور ایک عام انسان کے مقابلے میں زیادہ مرتب اور منظّم ذہن رکھتا ہے۔ دانشور کا رشتہ روایت سے ضرور ہوتا ہے مگر دانشوری تجربے اور تخلیق میں ظاہر ہوتی ہے۔ پروفیسر آل احمد سرورؔ دانشوری کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''دانشوری اپنے گرد وپیش کے حالات سے مطمئن نہیں ہوتی۔۔۔۔دانشوری دیدۂ بینا رکھتی ہے اور اپنا نورِ بصیرت عام کرنا چاہتی ہے۔دانشوری ان حقائق سے آنکھیں چار کرنا ہی نہیں سکھاتی جو عام نظروں میں نہیں ہیں، وہ حقائق کو بدلنا بھی چاہتی ہے۔۔۔۔دانشور انقلاب نہیں لاتا، وہ انقلاب کے لئے فضا ہموار کرتا ہے۔۔۔'' ۲۶

بلاشبہ اقبال ایک بہت بڑے دانشور تھے ایک بہت بڑے مقصد اور آدرش کے مبلغ تھے انہوں نے شعر و ادب کو انسان کی فلاح، معاشرے کی تزئین اور ملّت کی بیداری جیسے عظیم مقاصد کے حصول کا ذریعۂ بنایا۔انہوں نے اپنی شاعری سے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی ان کا یہ مقصد بہت بلند تھا کہ وہ شاعری کو محض جذبات و احساسات کے اظہار کا ذریعۂ تصور نہیں کرتے تھے بلکہ دلوں کو ''ولولۂ تازہ'' دینے ،انسان کو نیابتِ الٰہی کا اہل بنانے اور ایک مثالی معاشرے کے قیام کے خواب کو تعبیر آشنا کرنے کا وسیلہ گردانتے تھے۔جب کہ غالبؔ کے پیشِ نظر اس قسم کا کوئی عظیم مقصد نہیں تھا۔

تصورِ فن:

فنِ شاعری کے متعلق دونوں عظیم شعراء کا بنیادی نقطۂ نظر ہی مختلف تھا اگرچہ غالبؔ کے نزدیک بھی شاعری محض دلگی یا قافیہ پیمائی نہیں تھی بلکہ وہ اسے حقیقت سے پردہ اُٹھانے کا ذریعۂ سمجھتے تھے اور جانتے تھے کہ یہ بھی ایک اہم اور قابلِ قدر کام ہے لیکن انہوں نے شاعری کو صرف اپنے احساسات و جذبات کا ترجمان بنایا۔جب کہ اقبال نے شاعری کو اپنے بلند تر مقاصد کے حصول کا ذریعہ ٹھہرایا۔اقبال کے نزدیک فن وہی ہے جو زندگی بخش اور زندگی کا ترجمان ہو شاعری اسی کو کہتے ہیں جو مردہ و افسردہ جذبات میں زندگی کی نئی روح پھونک دے اور انہیں بلند نصب العین کے حصول کی خاطر جینا اور مرنا سکھا دے۔اقبال کے نزدیک صرف شاعری ہی نہیں بلکہ ہر فن کا مقصد زندگی کے حسن کو نکھارنا اور فرد اور معاشرے کو پستی سے بلندی کی طرف لے جانا ہے۔اُسے حیاتِ ابدی کا سوز بخشنا، انقلاب کی لذت سے آشنا کرنا اور ایک نئے دور کی جستجو میں سرگرمِ عمل اور متحرک رکھنا ہے۔ان کے نزدیک

وہ شعر کہ پیغام حیاتِ ابدی ہے
یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگِ سرافیل ۲۷

شاعری برائے شاعری یا ادب برائے ادب اقبال کا مقصود نہ تھا۔وہ نہیں چاہتے تھے کہ لوگ انہیں محض بحیثیت

شاعر پہچانیں۔ سید سلیمان ندوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کبھی میرا مطمحِ نظر نہیں رہا کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لئے وقت نہیں۔ مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس۔ اس بات کو مدِ نظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں۔ اس واسطے کہ فن غایت درجہ کی جانکاہی چاہتا ہے اور یہ بات موجودہ حالات میں میرے لئے ممکن ہی نہیں ہے'' ۲۸

اس میں شک نہیں کہ اقبال کا کلام فکری نادرہ کاریوں کا ایک بیش بہا خزانہ ہے لیکن فلسفیانہ افکار کی سنجیدگی اور گرانباری کے باوجود انداز انتہائی دلکش اور مترنم ہے لیکن اقبال کو خدائے سخن ہونے کا دعویٰ نہیں ان کے نزدیک شاعری ''پیش خیزانِ حیات'' کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو شاعر کہلانے سے ''پیام بر'' کہلانا زیادہ پسند کرتے ہیں فنِ شاعری کے بارے میں خود ان کا خیال یہ ہے کہ:

علم و فن از پیش خیزانِ حیات
علم و فن از خانہ زادانِ حیات ۲۹

خوش آ گئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے؟ شاعری کیا ہے؟ ۳۰

نغمہ کُجا و من کُجا، سازِ سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم، ناقۂ بے زمام را ۳۱

اسی لئے فرماتے ہیں کہ:

او حدیثِ دلبری خواہد زمن
آب و رنگِ شاعری خواہد زمن

کم نظر بے تابی جانم ندید
آشکارم دید و پنہانم ندید ۳۲ؔ

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ ۳۳ؔ

ڈاکٹر شیخ محمد اکرام شاعری کے متعلق غالبؔ اور اقبالؔ کے نقطۂ نگاہ کا جائزہ لیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

''غالبؔ کا شاعرانہ مطمح نظر بلند تھا لیکن اقبالؔ کا مطمح نظر ان کی نسبت بدرجہا بلند اور عام شاعروں کے نقطۂ نظر سے اصولاً مختلف تھا انہوں نے ''شمع و شاعر'' کی تصنیف کے بعد فنِ شاعری کو بطور فن کے نہیں بلکہ ''جزوِ از پیغمبری'' سمجھ کر اختیار کیا ہے۔'' ۳۴ؔ

کہہ گئے ہیں شاعری ''جزو یست از پیغمبری''
ہاں سنا دے محفلِ ملّت کو پیغامِ سروش
آنکھ کو بیدار کر دے وعدۂ دیدار سے
زندہ کر دے دل کو سوزِ جوہرِ گفتار سے ۳۵ؔ

اقبالؔ نے مخصوص مقاصد کے حصول کی خاطر شاعری کی۔ اس کے برعکس غالبؔ کی شاعری کو کسی ایک نظامِ فکر کا پابند نہیں سمجھا جا سکتا اقبالؔ ایک مذہبی فکر، معلّمِ اخلاق، قومی رہنما، مصلحِ قوم، ایک واضح آدرش کے مبلغ، ایک سیاست دان اور حرّیت پسند شاعر بن کر اُبھرے جب کہ غالبؔ صرف شاعر تھے نہ مصلح، نہ سیاست دان، نہ کسی مربوط نظامِ فکر کے داعی اور نہ معلمِ اخلاق، خالص ادب کے نقطۂ نگاہ سے غالبؔ کو اقبالؔ پر ترجیح دی جا سکتی ہے کیونکہ ان کی شاعری کا افق بہت وسیع ہے۔ ان کی شاعری کا موضوع انسانی احساسات و جذبات، رشتے اور رابطے ہیں۔ ڈاکٹر شیخ محمد اکرام ''حکیمِ فرزانہ'' میں اس فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''غالبؔ کی شاعری کا بیشتر حصہ محبت اور اس کی گونا گوں کیفیتوں کا بیان ہے۔۔۔۔ یہ صحیح ہے کہ وہ اپنے بہترین لمحوں میں ''جبریلِ امیں'' کے ساتھ ہم داستان ہو جاتا ہے اور اُس کا ذہنِ رسا اس سر زمین سے ناواقف نہیں جہاں شاعری اور فلسفہ اور مذہب کی سرحدیں مل جاتی ہیں لیکن وہ اس سر

زمین کی نسبت عام دنیا کے حالات سے زیادہ واقف ہے۔ اس کی شاعری میں بیشتر عام انسانی خواہشوں، امنگوں اور مایوسیوں کا ذکر ہے اور ان کی نسبت اس کی واقفیت اقبالؔ سے زیادہ گہری اور صحیح ہے۔"[۳۶]

درج ذیل اشعار میں غالبؔ کے تغزل کی شان ملاحظہ کیجئے۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا [۳۷]

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا [۳۸]

لوں وام بختِ خفتہ سے یک خوابِ خوش ولے
* غالبؔ یہ بیم ہے کہ کہاں سے ادا کروں [۳۹]

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا؟ [۴۰]

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ [۴۱]

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو [۴۲]

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیئے غیر سے تہی
سن کر ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یوں [۴۳]

* مروجہ دیوانوں میں اس غزل کا صرف مقطع ملتا ہے اور اس فرق کے ساتھ کہ تخلص اسدؔ کو بدل کر غالب کیا ہے۔

نکلنا خُلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے[۴۴]

فلسفیانہ افکار:

غالبؔ نے وسیع تر انسانی جذبوں، رابطوں اور رشتوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا اس لحاظ سے ان کی شاعری کا افق اقبالؔ سے زیادہ وسیع ہے۔ غالبؔ کے شعری موضوعات ان تاثرات کی عکاسی کرتے ہیں جنہیں غالبؔ نے زندگی کے تلوّن سے اخذ کیا ہے۔ اس عہد کی بدلتی ہوئی سماجی اقدار ان کے شعری وژن کا مواد بنی۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس موقف کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''............غالبؔ اور اقبالؔ میں سے اگر چہ دونوں کا مزاج فلسفیانہ تھا لیکن غالبؔ صرف شاعر بن کر نکلے اور اقبالؔ شاعر اور فلسفی دونوں۔ غالبؔ شاعری میں فلسفہ کی صرف ایک صفت یعنی موضوع کی کلیت و ہمہ گیری کو ملحوظ رکھتے تھے ان کے یہاں انسان کے عام فطری تقاضوں، خواہشوں، ولولوں، مایوسیوں اور تجربوں کی عکاسی ہے۔ زندگی کے مختلف حقیقی اور دائمی پہلوؤں کی تشریح ہے۔ انسانی محسوسات کے نفسیاتی تجزیے ہیں۔ اس کے برعکس اقبالؔ کے یہاں ایک متعین اور مخصوص فلسفۂ حیات ملتا ہے جو عقلی اور لچکدار ہونے کے باوجود بڑی حد تک نظری اور جامد ہے۔ اقبالؔ اقتضائے بشری اور انسانی نفسیات کو اکثر نظر انداز کر جاتے ہیں۔۔۔۔ اقبالؔ کے یہاں اکثر فلسفہ فن پر غالب آجاتا ہے لیکن غالبؔ کے یہاں فلسفہ ہمیشہ فن سے مغلوب رہتا ہے۔''[۴۵]

اقبالؔ اصلاً فلسفی تھے اور غالبؔ اصلاً شاعر۔ اقبالؔ فلسفی ان معنوں میں ہیں کہ انہوں نے اپنی شاعری میں زندگی کا ایک مربوط، منظّم اور بعض حیثیتوں سے ایک مکمل اور عملی فلسفہ پیش کیا۔ اس فلسفے نے قاری کو خودی کا مفہوم سمجھایا اور مثالوں اور دلیلوں کے ذریعے اس حقیقت پر سے پردہ اُٹھایا کہ اثباتِ خودی کے لئے عملِ پیہم ضروری ہے۔ ان کے فکری نظام کے باقی تمام عناصر اور اجزاء اسی محور کے گرد گھومتے نظر آتے ہیں۔ اقبالؔ کی حکیمانہ فطرت کا اندازہ درج ذیل اشعار سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

یہ موجِ نفس کیا ہے؟ تلوار ہے
خودی کیا ہے؟ تلوار کی دھار ہے

خودی کیا ہے؟ رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے؟ بیداریٔ کائنات
خودی جلوہ بد مست و خلوت پسند
سمندر ہے اک بوند پانی میں بند
اندھیرے اُجالے میں ہے تابناک
من وتوٗ سے پیدا، من وتوٗ سے پاک
اَزل اس کے پیچھے، اَبد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی
ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی
تجسس کی راہیں بدلتی ہوئی
دما دم نگاہیں بدلتی ہوئی
سبک اس کے ہاتھوں میں سنگِ گراں
پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگِ رواں
سفر اس کا انجام و آغاز ہے
یہی اس کی تقویم کا راز ہے
ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر
ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر
خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے[۴۶]

اقبالؔ حقائق وواقعات کوحکیمانہ نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں جب کہ غالبؔ حقائق کوذاتی جذبات واحساسات کی روشنی میں پرکھتے ہیں۔فلسفیانہ مسائل بھی جب غالبؔ کی زبان سے ادا ہوتے ہیں تو وہ پڑھنے والے کے لئے فلسفہ نہیں

رہتے بلکہ ایک روح پرور اور نشاط انگیز تجربہ بن جاتے ہیں۔ ان کی حکیمانہ فطرت شاعرانہ فطرت سے پوری طرح ہم آہنگ نظر آتی ہے اس کے برعکس بقول شیخ محمد اکرام:

''اقبال کا طائرِ فکر حکمت اور فلسفہ کی ان بلندیوں پر گرم پرواز رہتا ہے جہاں سے یہ جہان ایک دھندلا سا ستارہ نظر آتا ہے۔'' ۴۷

اکرام صاحب کی رائے میں اقبال کا معاملہ غالب سے مختلف ہے کیونکہ انسان اور انسانی مسائل کی نسبت اقبال کا نقطۂ نظر فلسفیانہ ہے شاعرانہ یا نفسیاتی نہیں۔ وہ بنی نوع انسان کی بنیادی خوبیوں اور خامیوں سے واقفیت تو رکھتے ہیں لیکن زندہ افراد کی گوناگوں بشری حماقتوں، الجھنوں اور مصیبتوں سے انہیں زیادہ دلچسپی نہیں وہ انسانی بستی پر تو نظر ڈالتے ہیں لیکن اس قدر بلندی سے کہ انہیں اس بستی کے رہنے والوں کے خدوخال واضح نظر نہیں آتے ان کا مقصدِ جلیل تو اپنے تخیل کی مدد سے ایک ایسی بلند تر حقیقت کا بیان ہے جس کی کشش سے متاثر ہو کر ایک جہانِ تازہ کی بنیاد ڈالی جا سکے۔ ۴۸

وہی جہاں ہے ترا جس کو تو کرے پیدا
یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے ۴۹

اقبال اپنے قاری کو آزادیٔ فکر، بے باکیٔ اندیشہ اور مستیٔ کردار کا پیغام دیتے ہیں۔ انسان چونکہ نائبِ الٰہی ہے اس لئے وہ فطرت کی قوتوں کو تسخیر کر کے اپنا تابع بنانا چاہتا ہے۔ اس کی جفا طلب فطرت اسے ستاروں پر کمندیں ڈالنے اور ستارے توڑ کر آفتاب بنانے کا سبق سکھاتی ہے اس کے ''جوشِ کردار'' سے تقدیر کے راز افشا ہو جاتے ہیں۔

راز ہے راز ہے تقدیرِ جہانِ تگ و تاز
جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز ۵۰

اقبال کے سامنے ایک عظیم مقصد تھا جس کے ابلاغ کی خاطر وہ کہیں کہیں حکیمانہ اور مفکرانہ انداز چھوڑ کر خطیبانہ انداز اختیار کر لیتے ہیں۔ مثلاً نظم ''شمع و شاعر'' کے یہ اشعار دیکھئے۔

آنکھ کو بیدار کر دے وعدۂ دیدار سے
زندہ کر دے دل کو سوزِ جوہرِ گفتار سے ۵۱

کیوں چمن میں بے صدا مثلِ رمِ شبنم ہے تو؟
لب کشا ہو جا سرود بربطِ عالم ہے تو ۵۲

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو
خوفِ باطل کیا کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تو ۵۳

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے
کیوں گرفتار طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفان بھی ہے ۵۴

رفتہ رفتہ اقبالؔ ایک مخصوص فکر و فلسفہ کے مبلغ، ایک معلّم، ایک ناصح اور ایک خطیب کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک مخصوص قوم اور مخصوص ملت کے شاعر کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے۔ جب کہ غالبؔ نہ معلم اخلاق بنے نہ ناصح مشفق۔ ان کے یہاں خطیبانہ انداز بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ دونوں شعراء کے تخلیقی اہداف، موضوعات و مضامین اور شعری تناظر مختلف اور متبائن تھے۔ اگر فن برائے فن اور ادب کے نقطۂ نگاہ سے دونوں شعراء کا کلام ملاحظہ کیا جائے تو غالبؔ، اقبالؔ سے آگے نظر آتے ہیں۔ کیونکہ ان کی شاعری کا موضوع بنیادی انسانی جذبات و احساسات ہیں اور ان کے بیان کے لئے غالبؔ نے جو انداز اپنایا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ غالبؔ کا ڈکشن اقبالؔ سے زیادہ وسیع ہے جب کہ اقبالؔ کا ڈکشن ان کے مقاصد کا تابع ہے۔ اس کے برعکس اگر ادب برائے زندگی کے نظریے کو ملحوظ رکھا جائے تو آدرش، بلند تر نصب العین اور ہدفِ مقصد کے اعتبار سے اقبالؔ، غالبؔ سے بہت آگے دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کا آدرش اس قدر عظیم اور مرعوب کن تھا کہ اس نے ایک خفتہ قوم کے افراد کو ہلا کر رکھ دیا۔

بحیثیت مجموعی اقبالؔ ایک قوم کو تو متحرک کر سکے لیکن ان کا فلسفہ ماورائیت اور مابعد الطبیعاتی مسائل اور مراحل سے پُر ہونے کی بنا پر بوجھل بن کر رہ گیا ہے۔ خودی کا مفہوم، اس کے مراحل، منازلِ تربیت، بے خودی سے اس کا تعلق، عشق کے مثالی اور ماورائی تصورات اور ان کا مابعد الطبیعاتی رنگ خالص شعری وژن کے نہیں بلکہ صرف فلسفیانہ

ذہن وفکر کی پیداوار نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان کا یہ خیال درست معلوم ہوتا ہے کہ:

''غالبؔ کی فکر جذباتی اور اقبالؔ کا جذبہ مفکرانہ انداز رکھتا ہے۔'' ۵۵

ڈاکٹر آفتاب احمد غالبؔ اور اقبالؔ کے کلام میں جذبہ اور خیال کی آمیزش کا فرق واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''غالبؔ کے ہاں تو خالص حسی تجربات کے اشعار بھی خاصی تعداد میں مل جائیں گے مگر اقبالؔ نے عقلیت کو اپنے شعور پر اس قدر مسلّط کر لیا تھا کہ ان کے ہاں خالصِ حسی تجربات تقریباً بے دخل ہو کر رہ گئے ہیں۔ غالبؔ مختلف النوع اور منفرد خیالات کے شاعر ہیں۔ اقبالؔ ایک مربوط، معین اور مسلسل نظامِ خیال کے اور دونوں کا فرق ظاہر ہے۔'' ۵۶

غالبؔ اور اقبالؔ کے تخیل اور شعور میں جو نمایاں تفاوت ہے ان کا اندازہ درج ذیل متقابل اشعار سے کیا جا سکتا ہے:

ہے دلِ شوریدۂ غالبؔ طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے ۵۷
غالبؔ

گماں آباد ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا
بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی ۵۸
اقبالؔ

ہم موحّد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں ۵۹
غالبؔ

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی ۶۰
اقبالؔ

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا

واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں ۶۱

غالبؔ

گرچہ ہے میری جستجو دیر و حرم کی نقش بند

میری فغاں سے رستخیز کعبہ و سومنات میں ۶۲

اقبالؔ

غرّۂ اوجِ بنائے عالم امکاں نہ ہو

اس بلندی کی نصیبوں میں ہے پستی ایک دن ۶۳

غالبؔ

امید نہ رکھ دولتِ دنیا سے وفا کی

رم اس کی طبیعت میں ہے مانندِ غزالہ ۶۴

اقبالؔ

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا ۶۵

غالبؔ

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی

اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو ۶۶

اقبالؔ

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک ۶۷

غالبؔ

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر

ہوش و خرد شکار کر ، قلب و نظر شکار کر ۶۸؎

اقبالؔ

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا

کاغذی ہے پیراہن ہر پیکرِ تصویر کا ۶۹؎

غالبؔ

مجکو پیدا کر کے اپنا نکتہ چیں پیدا کیا

نقش ہوں اپنے مصور سے گلا رکھتا ہوں میں ۷۰؎

اقبالؔ

ان اشعار سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی کے حقائق کو دونوں نے سمجھنے کی کوشش کی، حقائق کی فلسفیانہ توجیح بھی دونوں کے ہاں موجود ہے لیکن دونوں کی ذہنیت اور شعور میں نمایاں فرق موجود ہے۔ غالبؔ کے سامنے زندگی کا کوئی معین اور مخصوص تصور نہیں تھا اس کے برعکس اقبالؔ اپنی منزلِ مقصود کا واضح تصور رکھتے تھے۔ غالبؔ کا شعور اجتماعی درد سے تہی تھا جب کہ اقبالؔ نے اپنی فکر کو اجتماعی مقاصد کے حصول کا ذریعۂ بنایا۔

ڈاکٹر عبدالمغنی غالبؔ اور اقبالؔ کا تقابلی جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں:

''غالبؔ کی خودی سراسر انفرادی ہے۔ اقبالؔ کی خودی یکسر اجتماعی ہے، غالبؔ کا عشق غمِ ذات ہے، اقبالؔ کا عشق غمِ کائنات، غالبؔ شک کی خود پسندی میں گرفتار رہے، اقبالؔ یقین کی خود آ گہی سے سرفراز ہوئے۔ غالبؔ نے انسان کو اس کی ہستی سے بدگمان و مایوس کیا، اقبالؔ نے انسان کے اپنے وجود پر اعتماد کو بحال کیا اور اسے ندرتِ فکر و عمل کا نشاط انگیز پیام دیا۔'' ۷۱؎

غالبؔ اور اقبالؔ کے نقطۂ نظر اور طرزِ فکر کا اختلاف واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالمغنی فرماتے ہیں کہ غالبؔ نے حیات کی وسعتوں کو حیرت کی نگاہ سے ضرور دیکھا لیکن تذبذب اور تشکیک کا شکار رہے جب کہ اقبالؔ کی بصیرت نے مظاہر کی تہہ میں کائنات کے سربستہ راز کو پالیا۔ ۷۲؎

تصورِ عقل و عشق:

غالبؔ اور اقبالؔ کے ہاں تصورِ عقل و عشق کے حوالے سے نمایاں اختلافات نظر آتے ہیں۔ گو "بانگِ درا" کی نظم "عقل و دل" سے پیشتر غالبؔ بھی عقل و دل کی باہمی کشمکش اور تضاد کا ذکر کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ:

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا؟ [۳]

علامہ اقبالؔ جو خود فلسفی بھی تھے اور حکیم بھی۔ تاہم پھر بھی عقل کے متعلق ان کا نقطۂ نظر بہت حد تک تنقیدی ہے انہوں نے جا بجا عقل و خرد پر حرف گیری کی ہے۔ جہاں وہ عقل سے مایوسی اور بیزاری کا اظہار کرتے ہیں وہاں دل اور عشق کو فضیلت بخشتے ہیں کیونکہ علم اور عقل انسان کو منزل کے قریب تو پہنچا سکتے ہیں لیکن حضوری کی منزل عشق کی مدد کے بغیر ممکن نہیں:

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں
علم میں بھی سرور ہے لیکن
یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں [۴]

اقبالؔ کے خیال میں عشق عقل سے زیادہ صاحبِ ادراک ہے یعنی

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ
کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادراک [۵]

یا

ترے سینے میں دم ہے دل نہیں ہے
ترا دم گرمیٔ محفل نہیں ہے
گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے [۶]

زندگی کے جس چاک کو عقل نہیں سی سکتی اس کو عشق اپنی کرامات سے "بے سوزن و تارِ رفو" سی ڈالتا ہے۔

وہ پرانے چاک جن کو عقل سی سکتی نہیں

عشق سیتا ہے انہیں بے سوزن و تارِ رفو ۷ے

اقبالؔ جہاں عقل کی مدح بھی کرتے ہیں وہاں کوئی نہ کوئی پہلو اس کی حیلہ گری اور عیاری کا نکال کر اس کی مذمت بھی کرتے جاتے ہیں مثلاً

ہر دو بہ منزلے رواں، ہر دو امیرِ کارواں

عقل بہ حیلہ مے برد، عشق برد کشاں کشاں ۸ے

جب کہ غالبؔ کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ غالبؔ عقل و خرد کے منفی پہلوؤں کا احساس رکھنے کے باوجود بھی عقل کے معترف ہیں اور زندگی کی عنان عقل کے ہاتھ میں دینے کو تیار نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر شیخ محمد اکرام اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''فیضی کے علاوہ اقبالؔ نے بھی جا بجا اپنے اشعار میں عقل کی کوتاہیوں کا ذکر کیا ہے برخلاف اس کے غالبؔ نے کئی جگہ عقل بالخصوص خرد اور دانش کی تعریف کی ہے کئی جگہ تو یہ اظہار ضمناً اور سرسری سا ہے۔ مثلاً! جہاں عقل کو ''نہفتہ داں'' کہا ہے یا ''کاروبارِ مردم ہشیار'' اور ''فرزانۂ بیدار مغز'' کا ذکر تعریف کے پیرائے میں کیا ہے لیکن ''ابرِ گوہر بار'' میں متعدد اشعار صراحتاً خرد کی تعریف میں ہیں۔۔۔'' ۹ے

مثنوی ''ابرِ گوہر بار'' کے اشعار ملاحظہ کیجئے۔

سخن گرچہ گنجینۂ گوہر است

خرد را ولے تابشِ دیگر است

ہمانا بشبہائے چوں پرِّ زاغ

نہ بینی گہر جز بروشن چراغ

بہ پیرایشِ ایں کُہن کار گاہ

بہ دانش تواں دید آئین نگاہ

بود بستگی را کشاد از خرد
سرِ مرد خالی مباد از خرد
خرد چشمۂ زندگانی بود
خرد را بہ پیری جوانی بود
فروغِ سحر گاہِ رُوحانیاں
چراغِ شبستانِ یونانیاں
نخستین نمودارِ ہستی گرائے
خرد بود کامد سیاہی زد اے
خرد جویم ار خود بود مرگ من
بہ ہستی خرد بس بود مرگِ من! ۸۰؎

غالبؔ اور اقبالؔ کی نگاہِ فکر میں عشق کا بنیادی مفہوم بھی جدا جدا ہے۔ اقبالؔ کے ہاں عشق کا وہ عام شاعرانہ مفہوم نہیں جو غالبؔ کی نگاہ میں تھا۔ اقبالؔ جس عشق کی کارگزاریوں کے معترف ہیں وہ ایک زبردست فعال قوت ہے جب کہ غالبؔ کا عشق، عشقِ مجازی ہے۔ اقبالؔ اپنے مقاصد سے والہانہ وابستگی اور بے پناہ لگاؤ کو عشق کا نام دیتے ہیں جس سے سرشار ہو کر انسان اپنے مقاصد کو پانے کی جستجو کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں عقل میں جراتِ رندانہ کی کمی ہوتی ہے اور وہ انسان کو تذبذب اور شش و پنج میں مبتلا کر دیتی ہے۔ عقل کی کیفیت انفعالی ہے جب کہ جذبۂ عشق فعال اور خلّاق ہے:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی ۸۱؎

اقبالؔ نے اپنے تصورِ عقل و عشق کو اپنے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنایا جب کہ غالبؔ نے عقل و دانش اور عشق دونوں کو بنیادی انسانی جذبوں کے طور پر اپنی شاعری میں برتا۔ غالبؔ عشق کو حظ آفرینی اور راحتِ وصل کا ذریعۂ سمجھتے ہیں جب کہ اقبالؔ اس کو اجتماعی مقاصد کے حصول کا ذریعہ گردانتے ہیں غالبؔ طربِ وصل کے آرزومند ہیں یعنی:

گر تیرے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال
موج محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں ۸۲؎

جب کہ اقبالؔ کے نزدیک وصل سے زیادہ فراق میں لذّت ہے کیونکہ وصل مرگِ آرزو اور شوق کے زوال کا سبب ہے۔ان کے نزدیک:

عالمِ سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو، ہجر میں لذتِ طلب ۸۳؎

غالبؔ کے برعکس اقبالؔ کے عشق کا تصور بہت وسعت کا حامل ہے انہوں نے عشق کے مفہوم کو وسعت دے کر خودی کے ہم معنی قرار دیا ہے اور ان کے نزدیک خودی ایک ایسا بحرِ بیکراں ہے جس کی کوئی حد اور کوئی کنارہ نہیں۔ڈاکٹر یوسف حسین خان کی رائے کے مطابق:

> ''غالبؔ نے اپنے جذبہ و وجدان پر فکر کا رنگ چڑھایا اور اقبالؔ نے اپنی حکیمانہ فکر کو جذبے سے ہم آغوش کیا تا کہ اس میں حصولِ مقاصد کے لئے تاثیر پیدا ہو۔غالبؔ جب خرد و اندیشہ کی بات کرتا ہے تو حقیقت میں اس کی تہہ میں جذبہ و تخیل ہوتے ہیں اس واسطے کہ اس کے یہاں تحلیلی اور منطقی فکر اور تخیلی فکر میں کوئی خاص فرق و امتیاز نہیں ہے۔اقبالؔ چونکہ مغربی فلسفے کے اصولی مباحث سے واقفیت رکھتا تھا جن میں موضوعات کی علمی تقسیم بندی کی جاتی ہے۔اس لئے اس نے ہمیشہ عقل و خرد کو تحلیلی اور منطقی فکر کے معنی میں استعمال کیا ہے۔''۸۴؎

اقبالؔ اپنی ''حکیمانہ نظر'' کو خرد کا عطیہ سمجھتے تھے مگر وہ اس حقیقت سے بھی بخوبی باخبر تھے کہ ''تکمیل نفس'' عشق کے بغیر کسی طور ممکن نہیں۔

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ
سکھائی عشق نے مجھ کو حدیثِ رندانہ
مقامِ عقل سے آساں گزر گیا اقبالؔ
مقامِ شوق میں کھویا گیا وہ فرزانہ ۸۵؎

تصورِ زیست:

زندگی کے بارے میں غالبؔ اور اقبالؔ دونوں کا نقطۂ نگاہ رجائی تھا،دونوں کے ہاں پر جوش آرزومندی پائی جاتی ہے اس کے باوجود دونوں شعراء کے ہاں رجائیت کا معیار مختلف ہے۔

غالبؔ قنوطی نہیں ہیں انہیں زندگی ہر حال میں عزیز ہے اسی لئے وہ ہمہ وقت اس کی تلخیوں کو گوارا بنانے کی کوشش میں مصروف نظر آتے ہیں زندگی کی پُر خار راہوں سے مسکراہٹوں کے پھول چنتے ہیں۔ ناکامیوں اور نامرادیوں میں گھرے رہنے کے باوجود سخت کوشی اور آرزومندی کی عادت اپناتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں میرؔ کی سی نشتریت اور یاس انگیزی موجود نہیں۔ ان کی آواز اپنے دور کے طرزِ فکر سے ہٹ کر منفرد اور ممتاز نظر آتی ہے۔

نہ لائے شوخیِ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی
کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے ۸۶

غالبؔ کی زندہ دلی کے آگے غم والم، شکستِ آرزو اور افسردگی کے تمام تاثرات وقتی ثابت ہوتے ہیں اسی لئے زندگی کی ہنگامہ آرائیوں سے نبرد آزما ہونے اور آسودگی کے حصول کی خواہش ان کے ہاں کبھی ماند نہیں پڑتی۔ وہ غمِ عشق اور غمِ روزگار دونوں کی لذت سے آشنا ہیں۔ بلکہ دوسروں کو بھی زندہ دلی کا درس دیتے ہوئے کہتے ہیں:

گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے
غمِ محرومیِ جاوید نہیں ۸۷

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیئے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن ۸۸

اقبالؔ غالبؔ کے اسی خیال کی ہمنوائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

چمن زارِ محبت میں خموشی موت ہے بلبل
یہاں کی زندگی پابندیٔ رسمِ فغاں تک ہے ۸۹

اقبالؔ غالبؔ سے بڑھ کر رجائیت پسند ہیں یہاں تک کہ وہ زندگی کی تلخ حقیقتوں سے جان بوجھ کر پہلوتہی کرتے ہیں۔ وہ اپنی شاعری سے ''شمشیرِ خودی'' تیز کرنا چاہتے تھے۔ دلوں کو افسردہ کرنا انہیں مطلوب نہ تھا ان کے نزدیک:

ہے شعرِ عجم گرچہ طرب ناک و دل آویز
اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیرِ خودی تیز

افسردہ اگر اس کی نوا سے ہو گلستاں

بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغِ سحر خیز ۹۰

اقبالؔ، غالبؔ کے برعکس کہیں بھی حسرت پرستی اور مایوسی کا ذکر نہیں کرتے ان کے نزدیک شاعر کو صرف جدوجہد اور عمل کی تلقین کرنی چاہیئے اور بس۔ لہٰذا ان کا فلسفۂ زیست زیادہ اُمید افزا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اس فرق کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اقبالؔ نے اپنی آرزومندی کو اجتماعی آرزوؤں اور اُمنگوں کی صورت دے دی ہے کیونکہ اقبالؔ کا غم انسانیت کی تکمیل کے لئے ہے۔ یہ غم کسی سے ملنے اور اس میں ڈوب کر محو ہو جانے اور خود کو فراموش کردینے کی آرزو نہیں بلکہ تسخیر، توسیع اور چھا جانے کی وہ آرزو ہے جس کا تعلق پوری نوعِ انسانی سے ہے۔

غالبؔ کی آرزومندی بھی شدید ہے مگر اس سے مختلف۔ اس کی نوعیت خالصتاً انفرادی شخصی اور ذاتی ہے ان کا غم ذاتی آسودگی اور احساسِ ناتمامی سے ابھرا ہے۔ ان کی آرزوئیں آسودہ ہو کر بھی آسودہ نہیں اور ان میں سے بعض آرزوؤں کی نوعیت ایسی ہے جن کی کوئی عقلی توجیہ نہیں کی جاسکتی۔۔۔'' ۹۱

اقبالؔ کے برعکس غالبؔ نے زندگی کے تلخ و شیریں تجربات، خوشی اور غم کے تاثرات اور حسرت پرستی و آرزو کی کشمکش کو بیان کیا ہے ان کے ہاں زندگی حسرتوں، مایوسیوں اور امیدوں کے بین بین چلتی نظر آتی ہے اس لئے ان کا تصورِ زیست زیادہ مکمل، جاندار اور حقیقت سے قریب تر ہے۔ جب کہ علامہ اقبالؔ کا تصورِ زیست ان کی مقصدیت بلکہ فلسفۂ خودی کا تابع ہے۔ ان کے نزدیک زندگی اثباتِ خودی کا دوسرا نام ہے وہ کہتے ہیں کہ:

سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات

خودی کی پرورش و لذتِ نمود میں ہے ۹۲

اقبالؔ ایک زوال خوردہ قوم سے مخاطب تھے جو ''تقدیر کا بہانہ'' بنا کر ذوقِ عمل سے فارغ ہو چکی تھی لہٰذا ان کے روبروزندگی کی تلخیوں اور مایوسیوں کا بیان انہیں مزید پست ہمت بنانے کے مترادف تھا۔ اقبالؔ ملتِ اسلامیہ کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنا چاہتے تھے۔ ان کے اندر عمل کا ولولہ، کچھ کر گزرنے کی آرزو اور خطرات کو انگیز کرنے کا حوصلہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک شاعر وہی ہے جو مردہ اور افسردہ جذبات کو متحرک کردے، انہیں بلند نصب العین کی

خاطر جینا اور مرنا سکھا دے، قوموں کی زندگی میں انقلاب برپا کر دے اس لئے انہوں نے قصداً زندگی کی تلخ حقیقتوں کو اپنا موضوعِ سخن نہیں بننے دیا۔ اقبالؔ کی مقصدیت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا جائے تو اقبالؔ کا تصورِ زیست غالبؔ کے مقابلے میں زیادہ رجائی اور بھر پور محسوس ہوتا ہے۔ اقبالؔ کا اجتماعی شعور پختہ تھا۔ وقت کے تقاضوں کے پیشِ نظر وہ رہبانیت، ترکِ دنیا اور کشمکشِ حیات سے گریز کی تعلیم دینے کی بجائے سخت کوشی، خاراشگافی اور جہدِ مسلسل کا درس دیتے ہیں کیونکہ وہ اس حقیقت سے باخبر تھے کہ ایک آزاد اور محکوم قوم کے افراد کی طلب کا پیمانہ مختلف ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں:

آزاد کی رگ سخت ہے مانندِ رگِ سنگ
محکوم کی رگ نرم ہے مانندِ رگِ تاک
محکوم کا دل مردہ و افسردہ و نومید
آزاد کا دل زندہ و پُر سوز و طربناک
آزاد کی دولت ، دلِ روشن نفسِ گرم
محکوم کا سرمایہ فقط دیدۂ نمناک
ممکن نہیں محکوم ہو آزاد کا ہمدوش
وہ بندۂ افلاک ہے، یہ خواجۂ افلاک [۹۳]

یا

آزاد کا ہر لحظہ پیامِ ابدیت
محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگِ مفاجات [۹۴]

بلاشبہ غالبؔ کے کلام کا مجموعی تاثر بھی اُمید اور رجائیت سے بھر پور ہے تاہم ان کے یہاں ناامیدی اور مایوسی کے بے شمار مضامین بھی نظر سے گزرتے ہیں لیکن غالبؔ کے برعکس اقبالؔ نے اپنے اجتماعی مشن کے پیشِ نظر زندگی کو صرف رجائی نقطۂ نگاہ سے دیکھا یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں مایوسی اور نااُمیدی کے موضوعات ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے اسی لئے وہ کہتے ہیں:

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
ادھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے، اِدھر نکلے ۹۵

کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے
ہے بھروسہ اپنی ملت کے مقدر پر مجھے ۹۶

اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں ۹۷

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے ۹۸

تصورِ خودی:

اقبالؔ کے فکر و فلسفہ کا حاصل ان کا تصورِ خودی ہے جب کہ اقبالؔ سے بہت پہلے غالبؔ بھی اپنی شاعری میں انانیت اور خودداری کا جا بجا اظہار کرتے نظر آتے ہیں لیکن غالبؔ اور اقبالؔ کے تصورِ خودی کا مفہوم اور دائرہ کار خاصا مختلف ہے۔ اقبالؔ خودی کے مفہوم کی فلسفیانہ توجیہہ اس کی حدود اور امکانات کی وضاحت اشعار میں بھی کرتے ہیں اور نثر کے پیرایہ میں بھی۔ ان کے خیال میں

> ’’خودی کا مفہوم محض احساسِ نفس یا تعینِ ذات ہے۔ خودی وحدتِ وجدانی یا شعور کا وہ روشن نقطہ ہے جس سے تمام انسانی تخیلات و جذبات و تمنیات مستنیر ہوتے ہیں۔ یہ پُر اسرار شے فطرتِ انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے۔۔۔۔ اپنے عمل کی رو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کی رو سے مضمر ہے۔۔۔۔ وہ تمام مشاہدات کی خالق ہے مگر اس کی لطافت مشاہدے کی گرم نگاہوں کی تاب نہیں لا سکتی۔‘‘ ۹۹

اقبالؔ کے خیال میں:

زندگانی ہے صدف قطرۂ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خود گرو خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے[۱۰۰]

یا

خودی شیرِ مولیٰ جہاں اس کا صید
زمیں اس کی صید، آسماں اس کا صید[۱۰۱]

غالبؔ کے تصورِ خودی کا معاملہ اقبالؔ کے تصورِ خودی سے یکسر جدا ہے غالبؔ کے ہاں خودی کا تصور کسی اجتماعی فلسفۂ حیات سے ماخوذ نہیں اس کی نوعیت سراسر ذاتی اور انفرادی ہے۔ بقول ڈاکٹر اے بی اشرف:

''غالبؔ کے ہاں اگر کوئی فرد تھا تو وہ ان کی اپنی ذات تھی جس کا آشوب ان کی شاعری کا موضوع بنا۔ یہ فرد اس دور میں قدیم و جدید کی آویزش، نئی اور پرانی اقدار کی کشمکش اور ایک سیاسی اور معاشرتی کرائسس کے درمیان حوصلہ مندی کے ساتھ ہاتھ پاؤں مارتا نظر آتا ہے غالبؔ کا یہ فرد (جو ان کی اپنی ذات ہے) انانیت کا اظہار بھی کرتا ہے اور مجبوری و بے بسی کا بھی۔ وہ کبھی تو کعبے سے بھی لوٹ آتا ہے اگر اس کا در وا نہیں ہوتا۔ اس کی غیرت مندی کا یہ عالم ہے کہ اپنے محبوب کو خدا کو سونپنے کو بھی تیار نہیں ہوتا۔''[۱۰۲]

غالبؔ کے یہاں ایک عام انسان یا فرد کی خودی اور انانیت کا ذکر ہے جب کہ علامہ اقبالؔ کا تصورِ خودی عام انسانی محسوسات سے ہٹ کر ہے لفظ خودی کے مفہوم سے لے کر تربیتِ خودی کی منازل، تکمیلِ خودی کے مراحل، خودی اور بے خودی کا باہمی تعلق اور عشق کا ماورائی تصور اقبالؔ کے فلسفیانہ ذہن کی پیداوار نظر آتے ہیں اور ان کی تشکیل میں اسلامی فکر و فلسفہ کے ساتھ ساتھ مغربی اور عجمی تفکر کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔

اقبالؔ کے برعکس غالبؔ خودی کی فلسفیانہ توجیہہ نہیں فرماتے بلکہ ان کے نزدیک خودی، عزتِ نفس، انانیت، خودداری اور انفرادیت پسندی کا دوسرا نام ہے۔ جس کا لحاظ وہ خود بھی رکھتے ہیں اور دوسروں کو بھی تلقین کرتے ہیں کہ:

دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم
اے خانماں خراب نہ احساں اُٹھایئے ۱۰۳

دراصل غالبؔ نے اپنی انانیت اور خودداری سے بڑے بڑے کام لئے شاید اسی لئے ان کی انفرادیت پسندی اور عزت نفس کے حد سے بڑھے ہوئے احساس کو ''نرگسیت'' اور ''الفتِ ذات'' سے تعبیر کیا گیا کیونکہ وہ ''پابستگی رسم ورہ عام'' سے نفور تھے ''وبائے عام میں مرنا'' ان کے لئے کسرِ شان تھا بلکہ انہیں تو دہر سے عبرت حاصل کرنا بھی منظور نہیں تھا۔

اقبالؔ کے برعکس غالبؔ غزل کے شاعر تھے اور غزل کا موضوع حسن و عشق ہے لہذا غالبؔ نے پہلی مرتبہ اپنی غزل میں ہمیں ایک ایسے عاشق سے متعارف کروایا جس میں روایتی عشاق کی سی انفعالیت، عاجزی اور مسکینی نہیں بلکہ وہ اپنی خودداری اور وضعداری کا دم بھرتا ہے۔ جو اپنے پندارِ محبت کا بھرم رکھنا جانتا ہے۔ جسے اپنی عزتِ نفس سے پیار ہے جو راہِ عشق میں اپنی خودداری کا سودا نہیں کرنا چاہتا بلکہ اپنی خودی کی تکمیل کا خواہشمند ہے درج ذیل غزل کے اشعار ملاحظہ کیجئے:

وہ اپنی خُو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سُبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ''ہم سے سرگراں کیوں ہو''
وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل ، تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو
غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ، دیکھو جرم کس کا ہے
نہ کھینچو گر تم اپنے کو، کشاکش درمیاں کیوں ہو ۱۰۴

فرق صاف ظاہر ہے کہ غالبؔ نے بنیادی انسانی جذبات کو اپنے اشعار کا موضوع بنایا جب کہ اقبالؔ نے بنیادی انسانی جذبات کو فکر و فلسفہ سے ہم آہنگ کر کے بلند تر مقاصد کے حصول کا ذریعۂ بنایا اور اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیاب بھی رہے جب کہ غالبؔ کی اَنا کا دائرہ ان کی ذات ہی کے اردگرد گھومتا رہا۔

تصورِ تصوّف:

غالبؔ اور اقبالؔ کی حکیمانہ فطرت میں فلسفہ و تصوف سے گہرا لگاؤ اور دلی وابستگی پائی جاتی تھی۔ حالیؔ ''یادگارِ غالبؔ'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''۔۔۔تصوف سے ان کو خاص مناسبت تھی حقائق و معارف کی کتابیں اور رسائل، کثرت سے ان کے مطالعے میں گزرے تھے انہی متصوفانہ خیالات نے مرزا کو نہ صرف اپنے ہمعصروں میں بلکہ بارھویں اور تیرھویں صدی کے تمام شعراء میں ممتاز بنا دیا۔''۱۰۵

خود غالبؔ کو اپنے مسائلِ تصوف کے بیان پر بہت ناز تھا ایک غزل کے مقطع میں بصد ناز فرماتے ہیں:

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا ۱۰۶

اقبالؔ کے کلام میں بھی ابتداء ہی سے تصوف کا گہرا تاثر ملتا ہے انہوں نے جس ماحول اور جن ہاتھوں میں تربیت پائی تھی ان پر تصوف کے اثرات بہت گہرے تھے یہی وجہ ہے کہ جب اقبالؔ نے پی۔ایچ۔ڈی کے مقالہ کے لئے موضوع کا انتخاب کیا تو ''ایرانی مابعد الطبیعات کا ارتقاء'' جیسے موضوع کو چنا اور اس وسیع مطالعہ کے دوران انہیں تصوف کے نظامِ فکر کو سمجھنے کا بھرپور موقع ملا اور اس کے نتیجہ میں آپ نے عجمی تصوف کے غیر اسلامی رجحانات اور خارجی عناصر کے خلاف آواز بلند کی اور مضامینِ تصوف کی اصلاح کا ڈول ڈالا۔یہی وجہ ہے کہ تصوف سے گہرا ربط رکھنے کے باوجود غالبؔ اور اقبالؔ کے صوفیانہ خیالات میں بڑا تفاوت پایا جاتا ہے۔ڈاکٹر شیخ محمد اکرام ''حکیمِ فرزانہ'' میں اس فکری اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''غالبؔ اور اقبالؔ کی طبیعتوں کا سانچہ مختلف تھا لیکن اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ ہماری قومی زندگی کے دو متضاد رجحانات کے ترجمان ہیں۔۔۔۔غالبؔ وحدت الوجود کے ترجمان تھے اور اقبالؔ وحدت الشہود کے۔ان کے اسلوبِ خیال اور فلسفۂ زندگی میں وہی فرق تھا جو امام الہند شاہ ولی اللہؒ اور مجدد الف ثانیؒ کے طریقِ کار میں تھا۔''۱۰۷

شیخ محی الدین ابنِ عربیؒ نے وحدت الوجود یا ہمہ اوست کے نظریہ کو مقبولیت بخشی جس کے مطابق خدا اور کائنات ایک ہی ہیں کیونکہ وجودِ حقیقی صرف ذاتِ باری تعالیٰ کو حاصل ہے۔کائنات میں جو کچھ نظر آتا ہے وہ صفاتِ خداوندی کی تجلی ہے اور تجلی محض عکس اور سایہ ہوتی ہے حقیقت نہیں۔اس لئے کائنات میں کوئی چیز بھی خدا کے وجود سے الگ نہیں۔اس کے مقابلے میں حضرت مجدد الف ثانیؒ نے وحدت الشہود یعنی ہمہ از اوست کے نظریہ کی اشاعت کی۔

ان کے خیال میں کائنات وجودِ حقیقی کا ظل اور سایہ تو ہے لیکن موہوم نہیں موجود ہے۔ ان کے نزدیک انسان کا اپنی ذات کی نفی کرنا الحاد ہے اور اس نفی کی تعلیم سے کاہلی، بے عملی اور بیزاری پیدا ہوتی ہے جو اسلامی تعلیمات کی روح کے منافی ہے۔

غالبؔ وحدت الوجود کے قائل ہیں۔ وہ خدا اور ماسوا کو الگ الگ خیال نہیں کرتے بلکہ ان کا مذہب ہمہ اوست ہے۔ ان کے نزدیک کائنات کا اپنا کوئی مستقل وجود نہیں ہے۔ زندگی ''حلقۂ دامِ خیال'' ہے اور اس کے فریب سے بچنا چاہیئے۔

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے ۱۰۸

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے ۱۰۹

ہے زوال آمادہ اجزاء آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگزارِ بادیاں ۱۱۰

افلاطون دنیا کا پہلا فلسفی ہے جس نے اس دنیا کو عالمِ مثال کا عکس قرار دیا تھا اور زندگی کے فراری اور منفی تصور کو اتنے موثر انداز میں پیش کیا کہ اس کے اثرات ہزاروں سال بعد تک قوموں کے نظامِ فکر پر اثر انداز ہو کر تباہ کن نتائج ظاہر کرتے رہے۔ انہی اثرات کو زائل کرنے کے لئے اقبالؔ نے افلاطون پر کڑی تنقید کی ہے اور اس کے تخیلات سے بچنے کی تلقین فرمائی ہے۔ انہوں نے مثنوی ''اسرارِ خودی'' میں افلاطون کے افکار کی مذمت میں ایک علیحدہ عنوان قائم کیا ہے اور پہلے ہی شعر میں افلاطون کو ''گوسفندِ قدیم'' کہہ کر یاد کرتے ہیں۔

راہبِ دیرینہ افلاطون حکیم
از گروہِ گوسفندان قدیم
رخش او در ظلمت معقول گم
در کہستانِ وجود افگندہ سم

آنچناں افسونِ نا محسوس خورد

اعتبار از دست و چشم و گوش برد

گفت سرِ زندگی در مردن است

شمع را صد جلوہ از افسردن است

بر تخیل ہائے ما فرماں رواست

جامِ او خواب آور و گیتیٔ رباست

گو سفندے در لباسِ آدم است

حکم او برجانِ صوفی محکم است

عقل خود را برسرِ گردوں رساند

عالمِ اسباب را افسانہ خواند

فکرِ افلاطوں زیاں را سود گفت

حکمتِ او بود را نابود گفت

بس کہ از ذوقِ عمل محروم بود

جان او وارفتۂ معدوم بود

منکرِ ہنگامۂ موجود گشت

خالقِ اعیانِ نا مشہود گشت

قوم ہا از مسکرِ او مسموم گشت

خفت و از ذوق عمل محروم گشت [111]

افلاطون اور صوفیاء کے عمومی تصورات میں زندگی کی بجائے موت کو نصب العین قرار دیا جاتا تھا۔ دنیا فانی اور عارضی ہے لہذا مادے کی نفی اور زندگی کے بارے میں سلبی نظریات عام ہوئے۔ نفس کشی، خواہشات کی نفی اور تردید، روحانیت کی تکمیل کے لئے ریاضت وعبادت اور زندگی کی عملی سرگرمیوں سے گریز اور دیگر سلبی کیفیات متصوفانہ فلسفے کی بنیاد بن گئیں۔ غالبؔ نے یہ تمام سلبی کیفیات تو قبول نہ کیں لیکن وحدت الوجود ان کا اصل مسلک بن گیا اور اس

موضوع کو جس جس انداز سے غالبؔ نے باندھا اس کی مثال عرفیؔ، نظیریؔ اور بیدلؔ کے علاوہ کہیں اور مشکل ہی سے ملے گی مثلاً ان کی یہ غزل ان کے نظریۂ وحدت الوجود کی غماز ہے۔

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے ۱۱۲

دنیا کی بے ثباتی کے تصور نے غالبؔ کے یہاں مایوسی کی ایک فضا پیدا کردی یہی وجہ ہے کہ تمام تر رجائیت اور زندہ دلی کے باوجود غالبؔ کے یہاں مایوسی اور سلبی کیفیات کا اظہار بھی عام ملتا ہے مثلاً

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا ۱۱۳

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجئے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا ۱۱۴

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز ۱۱۵

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیٔ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک ۱۱۶

اقبالؔ وحدت الوجود کے عقیدہ کو عجمی تصوف کے نام سے تعبیر کرتے ہیں ان کی نظر میں یہ تصور اسلام کی روح کے سراسر خلاف ہے وہ لکھتے ہیں۔

> ''میں عرض کر چکا ہوں کہ کونسا تصوف میرے نزدیک قابلِ اعتراض ہے۔ عجمی تصوف سے لٹریچر میں دلفریبی اور حسن و چمک پیدا ہوتا ہے۔ مگر ایسا کہ جو طبائع کو پست کرنے والا ہے۔ اسلامی تصوف دل میں قوت پیدا کرتا ہے اور اس قوت کا اثر لٹریچر پر ہوتا ہے۔ میرا تو عقیدہ ہے کہ مسلمانوں کا لٹریچر تمام ممالکِ اسلامیہ میں قابلِ اصلاح ہے۔ یاسیت انگیز ادب زندہ نہیں رہ سکتا۔ قوم کی زندگی کے لئے اس کا اور اس کے لٹریچر کا رجائی ہونا ضروری ہے۔'' ۱۱۷

اقبالؔ وحدت الشہود کے نظریہ کے حامی ہیں۔ ان کی نظر میں کائنات حقیقی وجود رکھتی ہے اور انسان کو دنیا میں تسخیرِ کائنات کا فریضہ سونپا گیا ہے یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر انسان اپنے آپ کو پہچانتا ہے اور اپنی تخلیق کے مقاصد کو پورا کرتا ہے۔ اس کی زندگی نامعلوم کی دریافت، رکاوٹوں پر غلبہ پانے اور مسلسل جدو جہد اور عمل و حرکت سے بامعنی بنتی ہے۔ وہ زندگی کے حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کا درس دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غالبؔ کے برعکس ان کے یہاں مایوسی اور نا اُمیدی کے موضوعات بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔

اقبالؔ دنیا کو بڑی اہمیت دیتے ہیں یہ زندگی ایک ٹھوس حقیقت ہے جسے کسی طور نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اقبالؔ کا مردِ مومن زمان و مکان پر تصرف حاصل کر لیتا ہے گویا اقبالؔ کے نزدیک دنیا کا وجود انسانی عمل سے لازوال ہو جاتا ہے۔ اقبالؔ کا تصوف بھی ان کے تصورِ خودی سے ہم آہنگ ہے ''ضربِ کلیم'' میں ''تصوف'' کے عنوان سے ایک نظم میں اقبالؔ فرماتے ہیں کہ اگر تصوف خودی کی نگہبانی کا فرض انجام نہیں دے سکتا تو یہ بالکل بے فائدہ ہے۔

یہ حکمت ملکوتی ، یہ علم لاہوتی
حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکرِ نیم شبی، یہ مراقبے یہ سرور
تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں ۱۱۸

اقبالؔ ایک جگہ صوفی کو اس کے اصل منصب سے آگاہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اے پیرِ حرم رسم و رہِ خانقہی چھوڑ
مقصود سمجھ میری نواہائے سحری کا
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت
دے ان کو سبق خود شکنی، خود نگری کا
تو ان کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے
مغرب نے سکھایا انہیں فن شیشہ گری کا
دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی
دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا ۱۱۹

الغرض تمام تر فکری اختلافات کے باوجود اقبالؔ آخر تک غالبؔ کے عقیدت مند رہے۔ ان کا غالبؔ سے جو ذہنی اور روحانی رشتہ فکری ارتقاء کے تشکیلی دور میں استوار ہوا تھا وہ فکری ارتقاء کی معراج تک برابر قائم رہا۔

''جاوید نامہ'' جو دورِ آخر کی کتاب ہے اس میں بھی وہ فلک مشتری پر منصور حلاج، قرۃ العین طاہرہ اور غالبؔ کی ارواحِ جلیلہ سے شرفِ ملاقات حاصل کرتے ہیں اور ان ہستیوں کی شان میں فرماتے ہیں۔

غالبؔ و حلاج و خاتونِ عجم
شور ہا افگندہ در جانِ حرم
ایں نوا ہا روح را بخشد ثبات
گرمیِ او از درونِ کائنات ۱۲۰

اقبالؔ کے نزدیک غالبؔ کا معاملہ بھی مولانا رومؒ اور دیگر صوفیائے کرام ہی کے مماثل ہے۔ مولانا رومؒ، عطارؒ سنائیؒ بھی تصوف میں ہمہ اوست کے قائل تھے۔ اقبالؔ عجمی تصوف سے شدید اختلاف رکھنے کے باوجود ان صوفیائے کرام سے گہری عقیدت رکھتے ہیں۔ بلکہ مولانا رومؒ کو تو وہ اپنا پیر و مرشد تسلیم کرتے ہیں اور ان سے اکتسابِ فیض کے دعویدار بھی ہیں۔

صحبتِ پیرِ رومؒ سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش

لاکھ حکیم سر بجیب ، ایک حکیم سر بکف [121]

اقبالؔ صرف عقیدۂ وحدت الوجود کی حد تک ان بزرگ ہستیوں کے ہمنوا نہیں تاہم دیگر مسائلِ زیست کے سلسلے میں ان کی رہنمائی کو مقدم جانتے ہیں کیونکہ ان ہستیوں نے دائرۂ اسلام کو وسعت بخشی اور اشاعتِ دین سے لے کر اقامتِ دین تک نا قابلِ فراموش خدمات سرانجام دیں۔اسی لئے اقبالؔ نہایت عقیدت کے ساتھ اعتراف کرتے ہیں کہ:

ع ماز پئے سنائیؒ وعطارؒ آمدیم [122]

المختصر ہر بڑا اور عظیم فنکار اپنے فکر وتخیل اور اُسلوب و آہنگ کو جلا بخشنے کے لئے اسلاف کے عظیم فکری سرمائے سے مستفید بھی ہوتا ہے اور منحرف بھی۔اسی عمل سے افکارِ نو کا ارتقاء عمل میں آتا ہے اور اسی انداز سے فکر وخیال کی تشکیلِ نو کا سفر جاری وساری رہتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ عبدالقادر، سر،شیخ، دیباچہ بانگِ درا،صفحہ ۹

۲۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، غالبؔ، شاعرِ امروز وفردا (لاہور: اظہار سنز ۱۹۷۰) صفحہ ۵۹

۳۔ محمد اکرام، ڈاکٹر، شیخ، حکیمِ فرزانہ، صفحہ ۱۶۷

۴۔ اقبالؔ، اقبالؔ نامہ حصہ دوم، مرتبہ شیخ عطا اللہ، صفحہ ۶۶

۵۔ اقبالؔ، بانگِ درا، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۲۲۹

۶۔ ایضاً، صفحہ ۹۷

۷۔ ایضاً، صفحہ ۷۸

۸۔ حالیؔ، یادگارِ غالبؔ، صفحہ ۸

۹۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، غالبؔ کی شخصیت۔ احوالِ ونقدِ غالبؔ مرتب محمد حیات خان سیال

۱۰ غالبؔ۔ خطوطِ غالبؔ مرتب غلام رسول مہر، صفحہ ۸۵

۱۱۔ غالبؔ، کلیاتِ غالبؔ فارسی، جلد سوم، صفحہ ۳۲۴

۱۲۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، غالبؔ اور عصرِ جدید، احوال ونقدِ غالبؔ مرتبہ محمد حیات خان سیال، صفحہ ۱۹۵

۱۳۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۱۳۷

۱۴۔ ایضاً، صفحہ ۲۸۷

۱۵۔ ایضاً، صفحہ ۱۴۹

۱۶۔ ایضاً، صفحہ ۴۸

۱۷۔ ایضاً، صفحہ ۱۱۶

۱۸۔ ایضاً، صفحہ ۴۲

۱۹۔ اُسلوب احمد انصاری، غالبؔ کی شاعری کے چند بنیادی عناصر، احوال ونقدِ غالبؔ مرتب محمد حیات خان سیال، صفحہ ۱۶۴۔۱۶۵

۲۰۔ ایضاً، صفحہ ۱۶۵

۲۱۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۳۰۱

۲۲۔ ایضاً، صفحہ ۱۸

۲۳۔ ایضاً، صفحہ ۷۳

۲۴۔ ایضاً، صفحہ ۴۲

۲۵۔ ایضاً، صفحہ ۸۱

۲۶۔ آل احمد سرور، دانشورِ اقبالؔ، صفحہ ۱۸

۲۷۔ اقبالؔ، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۵۹۵

۲۸۔ اقبالؔ، اقبالؔ نامہ، حصہ اوّل مرتب شیخ عطااللہ، صفحہ ۱۰۸

۲۹۔ اقبالؔ، اسرارِ خودی، کلیاتِ اقبالؔ فارسی، صفحہ ۱۷

۳۰۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۳۴۰

۳۱۔ اقبالؔ، زبورِ عجم، کلیاتِ اقبالؔ فارسی، صفحہ ۴۴۷

۳۲۔ اقبالؔ، پیامِ مشرق، کلیاتِ اقبالؔ فارسی، صفحہ ۱۸۷

۳۳۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۳۴۳

۳۴۔ محمد اکرام، ڈاکٹر، شیخ، حکیمِ فرزانہ، صفحہ ۱۶۹۔۱۷۰

۳۵۔ اقبالؔ، بانگِ درا، حکیمِ فرزانہ

۳۶۔ محمد اکرام، ڈاکٹر، شیخ، حکیمِ فرزانہ، صفحہ ۱۷۰

۳۷۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید۔ صفحہ ۴۴

۳۸۔ ایضاً، صفحہ ۴۷

۳۹۔ ایضاً، صفحہ ۱۰۸

۴۰۔ ایضاً، صفحہ ۱۹

۴۱۔ ایضاً، صفحہ ۹۹

۴۲۔ ایضاً، صفحہ ۱۵۳

۴۳۔ ایضاً،صفحہ ۱۱۰

۴۴۔ ایضاً،صفحہ ۲۸۰

۴۵۔ فرمان فتح پوری،ڈاکٹر،غالبؔ......شاعرِ امروز وفردا،صفحہ ۱۲۴۔۱۲۵

۴۶۔ اقبالؔ،بالِ جبریل،کلیاتِ اقبالؔ اُردو،صفحہ ۴۱۹۔۴۲۰

۴۷۔ محمد اکرام،ڈاکٹر،شیخ،حکیمِ فرزانہ،صفحہ ۱۷۱

۴۸۔ ایضاً،صفحہ صفحہ نمبر ۱۷۰

۴۹۔ اقبالؔ،بالِ جبریل،کلیاتِ اقبالؔ اُردو،صفحہ ۳۶۰

۵۰۔ ایضاً،صفحہ ۴۴۱

۵۱۔ اقبالؔ،بانگِ درا،کلیاتِ اقبالؔ اُردو،صفحہ ۱۸۹

۵۲۔ ایضاً،صفحہ ۱۹۱

۵۳۔ ایضاً،صفحہ ۱۹۲

۵۴۔ ایضاً،صفحہ ۱۹۳

۵۵۔ یوسف حسین،ڈاکٹر،خان،متحرک جمالیات،صفحہ ۳۲

۵۶۔ آفتاب احمد،ڈاکٹر،غالب آشفتہ نوا(کراچی:مکتبۂ دانیال اشاعت دسمبر ۱۹۹۷ء)صفحہ ۶۹

۵۷۔ غالبؔ،دیوانِ غالبؔ جدید،صفحہ ۲۴۷

۵۸۔ اقبالؔ،بانگِ درا،کلیاتِ اقبالؔ اُردو،صفحہ ۲۷۰

۵۹۔ غالبؔ،دیوانِ غالبؔ جدید،صفحہ ۱۳۹

۶۰۔ اقبالؔ،بانگِ درا،کلیاتِ اقبالؔ اُردو،صفحہ ۲۷۰

۶۱۔ غالبؔ،دیوانِ غالبؔ جدید،صفحہ ۱۱۹

۶۲۔ اقبالؔ،بالِ جبریل،کلیاتِ اقبالؔ اُردو،صفحہ ۲۹۷

۶۳۔ غالبؔ،دیوانِ غالبؔ جدید،صفحہ ۱۱۲

۶۴۔ اقبالؔ،ضربِ کلیم،کلیاتِ اقبالؔ اُردو،صفحہ ۶۸۷

۶۵۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ۴۲

۶۶۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ۴۰۲

۶۷۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ۹۷

۶۸۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ۲۹۹

۶۹۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۱

۷۰۔ اقبالؔ، بانگِ درا، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ۱۲۳

۷۱۔ عبدالمغنی، ڈاکٹر، اقبالؔ اور غالبؔ، از اقبالؔ اور مشاہیر مرتبہ طاہر تونسوی، صفحہ۸۲

۷۲۔ ایضاً، صفحہ ۸۷

۷۳۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ۱۹

۷۴۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ۳۳۵

۷۵۔ ایضاً، صفحہ ۳۵۹

۷۶۔ ایضاً، صفحہ ۳۷۶

۷۷۔ اقبالؔ، ارمغانِ حجاز، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ۶۷۹

۷۸۔ اقبالؔ، زبورِ عجم، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ۶۷۹

۷۹۔ محمد اکرام، ڈاکٹر، شیخ، حکیم فرزانہ، صفحہ۱۶۱

۸۰۔ غالبؔ، کلیاتِ غالبؔ فارسی، جلد اوّل، صفحہ۳۸۹۔۳۹۰

۸۱۔ اقبالؔ، بانگِ درا، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ۲۷۸

۸۲۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ۱۱۱

۸۳۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ۴۰۶

۸۴۔ یوسف حسین، ڈاکٹر، خان، متحرک جمالیات، صفحہ۳۰

۸۵۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ۳۴۳

۸۶۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ۱۸۹

۸۷۔ ایضاً،صفحہ ۱۳۱

۸۸۔ ایضاً،صفحہ ۱۱۲

۸۹۔ اقبال،بانگِ درا،کلیاتِ اقبال اُردو،صفحہ ۱۰۳

۹۰۔ اقبال،ضربِ کلیم،کلیاتِ اقبال اُردو،صفحہ ۵۹۰

۹۱۔ عبداللہ،ڈاکٹر،سید،مسائلِ اقبال،صفحہ ۱۲۲

۹۲۔ اقبال،ضربِ کلیم،کلیاتِ اقبال اُردو،صفحہ ۶۲۲

۹۳۔ اقبال،ارمغانِ حجاز،کلیاتِ اقبال اُردو،صفحہ ۶۸۲

۹۴۔ اقبال،بانگِ درا،کلیاتِ اقبال اُردو،صفحہ ۴۰۔۴۱

۹۵۔ ایضاً،صفحہ ۲۷۳

۹۶۔ ایضاً،صفحہ ۱۹۶

۹۷۔ اقبال،بالِ جبریل،کلیاتِ اقبال اُردو،صفحہ ۳۵۳

۹۸۔ اقبال،بانگِ درا،کلیاتِ اقبال اُردو،صفحہ ۱۹۵

۹۹۔ اقبال،دیباچہ اسرارِ خودی،مطالبِ اسرار و رموز،غلام رسول مہر(لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز،۱۹۶۰ء)صفحہ ۱۰

۱۰۰۔ اقبال،ضربِ کلیم،کلیاتِ اقبال اُردو،صفحہ ۴۹۳

۱۰۱۔ اقبال،بالِ جبریل،کلیاتِ اقبال اُردو،صفحہ ۴۲۰

۱۰۲۔ اے۔ بی۔ اشرف،ڈاکٹر،میر...... غالب اور اقبال،صفحہ ۶۰۔۶۱

۱۰۳۔ غالب،دیوانِ غالب جدید،صفحہ ۱۶۰

۱۰۴۔ ایضاً،صفحہ ۱۵۳

۱۰۵۔ حالی،یادگارِ غالب،صفحہ ۶۵

۱۰۶۔ غالب،دیوانِ غالب جدید،صفحہ ۴۵

۱۰۷۔ محمد اکرام،ڈاکٹر،شیخ،حکیمِ فرزانہ،صفحہ ۱۸۲

۱۰۸۔ غالب،دیوانِ غالب جدید،صفحہ ۱۶۶

۱۰۹۔ ایضاً،صفحہ ۲٦۹

۱۱۰۔ ایضاً،صفحہ ۱۱٦

۱۱۱۔ اقبالؔ،اسرارِخودی،کلیاتِ اقبالؔ فارسی،صفحہ۳۳۔۳۴

۱۱۲۔ غالبؔ،دیوانِ غالبؔ جدید،صفحہ۲۵۰

۱۱۳۔ ایضاً،صفحہ ۴۲

۱۱۴۔ ایضاً،صفحہ ۷

۱۱۵۔ ایضاً،صفحہ ۸۱

۱۱٦۔ ایضاً،صفحہ ۹۷

۱۱۷۔ اقبالؔ،اقبالؔ نامہ،حصہ دوم،مرتبہ شیخ عطااللہ،صفحہ۵۵۔۵٦

۱۱۸۔ اقبالؔ،ضربِ کلیم،کلیاتِ اقبالؔ اُردو،صفحہ۴۹٦

۱۱۹۔ ایضاً،صفحہ ۵۲۰

۱۲۰۔ اقبالؔ،جاویدنامہ،کلیاتِ اقبالؔ فارسی،صفحہ۴۰۷

۱۲۱۔ اقبالؔ،بالِ جبریل،کلیاتِ اقبالؔ اُردو،صفحہ۳۳۱

۱۲۲۔ ایضاً،صفحہ ۳۱۴

بابِ پنجم

حاصلِ بحث

حاصلِ بحث

ان تمام مباحث کا حاصل یہ ہے کہ غالبؔ اور اقبالؔ اردو ادب کی دو ایسی نابغۂ روزگار شخصیات ہیں جن کے مابین تصورات اور افکار کے حوالے سے مماثلت اور مطابقت کا ایک طویل سلسلہ اُستوار نظر آتا ہے۔ اسی ہم آہنگی کے پیش نظر بعض ناقدین نے علامہ اقبالؔ کو غالبؔ کا معنوی شاگرد قرار دیا ہے کیونکہ اقبالؔ نے اپنے کلام میں یا ''شذرات'' میں جن شعراء کو خراجِ تحسین پیش کیا، جن کے اندازِ سخن کو سراہا اور جن کے افکار و خیالات سے فیض اُٹھانے کا اعتراف کیا ان میں اسداللہ خان غالبؔ کا نام سرِ فہرست ہے۔

علامہ اقبالؔ کے یہاں اخذ و استفادہ اور جذب و انجذاب کی ایک طویل روایت ملتی ہے۔ ان کے تفکر میں مشرق و مغرب کے تمام اہم افکار اور تحریکات کی صدائے بازگشت سنی جاسکتی ہے۔ انہوں نے اپنی فکر کو جلا بخشنے کے لئے صرف اردو شاعری یا مشرقی ادبیات ہی کے امکانات کا جائزہ نہیں لیا بلکہ مشرق و مغرب کے بے شمار علما و فلاسفہ اقبالؔ کے زیر مطالعہ رہے یہی وجہ ہے کہ شخصیات کے ساتھ فکری روابط اقبالیات کا ایک مستقل موضوع ہے۔ ان شخصیات میں عطار، رومی، سنائی، حافظ، نظیری، بیدل، غالبؔ سرسید، حالیؔ، شبلی، اکبر، برگساں، نطشے، گوئٹے، جمال الدین افغانی، کارل مارکس اور آرنلڈ وغیرہ چند نمایاں نام ہیں۔ انہوں نے بڑی ژرف نگاہی سے اس ذخیرۂ علم میں سے وہ خیالات اخذ کئے اور اپنائے جو ان کے اہداف اور مقاصد کے ساتھ مطابقت رکھتے تھے۔ جو افکار ان کے نظریات سے متصادم ہوئے انہیں نہ صرف قلم زد کردیا بلکہ ان کی خامیاں بھی کھول کھول کر بیان فرمائیں مثلاً نطشے کے بارے میں ان کا یہ کہنا کہ

ع   قلبِ او مومن دماغش کافر است[1]

یا

اگر ہوتا وہ مجذوبِ* فرنگی اس زمانے میں
تو اقبالؔ اس کو سمجھاتا مقام کبریا کیا ہے[2]

افلاطون کے بارے میں ان کی رائے ہے کہ:

ع   تڑپ رہا ہے فلاطوں میانِ غیب و حضور[3]

ادب کی دنیا میں کسی سے متاثر ہونا یا کسی کے چراغِ فکر سے رہنمائی قبول کرنا کوئی معیوب بات نہیں۔ شعراء

* جرمنی کا مشہور مجذوب فلسفی نیٹشا، جو اپنے قلبی واردات کا صحیح اندازہ نہ کرسکا اس لئے اُس کے فلسفیانہ افکار نے اُسے غلط راستے پر ڈال دیا۔

کسب واستفادہ کرتے چلے آئے ہیں کہ شعروادب کی دنیا میں ایک چراغ ہی سے دوسرا چراغ جلتا ہے چنانچہ اقبالؔ کا غالبؔ سے تاثر قبول کرنا، ان کی رفعت تخیل کا معترف ہونا اور فیض یاب ہونے کا اعتراف کرنا قابل گرفت نہیں۔ اقبالؔ نے اپنی ڈائری میں کشادہ دلی سے یہ اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے بیدلؔ اور غالبؔ سے بہت استفادہ کیا ہے بالخصوص مغربی شاعری کی اقدار کو اپنے اندر سمو لینے کے باوجود مشرقیت کی روح کو زندہ وبرقرار رکھنے کا فن انہوں نے غالبؔ ہی سے سیکھا ہے۔ اقبالؔ کا یہ عقیدت مندانہ اعتراف اُن کی بڑائی کی دلیل ہے۔

یوں بھی غالبؔ اردو شاعری کی روایت میں ایک ایسا آفاقی شاعر ہے جو ہمارے ادبی شعور پر آج بھی اس قدر حاوی ہے کہ ان کی رفعتِ تخیل سے دامن بچا کر نکل جانا محال نظر آتا ہے۔ آج کا شاعر ہو یا ادیب بالواسطہ یا بلاواسطہ اُن ہی کے حلقہ تاثر کا اسیر نظر آتا ہے۔

زمانی اعتبار سے غالبؔ اور اقبالؔ کے درمیان بھی کافی فاصلے حائل تھے۔ غالبؔ انیسویں صدی اور اقبالؔ بیسویں صدی کے شاعر ہیں۔ دونوں کے تخلیقی اہداف اور مقاصد کی نوعیت بھی مختلف ہے۔ اس کے باوجود غالبؔ اور اقبالؔ کے افکار وخیالات میں یک گونہ اشتراک قدم قدم پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہ نہ صرف غالبؔ کے حسنِ بیان اور بلندیٔ افکار سے متاثر تھے بلکہ اس اندازِ خاص کو اپنی شاعری میں جذب بھی کر لینا چاہتے تھے کیونکہ دونوں کی شخصیت اور فکر میں گہری مطابقت تھی۔ دونوں کی فطرت میں جدت اور اپج کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ دونوں کہنگی اور فرسودگی کے خلاف احتجاج اور زندگی کو نئی بنیادوں پر استوار کرنے کے خواہش مند نظر آتے ہیں، دونوں کے ہاں خطر طلبی، انانیت اور خود داری کا درس ملتا ہے، دونوں کا ذہن نکتہ آفریں اور نگاہ فلسفیانہ تھی۔ اردو ادب کی شعری روایت میں غالبؔ پہلے شاعر تھے جو تفکر وتعقل پر بھی اعتقاد رکھتے تھے۔ اقبالؔ نے جب اپنے مخصوص آدرش کے ابلاغ کے لئے ادبی روایات کو پرکھا تو انہیں صرف غالبؔ ہی کی فکر سے رہنمائی ملی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ غالبؔ اور اقبالؔ کے فکری روابط پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''غالبؔ اور اقبالؔ کی نفسی مماثلتیں بھی کچھ کم قابل توجہ نہیں۔ ان کے ذہن وفکر کے رخ بھی عام طور پر ایک ہی ہیں۔ ان کے ادبی ارتقاء کے بعض واقعات مثلاً اردو سے زیادہ فارسی سے اعتنا اور اپنے افکار کے لئے نئے نئے اسالیب وتراکیب کی اختراع وغیرہ بھی ان کی ذہنی وحدت کا پتہ دیتی ہے۔
> دونوں کی ذہنی اور ادبی تربیت کے سر چشمے بھی ایک خاص حد تک مشترک ہیں، شعرائے عہد اکبری و

جہانگیری کے کلام اور مغلیہ عہد کی روایات سے یہ دونوں شاعر یکساں طور پر مستفید ہوئے ہیں۔ غالبؔ کی شاعری کو اقبالؔ کی شاعری سے وہی نسبت ہے جو نمودِ سحر کو طلوعِ آفتاب سے ہوتی ہے۔''[۴]

ڈاکٹر سید عبداللہ کی رائے کے مطابق:

''توانائی، جدل، پیکار، قوت، احتجاج، اثبات، خودی، جارحانہ اقدام اور طلبِ دوام وتب وتاب جاوداں کے اعتبار سے بھی، اور ان افکار کے لحاظ سے بھی جن کے لئے پرجوش اسالیب بیان کی ضرورت ہوتی ہے، غالبؔ کی شاعری کو اقبالؔ کی شاعری کی منزلِ اول قرار دیا جاسکتا ہے۔''[۵]

کلام غالبؔ کی جو خصوصیات اقبالؔ کے مزاج اور تخلیقی مقاصد سے مطابقت رکھتی تھیں یا جن کے اپنا لینے سے ان کے فن کو نکھار میسر آسکتا تھا انہوں نے اسے اپنا لینے میں کوئی عار محسوس نہیں کیا۔ اس کے باوجود یہ تتبع اور استفادہ ان کی مخصوص انفرادیت کو مجروح نہ کرسکا اور ان کی تقلید میں بھی تخلیق واجتہاد کی شان برقرار رہی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ افکارِ اقبالؔ کے کچھ پہلو ایسے ہیں جو صرف انہی سے منسوب ہیں یعنی معلوماتِ قرآنی اور عشقِ رسولؐ نے ان کے پیغام کی اہمیت کو لازوال بنا دیا۔ تاہم علامہ اقبالؔ کو غالبؔ سے جو ذہنی لگاؤ اور فکری ربط تھا اس کا منہ بولتا ثبوت ''بانگِ درا'' کی نظم ''مرزا غالبؔ'' ہے جس میں وہ غالبؔ کی بحیثیت شخص اور شاعر مدح فرما رہے ہیں اور انہیں جرمنی کے مفکر شاعر گوئٹے کا ہم پلہ اور ہم نوا قرار دے رہے ہیں۔ کوئی بھی ہستی صرف اسی وقت محرکِ تخلیق بنتی ہے جب کہ مادح اور ممدوح میں گہرا ربط ہو اور ان کے مابین کوئی فکری رشتہ استوار ہو۔ اس نظم کو تخلیق کرتے ہوئے اقبالؔ کا دل غالبؔ کے لئے عقیدت ومحبت کے جن جذبات سے سرشار ہوگا اسے بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ درج ذیل اشعار اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ اقبالؔ کے نزدیک غالبؔ کی کیا قدر وقیمت تھی۔

لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں
ہو تخیل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں
ہائے اب کیا ہوگئی ہندوستاں کی سرزمیں
آہ! اے نظارہ آموزِ نگاہِ نکتہ بیں
گیسوئے اُردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ سودائی دلسوزیٔ پروانہ ہے[۶]

اقبالؔ غالبؔ کی فکرِ رسا اور تخیل کی بلند پروازی کے مداح تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ ''غالبؔ شناسی کا حق ادا ہونا ابھی باقی ہے''۔ غالبؔ شناسی کا حق ادا کرنے کی گرانقدر ذمہ داری اقبالؔ نے خود قبول کی، انہوں نے صرف غالبؔ کی رسمی تعریف وتوصیف ہی نہیں کی بلکہ ان کی فکری توانائی کو بھی فروغ بخشا۔ غالبؔ کے چراغِ فکر سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے حقیقت وعرفان کی نئی شمعیں بھی فروزاں کیں، ان کے اشعار اور مصرعوں پر تضمینیں پیش کیں۔ ان کی زمینوں اور بحروں پر طبع آزمائی کرتے ہوئے غزلیں کہیں، یہاں تک کہ اپنے فکری ارتقاء کے تشکیلی دور میں لکھی جانے والی کتاب ''جاوید نامہ'' میں فلک مشتری پر ان کی روحِ جلیلہ سے شرفِ ملاقات بھی حاصل کیا اور اپنے دیرینہ مسائل کا حل نیازمندانہ انداز میں غالبؔ سے طلب فرمایا کیونکہ اقبالؔ کے نزدیک غالبؔ ادبی روایت کا صرف ایک شاعر ہی نہیں بلکہ فکری رہنما اور پیشوا کا درجہ بھی رکھتے تھے۔

غالبؔ اور اقبالؔ کی فکر میں جو مشابہت موجود ہے اس کا اندازہ غالبؔ اور اقبالؔ کے ایسے اشعار سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے جن کا تخیل تو یکساں ہے لیکن انداز جدا۔ منتشر شعری حوالوں سے قطع نظر مختلف ومربوط تصورات کے حوالے سے بھی دونوں عظیم شعراء کی فکری یک رنگی اور ہم آہنگی قاری کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔

فلسفۂ خودی علامہ اقبالؔ کے تفکر کا حاصل ہے لیکن اقبالؔ سے بہت پہلے غالبؔ کے ہاں بھی احساسِ خودداری کی اہمیت پر واضح اشارے موجود ہیں۔ اقبالؔ حفظِ خودی کی تلقین کرتے ہیں یہی درس غالبؔ کے ہاں بھی ملتا ہے۔ دوسروں کے احسانات تلے دب کر خودی ضعیف ہو جاتی ہے اس رمز سے غالبؔ اور اقبالؔ دونوں باخبر ہیں۔ اثباتِ خودی کے لئے نئے نئے مقاصد کی تخلیق کی ضرورت کا احساس اقبالؔ سے پیشتر غالبؔ کی غزل میں بھی نمایاں طور پر موجود ہے۔ ذوق وشوق، دائمی اضطراب اور آرزومندی جیسے افکار کے بیان میں غالبؔ اور اقبالؔ کے مابین حیرت انگیز یک رنگی ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ دونوں کے خیال میں آرزومندی بے نتیجہ رہے تو بہتر ہے کہ اس سے زندگی کا قافلہ متحرک اور رواں دواں رہتا ہے اسی لئے دونوں شعراء ''شکستِ آرزو'' کی اہمیت سے بخوبی باخبر ہیں۔

غالبؔ اور اقبالؔ دونوں کے یہاں **عشق** ایک ہنگامۂ حیات، سوز وساز، گرمی اور رونق کا موجب ہے۔ انجمن ہستی کی رونق عشق ہی کے دم سے ہے یعنی

رونقِ ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں ہے

علامہ اقبالؔ بھی اسی خیال کی تائید کچھ یوں کرتے ہیں۔

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات

عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات ۸

غالبؔ اور اقبالؔ کا فلسفۂ تسخیر وستیز بھی خودی سے پیوستہ ہے۔ دونوں شعراء کے ہاں قدم قدم پر طلب وسعی، تگ وتاز، سخت کوشی، خاراشگافی اور عزمِ تسخیر کے احساس کی کارفرمائی نظر آتی ہے اور ایک نئی دنیا آباد کرنے کا پرعزم احساس ہر جگہ غالب ہے۔

فن اور رموزِ فن کے سلسلہ میں بھی غالبؔ اور اقبالؔ کے مابین گہرے فکری روابط دیکھے جا سکتے ہیں۔ دونوں بیان کی وسعتوں کے طلب گار تھے۔ دونوں جدت پسندی اور انفرادیت کے قائل تھے، دونوں نے فکر وخیال کی ندرت کے ساتھ ساتھ نئی نئی تراکیب اور اصطلاحات وضع کیں اور زبان وادب کے دامن کو وسعت بخشی۔ دونوں نے فن کا کمال اسی کو سمجھا کہ جو بات دل سے نکلے وہ سامع اور قاری کے دل میں اس طرح اتر جائے گویا وہ پہلے ہی سے اس کے دل میں موجود تھی۔

غالبؔ اور اقبالؔ شعر کی تخلیق کے سلسلے میں آورد اور تکلف وتصنّع کے قائل نہ تھے۔ اگر اقبالؔ نے ادب برائے ادب کی مذمت کی اور شاعری کو ''جزوِ پیغمبری'' ٹھہرایا تو غالبؔ کے خیال میں بھی شاعری محض قافیہ پیمائی کا نام نہیں بلکہ معنی آفرینی ہے۔ غالبؔ اور اقبالؔ دونوں ہی نے سوز وگداز اور خلوص کو لازوال تخلیق کے لئے لازمی سمجھا۔ غالبؔ کے ''دل گداختہ'' کو اقبالؔ ''خونِ جگر'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ دونوں کے خیال میں تخلیقی عمل کے لئے ریاضت درکار ہے۔ مثلاً یہ اشعار دیکھئے:

حسنِ فروغِ شمع سخن دور ہے اسدؔ

پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی ۹

غالبؔ

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر

نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر ۱۰

اقبالؔ

غالبؔ اور اقبالؔ دونوں کے خیال میں رمزیت اور ایمائیت شاعری کو پرلطف اور بامعنی بنانے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ شاید اسی لئے دونوں شعراء کا ایک ایک لفظ جہانِ معنی سمیٹے ہوئے نظر آتا ہے دونوں شعراء نے فن کے امکانات اور غرض و غایت پر کچھ اس طور روشنی ڈالی ہے۔

قطرہ دجلہ میں دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا [۱۱]
غالبؔ

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا [۱۲]
اقبالؔ

غالبؔ اور اقبالؔ دونوں فن کی بنیاد رجائیت، آرزومندی اور تب و تاب زندگی پر استوار کرتے ہیں۔ اضافہ یہ کہ اقبالؔ نے اپنے تصورِ فن کو خودی کا تابع قرار دے کر اسے زندگی اور پائندگی بخشی اور اسے دائمی قدروں کا امین بنایا۔

غالبؔ اور اقبالؔ کی فکری مطابقت کا ایک اور پہلو **تحرک، سخت کوشی اور خارا شگافی** کے تصورات ہیں۔ دونوں کے یہاں زندگی عمل و حرکت سے عبارت ہے جب کہ سکون و جمود موت کے مترادف۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان نے اپنی کتاب ''غالبؔ اور اقبالؔ کی متحرک جمالیات'' میں دونوں شعراء کے کلام میں تحرک کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔

غالبؔ اور اقبالؔ دونوں کے یہاں زندگی میں تحرک پیدا کرنے کے لئے آرزوؤں اور تمناؤں کا ایک ہجوم ہے، دونوں کے یہاں ذوقِ جستجو کی فراوانی اور سخت کوشی کی برابر تلقین ملتی ہے، دونوں کو تن آسانی سے نفرت ہے۔ زندگی کی مشکلات ہی زندگی کے سفر کو آسان بناتی ہیں اس لئے دونوں زندگی کی پُر خار راہوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں وہ ناکامیوں کے آگے ہتھیار نہیں ڈالتے بلکہ مزید سرگرم عمل ہوتے ہیں دونوں شعراء نے ''کوششِ ناتمام'' اور ''سعیِ لاحاصل'' کو تقلید سے بہتر سمجھا ہے مثلاً غالبؔ فرماتے ہیں:

بس ہجومِ نا اُمیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے [۱۳]

جب کہ اقبالؔ اسی خیال کی ترجمانی کچھ یوں کرتے ہیں:

راز حیات پوچھ لے خضرِ خجستہ گام سے

زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے ۱۴؎

دونوں کے یہاں آرزومندی کا سفر کبھی ختم نہیں ہوتا کیونکہ ناکام تمنائیں ہی انسان کو جادۂ عمل پر گامزن رکھتی ہیں۔اسی لئے غالبؔ فرماتے ہیں۔

ہوں میں بھی تماشائیِ نیرنگِ تمنا

مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی برآوے ۱۵؎

جب کہ اقبالؔ دعا گو ہیں کہ:

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی

اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے ۱۶؎

دونوں شعراء بیاباں نوردی اور صحرا کے توسط سے اپنے ذوق جستجو کی فراوانی، سخت کوشی اور مشکلات سے کھیلنے کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں مثلاً

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا

حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا ۱۷؎

غالبؔ

اقبالؔ اسی حقیقت کی ترجمانی بہ زبان خضرؑ یوں کرتے ہیں۔

کیوں تعجب ہے مری صحرا نوردی پر تجھے

یہ تگاپوئے دما دم زندگی کی ہے دلیل ۱۸؎

بحیثیت مجموعی تھوڑے بہت فرق کے ساتھ غالبؔ اور اقبالؔ دونوں کا نظامِ فکر حرکی اور توانا ہے۔سکون، راحت اور آرام کی خواہش دونوں شعراء کے یہاں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی۔

جنت کے رسمی و روایتی تصور سے انحراف کرتے ہوئے غالبؔ اور اقبالؔ کے افکار و خیالات میں حیرت انگیز یکسانیت دکھائی دیتی ہے دونوں کو جنت کی پر سکون فضا راس نہیں۔ ایسی جنت جہاں انسان کی سب خواہشیں پوری ہوں۔ دائمی سکون اور قرار نصیب ہو اور اقامت جاودانی ہو۔ایسی جنت نہ غالبؔ کو منظور ہے اور نہ ہی اقبالؔ ایسی جنت

کے خواہاں ہیں جس میں یزداں تو ہو لیکن شیطان نہ ہو:

مزی اندر جہانے کور ذوقے

کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد ۱۹

ظاہر ہے کہ ایسی جنت میں نہ خیر وشر کی کشمکش ہوگی نہ زندگی میں تحرک اور اضطراب۔ دونوں شعراء نے اپنے اپنے انداز میں ایسی جنت کو طنز ومزاح کا نشانہ بنایا ہے مثلاً غالبؔ کہتے ہیں کہ:

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن

دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے ۲۰

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملالیں یارب

سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی ۲۱

غالبؔ اور اقبالؔ دونوں کے خیال میں وہ عبادت جو حصول ثواب اور جنت کی لالچ میں کی جائے وہ سوداگری اور ریاکاری سے زیادہ اور کچھ نہیں اس لئے غالبؔ اس خیال کے حامی ہیں کہ:

طاعت میں تا رہے نہ مے وانگبیں کی لاگ

دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو ۲۲

جب کہ علامہ اقبالؔ بے غرض عبادت کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں:

جس کا عمل ہے بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے

حور و خیام سے گزر، بادہ و جام سے گزر ۲۳

غالبؔ کی مثنوی ''ابرِ گوہر بار'' اور علامہ اقبالؔ کی نظم ''حور و شاعر'' (جو دراصل گوئٹے کی اسی عنوان پر لکھی گئی نظم کا جواب ہے) میں جو تصورِ جنت پیش کیا گیا ہے اس کے بنیادی خیال میں حیرت انگیز فکری ربط موجود ہے۔ دونوں کو احساسات وجذبات سے عاری جنت کی حوروں میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی۔ دونوں کو ایسی جنت سے مَفر ہے جہاں نہ آرزومندی ہے نہ اضطراب۔ ایسی پرسکون فضا میں زندگی اجیرن ہے لہذا دونوں کا دل ایسی جنت سے بیزار ہے۔

رجائیت اور زندہ دلی کو غالبؔ اور اقبالؔ کے تفکر میں نمایاں مقام حاصل ہے کیونکہ دونوں شعرا فطرتاً رجائی

تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں کے یہاں غم منفی اور سلبی شکل اختیار نہیں کرتا، دونوں غم کو زندگی کا لازمہ سمجھتے ہیں، دونوں کے نزدیک زندہ دلی کا تقاضا یہی ہے کہ غموں کا مردانہ وار مقابلہ کیا جائے کیونکہ زندگی کی تکمیل غم کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ چنانچہ غالبؔ اور اقبالؔ دونوں کے یہاں غم ایک زبردست تخلیقی محرک اور تعمیری قوت کا حامل ہے۔ غم سہہ سہہ کر ہی انسانی فطرت کے جوہر جلا پاتے ہیں۔ غالبؔ فرماتے ہیں:

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم ۲۴

اقبالؔ اسی فکر کی ترجمانی اپنے اندازِ خاص میں کچھ یوں کرتے ہیں:

حادثاتِ غم سے ہے انساں کی فطرت کو کمال
غازہ ہے آئینۂ دل کے لئے گردِ ملال
غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطفِ خواب سے
ساز یہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے ۲۵

کلامِ اقبالؔ میں جو بلند آہنگی، قوت و توانائی اور جلال و جمال کا امتزاج موجود ہے اس کی جھلک اولاً کلامِ غالبؔ میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ دونوں شعراء کی فکری ہم آہنگی ہی تو ہے کہ دونوں نے "تنگنائے غزل" کو غمِ جاناں کے محدود دائرے سے نکال کر غمِ دوراں اور غمِ روزگار کا ترجمان بنایا اور آنے والے شعرا کے لئے نئی راہوں کا تعین کیا۔

غالبؔ اور اقبالؔ کے تفکر میں **تصوف** کو نمایاں مقام حاصل ہے دونوں کو تصوف سے فطری لگاؤ تھا۔ دونوں شعراء کو صوفیائے کرام اور بزرگانِ دین سے گہری عقیدت تھی۔ دونوں کی نگاہ میں اردو سے زیادہ فارسی شعر و ادب کی روایت قابلِ تقلید تھی لہٰذا دونوں کے کلام میں صوفیانہ اور مابعد الطبیعاتی مسائل پر اظہارِ خیال ملتا ہے۔

ابتدائی دورِ شاعری میں غالبؔ اور اقبالؔ کے صوفیانہ تصورات میں گہرا ربط اور ہم آہنگی نظر آتی ہے۔ دونوں نظریۂ وحدت الوجود کے پیروکار تھے۔ جس کی رو سے وجودِ حقیقی صرف ذاتِ الٰہی ہے یہی وجودِ حقیقی منبع کائنات ہے۔ غالبؔ فرماتے ہیں۔

ہے تجلّی تری سامانِ وجود
ذرّہ بے پرتوِ خورشید نہیں ۲۶

جب کہ اقبالؔ اسی فکر کی ترجمانی کرتے ہوئے نظم ''جگنو'' میں کہتے ہیں۔

کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی

جگنو میں جو چمک ہے، وہ پھول میں مہک ہے ۲۷

بعد ازاں قرآن مجید پر غور و تدبر کرنے اور عجمی تصوف پر تحقیق کرنے کے بعد علامہ نے ان صوفیانہ عقائد سے پہلو تہی فرمائی جو اسلامی تعلیمات سے متصادم تھے۔ ان ہی تصورات میں فلسفۂ وحدت الوجود بھی شامل ہے لیکن اس فکری اختلاف سے قطع نظر اقبالؔ کے دل میں مولانا رومؔ کی طرح غالبؔ کا احترام بھی برقرار رہا۔ چونکہ تصوف کے عجمی تصورات بے عملی، رہبانیت اور یاسیت کو فروغ بخش رہے تھے اس لئے اقبالؔ نے انہیں ترک کر کے اسلامی اور رجائی تصوف کو فروغ بخشا اور تصوف کو خودی کا نگہبان اور ترجمان قرار دیا۔

دیگر مضامینِ تصوف کے سلسلہ میں غالبؔ اور اقبالؔ کی فکری مطابقت برقرار رہی۔ دونوں کے یہاں کائنات کی حقیقت جاننے کے لئے صوفیانہ تحیّر کے مضامین موجود ہیں۔ دونوں کا ذہن اس سوال کے جواب کا متلاشی ہے کہ ہستی کی حقیقت کیا ہے اور دنیا کی ہنگامہ آرائیاں کیا معنی رکھتی ہیں؛ حق تک رسائی کیونکر ممکن ہے۔ دونوں شعراء کی فکری ہم آہنگی ایک ہی زمین اور بحر میں لکھی گئی اس غزل کے اشعار میں ملاحظہ کیجئے:

ناکامیٔ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز

تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی ۲۸

غالبؔ

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی

ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی ۲۹

اقبالؔ

دونوں شعراء کی فکری راہیں اس صوفیانہ نکتے پر آ کر ایک ہو جاتی ہیں کہ یہ کائنات ساکن و جامد نہیں بلکہ ارتقاء پذیر ہے۔ تخلیقِ کائنات کا سلسلہ جاری و ساری ہے۔ غالبؔ کے خیال کے مطابق:

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز

پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں ۳۰

جب کہ اقبالؔ کی رائے یہ ہے کہ:

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید

کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کن فیکون ۳۱

فضیلتِ آدم تصوف کا ایک ایسا اہم موضوع ہے جس کی بابت غالبؔ اور اقبالؔ ہم خیال ہیں۔ دونوں کے نزدیک انسان کے علم وحکمت اور تصرفات کی کوئی انتہا نہیں۔ دونوں ہی تذلیلِ انسانیت پر تڑپ اُٹھتے ہیں اور خدا سے شاکی ہیں کہ:

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند

گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں ۳۲

غالبؔ

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن

زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا ۳۳

اقبالؔ

نفی و اثبات اور لا والا جیسے صوفیانہ مسائل کے سلسلے میں کئی جگہ دونوں شعراء ہم خیال نظر آتے ہیں۔ چونکہ غالبؔ وحدت الوجود کے قائل رہے۔ اس لئے ان کے تصوف میں لایعنی نفی کا پہلو نمایاں ہے لیکن اثبات کی زبردست خواہش بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ انہیں محض نفی کی خاطر نفی ناپسند تھی۔ ان کا حکیمانہ ذہن یہ ماننے کو تیار نہ تھا کہ اس جہانِ رنگ و بو کا کوئی وجود ہی نہیں ہے:

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود

پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے! ۳۴

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں

ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں ۳۵

اقبالؔ اس خیال کے حامی تھے کہ ایمان کی تکمیل نفی و اثبات دونوں پر منحصر ہے۔

نہادِ زندگی میں ابتدا لا انتہا الّا

پیامِ موت ہے جب لا ہوا الّا سے بیگانہ ۳۶

نکتہ آفرینی غالبؔ اور اقبالؔ کی شاعری کا مشترکہ وصف ہے۔ نکتہ آفرینی سے مراد ہے باریک، تہہ دار، نئی اور معنی خیز بات پیدا کرنا۔ گو نکتہ آفرینی کا شمار اسلوبیاتی خوبیوں میں کیا جاتا ہے لیکن درحقیقت اس کے پس پردہ فکر اور خیال ہی کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ لہٰذا دونوں شعراء نے تخیل کی بلند پروازی سے کام لیتے ہوئے ندرتِ الفاظ اور جدتِ مضامین کی ایک نئی روایت کو جنم دیا ہے۔

نکتہ سنجی کا مقصد روایت سے انحراف اور نئی سوچ کو متعارف کروانا ہوتا ہے۔ غالبؔ اور اقبالؔ دونوں رسم ورہِ عام سے متنفر اور اجتہاد کے قائل تھے کیونکہ نکتہ داں اور نکتہ آفریں ایک جینئس، زیرک اور تیز فہم کا مالک شخص ہوتا ہے۔ غالبؔ اور اقبالؔ دونوں نے نئی نئی تراکیب اضافہ کر کے زبان وادب کے دامن کو وسعت بخشی، دونوں نے غزل میں معنوی لطافت کی ایک نئی روایت قائم کی، دونوں نے مروجہ تلمیحات میں نئے نکات اضافہ کئے، دونوں کے یہاں اختراعی مضامین کی کثرت ہے۔ انہوں نے پرانے مضامین کو بھی تروتازگی اور جدت عطا کی۔ دونوں شعراء کی بدولت اردو شاعری میں ایسے اچھوتے مضامین منظرِ عام پر آئے جن سے ہماری زبان اور ادب آشنا نہیں تھے۔ دونوں شعراء کے یہاں ایک ایک لفظ "گنجینہ معنی" کے ایک "طلسم" کی حیثیت رکھتا ہے۔ غالبؔ اور اقبالؔ کی نکتہ آفرینی کے پسِ پردہ دونوں شعراء کی سحر کارادر ہمہ گیر شخصیت کارفرما ہے۔ نکتہ آفرینی کے ذیل میں غالبؔ اور اقبالؔ کے ایک ہی موضوع، فکر اور خیال پر مبنی یہ اشعار ملاحظہ کیجئے!

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے [۳۷]
غالبؔ

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے [۳۸]
اقبالؔ

غالبؔ اور اقبالؔ کے افکار وخیالات کی اسی مشابہت اور فکری ہم آہنگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے ناقدین نے غالبؔ کو اقبالؔ کا فکری پیشوا قرار دیا۔ سر شیخ عبدالقادر نے اقبالؔ کو غالبؔ ہی کا دوسرا جنم کہا، ڈاکٹر یوسف حسین خان نے اقبالؔ کو غالبؔ ہی کے سلسلے کا شاعر قرار دیا، ڈاکٹر سید عبداللہ نے غالبؔ کو "پیشروِ اقبالؔ" کے مرتبے پر فائز کیا، ڈاکٹر عبدالمغنی کو

غالبؔ اور اقبالؔ کی ذہنی ساخت اور مزاج کا رنگ یکساں محسوس ہوا جب کہ ڈاکٹر عبدالحق نے دونوں شعراء کے فکر و خیال میں گہری مشابہت کی نشاندہی کی۔ الغرض ہر اقبالؔ شناس نے محسوس کیا کہ اقبالؔ، غالبؔ سے والہانہ وابستگی رکھتے تھے اور دونوں کے فکر و خیال میں ہم آہنگی ہی نہیں یک رنگی بھی موجود ہے۔ تاہم بعض اشترا کی موضوعات اور رجحانات کے باوصف غالبؔ اور اقبالؔ کے مابین کچھ فکری تضادات بھی ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں۔

غالبؔ اور اقبالؔ کا بنیادی فرق تو یہ ہے کہ اقبالؔ کا نظامِ فکر مرتب اور باضابطہ ہے۔ نیز اس میں قطعیت موجود ہے جب کہ غالبؔ نے اپنی شاعری میں قطعی نوعیت کا کوئی فلسفیانہ نظام مرتب نہیں فرمایا۔ ان کا تمام تر فکری سرمایہ غزل کے متنوع اشعار میں منتشر طور پر موجود ہے۔ انہوں نے اپنے کلام میں کوئی ایسا بندھا ٹکا فلسفہ پیش نہیں کیا جس میں قطعیت بھی موجود ہو۔ ان کا فکر و فلسفہ خود اپنی ہی ذات کا عکس ہے بالفاظِ دیگر اشعار کے آئینے میں ہمیں غالبؔ کی اپنی ہی ذات اور شخصیت بے نقاب نظر آتی ہے۔ وہ خود فرماتے ہیں۔

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

شعروں کے انتخاب نے رُسوا کیا مجھے ۳۹

علامہ اقبالؔ نے شعر و ادب کو اپنے عظیم تر مقاصد کے حصول کا ذریعۂ قرار دیا۔ وہ اپنی شاعری کی طاقت سے جنوبی ایشیا کے خوابیدہ مسلمانوں کو بیدار کرنا چاہتے تھے۔ ان کا احساسِ زیاں'' زندہ کر کے انہیں حصولِ آزادی کی جدوجہد میں شریک کرنے کے خواہش مند تھے۔ اُن کا تمام تر فکر و فلسفہ اسی عظیم مقصد اور آدرش کے حصول کے لئے وقف تھا۔ خود فرماتے ہیں کہ:

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست

سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را ۴۰

اقبالؔ کے برعکس غالبؔ کے پیشِ نظر کوئی ایسا نصب العین کارفرما نہیں تھا۔ وہ تو بس اشعار کے آئینے میں صرف اپنے دل کے داغ دکھانا چاہتے تھے۔ اپنے احساسات و جذبات کو شعر کے سانچے میں ڈھال کر دادِ سخن وصول کرنا چاہتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کے پسِ پردہ ہمیں نہ کوئی مصلح نظر آتا ہے، نہ فلسفی اور نہ ہی کوئی قومی رہنما وغیرہ شاید اسی لئے خالص ادب کے نقطۂ نگاہ سے غالبؔ کی شاعری کو اقبالؔ کی شاعری پر ترجیح دی جاتی رہی ہے۔

غالبؔ کی شاعری متنوع اور رنگا رنگ افکار و خیالات کا ایک نگار خانہ ہے جب کہ اقبالؔ نے اپنی مقصدیت کے

پیشِ نظر تمام تر زور فلسفۂ خودی اور اس کی جزئیات کے بیان میں صرف کیا ہے۔ غالبؔ کی شاعری کا موضوع حیاتِ انسانی کی بوقلمونیاں ہیں جب کہ اقبالؔ اُمتِ مسلمہ کے شاعر بن کر ابھرے یہی وجہ ہے کہ اُن کے اشعار سے ایک عام و عامی حظ نہیں اُٹھا سکتا جب کہ غالبؔ کی مشکل پسندی کے باوصف ہر شخص اپنے حسبِ حال شعر ''دیوان'' سے اخذ کر سکتا ہے۔

اقبالؔ اپنے مخصوص مقاصد کے ابلاغ کی خاطر اکثر اُمتِ مسلمہ اور نوجوانانِ اسلام سے خطاب کرتے یا نصیحتیں کرتے نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کلامِ اقبالؔ میں خطیبانہ انداز پر مبنی اشعار کی تعداد بہت زیادہ ہے جب کہ غالبؔ کی شاعری میں خطیبانہ انداز نہ ہونے کے برابر ہے۔ غالبؔ کے یہاں تصورِ خودی سے مربوط واضح اشارے ضرور مل جاتے ہیں لیکن اقبالؔ کی طرح خودی کے مفہوم، مراحل اور منازل تربیت اور بے خودی سے اس کا تعلق جیسے موضوعات مطلقاً موجود نہیں بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری

''اقبالؔ کے یہاں اکثر فلسفۂ فن پر غالبؔ آجاتا ہے لیکن غالبؔ کے یہاں فلسفہ ہمیشہ فن سے مغلوب رہتا ہے۔''[۱۴]

غالبؔ کی شاعری کا موضوع انسان ہے اس لئے ان کا اندازِ نظر آفاقی ہے جب کہ اقبالؔ کو ایک مخصوص قوم اور ملت کا شاعر تسلیم کیا گیا یہ الگ بات کہ اُن کے پیغام کی ہمہ گیریت نے انہیں آفاقیت سے ہمکنار کیا۔

غالبؔ اور اقبالؔ دونوں کے کلام میں فکر و فلسفہ اور تعقل کی کارفرمائی ہے لیکن دونوں کا انداز الگ الگ ہے۔ غالبؔ کا اندازِ فکر فلسفیانہ ہے لیکن فلسفہ منضبط اور مربوط نہیں۔ اقبالؔ کے یہاں ایک منظّم اور مربوط فلسفیانہ نظام دیکھنے کو ملتا ہے۔ اقبالؔ کا مقصد انسان کو ''انسانِ کامل'' اور نیابتِ الٰہی کا اہل بنانا ہے تا کہ وہ ایک مثالی معاشرے میں اپنا حصہ ادا کر سکے جب کہ غالبؔ ایسے کسی عظیم مقصد کے مبلغ نہ تھے۔

فنِ شاعری کے باب میں دونوں کا بنیادی نقطۂ نظر مختلف ہے غالبؔ نے اقبالؔ کی طرح شاعری کو ''جزوِ پیغمبری'' نہیں گردانا بلکہ ان کی شاعری کا موضوع حسن و عشق اور عام انسانی محسوسات و جذبات اور تجرباتِ زیست ہیں۔

غالبؔ اور اقبالؔ کے تصورِ عقل و عشق میں نمایاں تفاوت موجود ہے۔ اقبالؔ فلسفی ہو کر بھی عقل کے مخالف ہیں اور غالبؔ شاعر ہو کر بھی خرد اور دانش کے معترف و مداح ہیں۔

غالبؔ اور اقبالؔ کے صوفیانہ عقائد بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ غالبؔ وحدت الوجود اور اقبالؔ وحدت الشہود کے ماننے والے ہیں لیکن اس اختلاف کے باوجود اقبالؔ کے دل سے غالبؔ کا احترام کم ہوتا نظر نہیں آتا۔

نظریۂ زیست کے باب میں غالبؔ اور اقبالؔ دونوں کا نقطۂ نگاہ رجائی ہے لیکن دونوں کی رجائیت میں فرق ضرور ہے۔ غالبؔ کبھی کبھار ''گردشِ مدام'' سے گھبرا جاتے ہیں۔ جب زمانہ انہیں ستاتا ہے تو آنسو بہا کر غموں کی تلخی کو گوارا بنانے کی کوشش کرتے ہیں جب کہ اقبالؔ کے یہاں زندگی کی منفی قدروں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔

ڈاکٹر عبدالمغنی نے غالبؔ اور اقبالؔ کی ذہنیت کے تفاوت کو دو لفظوں یعنی تشکیک اور یقین سے تعبیر کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''زندگی کے حقائق پر سوچا دونوں ہی نے ہے لیکن ایک اپنے توہمات میں الجھ کر رہ گیا اور دوسرے کی نگاہِ تیز دلِ وجود کو چیر گئی۔ غالبؔ زندگی بھر تذبذب میں پڑے رہے۔ اقبالؔ نے تیقن حاصل کر لیا۔ غالبؔ اپنی فکری توانائیوں کے باوجود زندگی کا کوئی واضح تصور نہیں رکھتے تھے۔ ان کا شعور اجتماعی درد سے خالی تھا۔ اس کے برخلاف اقبالؔ کے سامنے منزلِ مقصود کا نشان واضح تھا۔ ان کے دانشورانہ تفکر نے انہیں ایک اجتماعی بصیرت عطا کی اور وہ پوری یکسوئی کے ساتھ اپنے تخیل کو منظم کر سکے۔''[۴۲]

حقیقت یہ ہے کہ اقبالؔ کے فکر و فن کا مآخذ صرف غالبؔ ہی نہیں انہوں نے مشرق و مغرب کے تمام حکما اور شعرا سے اکتسابِ فیض کیا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اپنے ایک مضمون ''کیا اقبالؔ محض خوشہ چیں تھے۔'' میں فرماتے ہیں:

''ماحصل یہ ہے کہ اقبالؔ خوشہ چیں نہ تھے وہ وسیع المطالعہ شخص تھے۔ انہوں نے ہر بڑے مفکر کو پڑھا اور ہر بڑے مفکر کے تضادات واضح کر کے ایک جامع نظامِ فکر مرتب کیا، یہ صحیح ہے کہ ان کی فلاسفی مسلمان مفکر ہونے کی وجہ سے محورِ توحید و سنت کے گرد گھومتی ہے۔ مگر اس مرکز پہ قائم رہ کر اقبالؔ کا دائرہ فکر وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔''[۴۳]

نامور ہستیوں خصوصاً غالبؔ سے استوار فکری روابط اقبالؔ کی شاعری کی جان ہیں۔ انہوں نے علم و حکمت کو مومن کی گمشدہ میراث سمجھتے ہوئے ہر جگہ سے اُٹھا لینے کی کوشش کی بلکہ وہ دوسروں کو بھی یہی نصیحت فرماتے ہیں کہ:

مغرب سے ہو بیزار نہ مشرق سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر[۴۴]

یہی وجہ ہے کہ مشرق و مغرب کے عظیم مفکروں اور شاعروں کے خیالات سے انہوں نے بھرپور استفادہ کیا لیکن اپنی انفرادیت برابر برقرار رکھی۔ ہمیں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی اس رائے سے اتفاق کرنا پڑے گا کہ:

''شعر میں اقبالؔ نے حکمت کے جو موتی پروئے ہیں ان کے متعلق محض یہ کہہ دینا ناانصافی ہوگی کہ وہ موتی اس نے دوسرے جواہری سے لیے ہیں۔ ہیرا جب تک تراشا نہ جائے اور موتی جب تک مالا میں پرویا نہ جائے اور جواہرات جب تک زیور میں جڑے نہ جائیں ان کا جمال معمولی سنگریزوں اور خزف پاروں سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اقبالؔ نے شاعری پر جو احسان کیا ہے وہ یہ ہے کہ مشرق اور مغرب اور ماضی اور حال کے وہ جواہر پارے جو نفس انسانی کے آسمان کے تارے ہیں۔ کمال شاعری سے اس طرح تراشے اور پروئے اور جڑے ہیں کہ نوع انسان کے لیے ہمیشہ کے لیے بصیرت افروز ہو گئے ہیں۔۔۔۔۔۔ جہاں تک افکار کا تعلق ہے اس نے رومی کا کامل تتبع کیا ہے۔ نہ نطشے کا، نہ برگساں کا اور نہ کارل مارکس یا لینن کا، اپنے تصورات کا قالین بنتے ہوئے اس نے رنگین دھاگے اور بعض خاکے ان لوگوں سے لیے ہیں۔ لیکن اس کے مکمل قالین کا نقشہ کسی دوسرے کے نقشے کی ہو بہو نقل نہیں ہے اپنی اپنی تعمیر کے لیے اس نے ان افکار کو سنگ و خشت کی طرح استعمال کیا ہے۔ اقبالؔ ان مفکر شاعروں میں سے ہے جن کے پاس اپنا ایک خاص زاویۂ نگاہ اور نظریۂ حیات بھی ہوتا ہے محض افکار کے ادھر ادھر سے اخذ کردہ عناصر سے اس کی توجیہ نہیں ہوسکتی۔ اقبالؔ کے اندر رومی بھی ہے اور نطشے بھی، کانٹ اور برگساں بھی، کارل مارکس بھی اور لینن بھی۔ اور شاعری کے لحاظ سے بیدل بھی اور غالبؔ بھی۔ لیکن اقبالؔ کے اندر ان سب میں سے کسی کی اپنی حیثیت جُوں کی توں قائم نہیں ہے۔۔۔۔۔۔ اقبالؔ کا کمال یہ ہے کہ متضاد رنگوں کے تار و پود کو وہ دلکش نقشوں میں بُن لیتا ہے۔ منطقی حیثیت سے کسی کو تشفی ہو نہ ہو لیکن بیان کی ساحری ایسی ہے کہ اقبالؔ کو پڑھتے ہوئے کسی تضاد کا احساس نہیں ہوتا۔'' ۴۵

تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ غالبؔ اور اقبالؔ کے فکری روابط جو علامہ اقبالؔ کی تربیتِ افکار کے تشکیلی دور میں استوار ہوئے تھے وہ فکری ارتقاء کی معراج تک برابر قائم رہے۔ اقبالؔ فکرِ غالبؔ سے مستفید بھی ہوئے اور منحرف بھی کہ اسی طور سے افکارِ نو کی تشکیل و تعمیر کا سفر جاری و ساری رہتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ اقبالؔ، پیامِ مشرق، کلیاتِ اقبالؔ فارسی، صفحہ۳۷۱
۲۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ۳۴۸
۳۔ ایضاً، صفحہ۳۷۰
۴۔ عبداللہ، ڈاکٹر، سید، مسائلِ اقبالؔ، صفحہ۱۲۹
۵۔ ایضاً، صفحہ۱۲۹
۶۔ اقبالؔ، بانگِ درا، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ۲۶، ۲۷
۷۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ۱۲۹
۸۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ۳۸۷
۹۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ۱۹۸
۱۰۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ۳۹۳
۱۱۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ۴۶
۱۲۔ اقبالؔ، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ۵۸۰
۱۳۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ۲۴۷
۱۴۔ اقبالؔ، بانگِ درا، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ۱۲۴
۱۵۔ نقوش، غالبؔ نمبر(حصہ دوم)اکتوبر۱۹۶۹ء ، صفحہ۳۲۴
۱۶۔ اقبالؔ، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبالؔ اُردو ، صفحہ۵۸۹
۱۷۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ۱۱
۱۸۔ اقبالؔ، بانگِ درا، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ۲۵۷
۱۹۔ اقبالؔ، پیامِ مشرق، کلیاتِ اقبالؔ فارسی، صفحہ۳۰۲
۲۰۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ۲۶۳
۲۱۔ ایضاً، صفحہ۲۸۸

۲۲۔ ایضاً، صفحہ ۱۴۷

۲۳۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۳۲۱

۲۴۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۱۰۴

۲۵۔ اقبالؔ، بانگِ درا، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۱۵۵

۲۶۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۱۳۱

۲۷۔ اقبالؔ، بانگِ درا، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۸۵

۲۸۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۱۹۹

۲۹۔ اقبالؔ، بانگِ درا، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۱۰۲

۳۰۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۱۳۲

۳۱۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۳۲۰

۳۲۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۱۳۲

۳۳۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۲۹۸

۳۴۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۲۵۰

۳۵۔ ایضاً، صفحہ ۳۰۱

۳۶۔ اقبالؔ، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۵۲۵

۳۷۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۲۴۹

۳۸۔ اقبالؔ، بانگِ درا، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۱۰۷

۳۹۔ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ جدید، صفحہ ۱۶۸

۴۰۔ اقبالؔ، زبورِ عجم، کلیاتِ اقبالؔ فارسی، صفحہ ۴۴۷

۴۱۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، غالبؔ، شاعرِ امروز و فردا (لاہور: اظہار سنز ۱۹۷۰ء) صفحہ ۱۲۵

۴۲۔ عبدالمغنی، ڈاکٹر، اقبالؔ اور غالبؔ بشمولہ اقبالؔ اور مشاہیر مرتب طاہر تونسوی (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز ۱۹۷۸ء) صفحہ ۷۸۔۷۹

۴۳۔ عبداللہ، ڈاکٹر، سید، مسائلِ اقبالؔ، صفحہ ۳۵۳

۴۴۔ اقبالؔ، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبالؔ اُردو، صفحہ ۵۷۱

۴۵۔ نیرنگِ خیال اقبالؔ نمبر ۱۹۳۲ء (جو ادارۂ نقوش ۷ نومبر ۱۹۷۷ء میں پیش کیا) (لاہور: ادارۂ فروغِ اُردو، نومبر ۱۹۷۷ء) صفحہ ۳۲۶

کتابیات

اوّلین مآخذ:

غالبؔ، مرزا اسداللہ خان، خطوطِ غالبؔ، مرتبہ غلام رسول مہر، (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز بار ہفتم، ۱۹۹۳ء)

غالبؔ، مرزا اسداللہ خان، دیوانِ غالبؔ، مرتبہ پروفیسر حمید احمد خان (لاہور: مجلسِ ترقیٔ ادب ۱۹۴۹ء)

غالبؔ، مرزا اسداللہ خان، دیوانِ غالب جدید المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ مع مقدمہ دیوان (آگرہ: مفیدِ عام اِسٹیم پریس۔ س۔ن)

غالبؔ، مرزا اسداللہ خان، کلیاتِ غالب فارسی، جلد اول، مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی (لاہور: مجلسِ ترقی ادب، اشاعت اول، جون ۱۹۶۷ء)

غالبؔ، مرزا اسداللہ خان، کلیاتِ غالب فارسی، جلد دوم، مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی (لاہور: مجلسِ ترقی ادب، اشاعت اول، جون ۱۹۶۷ء)

غالبؔ، مرزا اسداللہ خان، کلیاتِ غالب فارسی، جلد سوم، مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی (لاہور: مجلسِ ترقی ادب، اشاعت اول، ستمبر ۱۹۶۷ء)

محمد اقبالؔ، علّامہ، شذراتِ فکرِ اقبالؔ، مرتبہ جاوید اقبالؔ (لاہور: مجلس ترقیٔ ادب، اشاعت اول، ۱۹۷۳ء)

محمد اقبالؔ، علّامہ، کلیاتِ اقبالؔ اردو (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، اشاعت سوم، ۱۹۷۷ء)

محمد اقبالؔ، علّامہ، کلیاتِ اقبال فارسی، (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، اشاعت دوئم، ۱۹۷۵ء)

محمد اقبالؔ، علّامہ، اقبال نامہ، حصہ اول، مجموعہ مکاتیبِ اقبال، مرتبہ شیخ عطا اللہ (علی گڑھ: ادارۂ اقبال)

محمد اقبالؔ، علّامہ، اقبال نامہ، حصہ دوم، مجموعہ مکاتیبِ اقبال (مرتبہ شیخ عطا اللہ س۔ن)

ثانوی مآخذ:

آفتاب احمد، ڈاکٹر، غالب آشفتہ نوا(کراچی: مکتبہ دانیال، دسمبر، ۱۹۹۷ء)

آفتاب احمد، ڈاکٹر، میر، غالب اور اقبال، (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء)

احتشام حسین، ڈاکٹر، غالب ایک شاعر ایک اداکار(لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء)

آل احمد سرور، پروفیسر، دانشورِ اقبال(لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء)

اے۔ بی اشرف، میر، غالب اور اقبال(ملتان: جائزہ پرنٹرز، باراول ۱۹۹۹ء)

ایس۔ ایم منہاج الدین، ڈاکٹر افکار و تصوراتِ اقبال(ملتان: کاروانِ ادب، باراول، ۱۹۸۵ء)

پرتو روہیلہ، مشکلاتِ غالب(لاہور: نقوش پریس، ۲۰۰۰ء)

جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رُود، حیاتِ اقبال کا تشکیلی دور(لاہور: شیخ غلام علی اینڈ پرنٹرز، طبع سوم، ۱۹۷۵ء)

جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رُود، حیاتِ اقبال کا وسطی دور(لاہور: شیخ غلام علی اینڈ پرنٹرز، طبع سوم، ۱۹۸۷ء)

جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رُود، حیاتِ اقبال کا اختتامی دور(لاہور: شیخ غلام علی اینڈ پرنٹرز، طبع سوم، ۱۹۸۷ء)

جاوید اقبال، ڈاکٹر، مئے لالہ فام(لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۶۶ء)

حالی، الطاف حسین، یادگارِ غالب(لاہور: ناصر باقر پرنٹرز، س۔ن

خورشید الاسلام، ڈاکٹر، غالب......تقلید و اجتہاد(علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۷۹ء)

رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، کتابیاتِ اقبال(لاہور: اقبال اکیڈمی، ۱۹۷۷ء)

رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، اقبال بحیثیت شاعر(لاہور: مجلسِ ترقی ادب، طبع اول، ۱۹۷۷ء)

رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر محمد سہیل عمر، وحید عشرت، ڈاکٹر، مرتبین، اقبالیات کے سو سال(منتخب مضامین)(اسلام آباد: اکادمی ادبیات

پاکستان، اشاعت اول، ۲۰۰۲ء)

سلیم اختر، ڈاکٹر، تخلیق، تخلیقی شخصیات اور تنقید (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء)

سلیم اختر، ڈاکٹر، شعور اور لاشعور کا شاعر...... غالبؔ (لاہور: فیروز سنز لمیٹڈ، س۔ن)

سلیم اختر، ڈاکٹر، مرتب اقبالؔ شعاعِ صد رنگ (لاہور: سنگِ میل پبلیکیشنز، ۱۹۷۸ء)

سلیم اختر، ڈاکٹر، مرتب، اقبالؔ ممدوحِ عالم (لاہور: بزمِ اقبالؔ، طبع اول، ۱۹۷۸ء)

سلیم اختر، ڈاکٹر، فکرِ اقبالؔ کے منور گوشے (لاہور: سنگِ میل پبلیکیشنز، طبع اول، ۱۹۷۷ء)

سیالؔ، محمد حیات خان، (مرتب) احوال ونقدِ غالبؔ (لاہور: معراج دین پرنٹرز، نقشِ جدید، ۲۰۰۴ء)

صلاح الدین احمد، مولانا، صریرِ خامہ جلد اول تصوراتِ اقبال، مرتبہ معز الدین احمد (لاہور: المقبول پبلی کیشنز، اشاعت سوم، ۱۹۶۹ء)

طاہر تونسوی، مرتب، اقبالؔ اور مشاہیر (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشن، ۱۹۷۸ء)

عابد علی عابد، سید، تلمیحاتِ اقبالؔ (لاہور: بزمِ اقبالؔ، ۱۹۸۲ء)

عابد علی عابد، سید، شعرِ اقبالؔ (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء)

عبادت بریلوی، ڈاکٹر، جہانِ غالبؔ (لاہور: ادارۂ ادب وتنقید، ۱۹۸۷ء)

عبادت بریلوی، ڈاکٹر، غالبؔ کا فن (لاہور: گلوب پبلشرز، ۱۹۶۸ء)

عبداللہ، ڈاکٹر، سید، مسائل اقبالؔ (لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، طبع اول، ۱۹۷۴ء)

عبداللہ، ڈاکٹر، سیّد، مطالعۂ اقبالؔ کے چند نئے رخ (لاہور: بزمِ اقبالؔ، ۱۹۸۴ء)

عبداللہ، ڈاکٹر، سیّد، ولیؔ سے اقبالؔ تک (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۸ء)

عبداللہ، ڈاکٹر، سیّد، نقدِ میرؔ (لاہور: مکتبۂ خیابانِ ادب، طبع سوم، ۱۹۶۸ء)

عبدالحکیم، ڈاکٹر، خلیفہ، فکرِ اقبالؔ، (لاہور: بزمِ اقبالؔ، ۱۹۶۴ء)

عبدالرحمان بجنوری، ڈاکٹر، محاسنِ کلام غالب، مقدمہ دیوانِ غالب حدید المعروف نسخہ حمیدیہ (آگرہ: مفیدِ عام پریس، س۔ن)

عبدالمغنی، ڈاکٹر، اقبال کا نظامِ فن (لاہور: اقبال اکیڈمی، طبع دوم، ۱۹۹۰ء)

غلام رسول مہر، مولانا، نوائے سروش (شرح) (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، س۔ن)

غلام رسول مہر، مولانا، مرتب خطوطِ غالب (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، اشاعت ہفتم، ۱۹۹۳ء)

غلام رسول مہر، مولانا، مطالبِ بالِ جبریل (لاہور: علمی پرنٹنگ پریس، طبع پنجم، ۱۹۸۲ء)

غلام رسول مہر، مولانا، مطالبِ اَسرار ورموز (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۶۰ء)

فرمان فتحپوری، ڈاکٹر، اقبال سب کے لئے (کراچی: باب الاسلام پرنٹنگ پریس، طبع اول، ۱۹۷۸ء)

فرمان فتحپوری، ڈاکٹر، غالب شاعر امروز وفردا (لاہور: اظہار سنز، ۱۹۷۰ء)

فرمان فتحپوری، ڈاکٹر، تنقیدی شذرات ومقالات (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء)

محمد اکرام، ڈاکٹر، شیخ، حکیم فرزانہ (لاہور: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، طبع دوم، ۱۹۷۷ء)

محمد اکرام، ڈاکٹر، شیخ، حیاتِ غالب (لاہور: فیروز سنز، طبع اول، ۱۹۵۷ء)

محمد اکرام، ڈاکٹر، شیخ، موجِ کوثر (راولپنڈی: سروسز بک کلب، ۲۰۰۴ء)

مجنوں گورکھ پوری، اقبال (ایوانِ اشاعت گورکھ پور، س۔ن)

مجنوں گورکھ پوری، غالب شخص اور شاعر (مکتبہ اربابِ قلم، ۱۹۷۴ء)

محمد ریاض، ڈاکٹر، برکاتِ اقبال (لاہور: مقبول اکیڈمی، اشاعت دوم، ۱۹۸۸ء)

محمد عبداللہ قریشی، حیاتِ اقبال کی گمشدہ کڑیاں (لاہور: بزمِ اقبال، اشاعت اول، ۱۹۸۲ء)

نذیر نیازی، سیّد، اقبال کے حضور (کراچی: اقبال اکیڈمی، ۱۹۷۱ء)

نیاز فتحپوری، علامہ، غالب فن اور شخصیت (کراچی: اُردو اکیڈمی سندھ، اشاعت اول، دسمبر ۱۹۸۷ء)

نیاز فتحپوری، علامہ، بیسویں صدی میں اردو غزل (کراچی: اُردو اکیڈمی، ۱۹۸۷ء)

وزیر آغا، ڈاکٹر، تنقید و احتساب (لاہور: مکتبۂ جدید پریس، طبع اول، ۱۹۶۸ء)

وقار عظیم، سید، وقارِ غالب، مرتبہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن (لاہور: زاہد بشیر پرنٹرز، اشاعت اول، ۱۹۹۷ء)

وقار عظیم، سید، اقبال شعر اور فلسفی (لاہور: مطبع عالیہ، ۱۹۶۸ء)

یوسف حسین، ڈاکٹر، خان، روحِ اقبال (لاہور: القمر انٹر پرائزز، ۱۹۹۶ء)

یوسف حسین، ڈاکٹر، خان، غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات (لاہور: اردو آرٹ پریس، اشاعت اوّل، ۱۹۸۶ء)

یوسف سلیم چشتی، پروفیسر، شرحِ دیوانِ غالب (لاہور: عشرت پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۵۹ء)

رسائل اور مجلّات:

نقوش، غالب نمبر (حصہ اول) شمارہ ۱۱۱ (لاہور: ادارۂ فروغِ اُردو، فروری ۱۹۶۹ء)

نقوش، غالب نمبر (حصہ دوم) شمارہ ۱۱۳ (لاہور: ادارۂ فروغِ اُردو، اکتوبر ۱۹۶۹ء)

نقوش، اقبال نمبر، مدیر محمد طفیل، شمارہ ۱۲۱، (لاہور: ادارۂ فروغِ اُردو، ستمبر ۱۹۷۷ء)

نقوش، اقبال نمبر، (لاہور: ادارہ فروغِ اُردو، نومبر ۱۹۷۷ء)

نیرنگِ خیال، اقبال نمبر، مرتبہ حکیم یوسف حسین (لاہور: ۱۹۳۲ء)

وکیل، اخبار (امرتسر: ۱۵ جنوری ۱۹۱۴ء)

ماہِ نو، رسالہ، اقبال نمبر، (شمارہ ستمبر ۱۹۷۷ء)